علم تصوف سے روشناس کرانے والی اور
روحانی امراض سے بچانے والی لاجواب کتاب

# روح کی بیماریاں اور اُن کا علاج

جلد اوّل

از افادات
شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم
نائب رئیس جامعہ دار العلوم کراچی

مُرتب
مفتی محمد طلحہ نظامی
فاضل جامعہ دار العلوم کراچی


مکتبہ عثمانیہ
راولپنڈی

علم تصوف سے روشناس کرانے والی اور
روحانی امراض سے بچانے والی لاجواب کتاب

جلد اول

# روح کی بیماریاں اور اُن کا علاج


ازافادات

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

نائب رئیس جامعہ دارالعلوم کراچی

مرتب

مفتی محمد طلحہ نظامی

فاضل جامعہ دارالعلوم کراچی





مکتبہ عثمانیہ

اقبال مارکیٹ اقبال روڈ کمیٹی چوک راولپنڈی 0333-5141413

MAKTABA USMANIA
RAWALPINDI

کتاب :...... روح کی بیماریاں اوران کا علاج (جلداول)

افادات :...... شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہم العالی

مرتب :...... مفتی محمد طلحہ نظامی

ناشر :...... مکتبہ عثمانیہ اقبال مارکیٹ، اقبال روڈ کمیٹی چوک راولپنڈی

## ہماری مطبوعات ملنے کے پتے :

| شہر | مکتبہ | پتہ |
|---|---|---|
| اسلام آباد | مکتبہ طیبہ | جامع مسجد الرحمٰن بلیو ایریا...... اسلام آباد |
| | مکتبہ فریدیہ | نزد جامعہ فریدیہ ای سیون۔ اسلام آباد |
| راولپنڈی | اسلامی کتاب گھر | خیابان سرسید...... راولپنڈی |
| | کتب خانہ رشیدیہ | مدینہ مارکیٹ راجہ بازار...... راولپنڈی |
| لاہور | مکتبہ سید احمد شہید | الکریم مارکیٹ اردو بازار...... لاہور |
| | اسلامی کتب خانہ | فضل الٰہی مارکیٹ، چوک اردو بازار، لاہور |
| | مکتبہ رحمانیہ | غزنی اسٹریٹ۔ اردو بازار...... لاہور |
| | مکتبہ الحرمین | الحمد مارکیٹ...... غزنی اسٹریٹ۔ لاہور |
| | کتب خانہ شان اسلام | راحت مارکیٹ، اردو بازار...... لاہور |
| ملتان | مکتبہ حقانیہ | ٹی بی ہسپتال روڈ...... ملتان |
| | ادارۃ اشاعت الخیر | بیرون بوہڑ گیٹ...... ملتان |
| کراچی | قدیمی کتب خانہ | آرام باغ...... کراچی |
| | ادارۃ المعارف | دراحاطہ جامعہ دارالعلوم کراچی |
| | نور محمد کتب خانہ | آرام باغ...... کراچی |
| | مکتبہ عمر فاروق | شاہ فیصل کالونی...... کراچی |
| | ادارۃ الرشید | نیو ٹاؤن...... کراچی |
| | مکتبہ معارف القرآن | دراحاطہ جامعہ دارالعلوم...... کراچی |
| اکوڑہ خٹک | مکتبہ علمیہ | جی ٹی روڈ، نزد جامعہ حقانیہ...... اکوڑہ خٹک |

# عرض مرتب

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم العالی کی ذات گرامی عالم اسلام میں کسی تعارف کی محتاج نہیں. تصنیف وتحقیق اور جدید مسائل کے حل کی مہارت کے علاوہ اللہ رب العزت نے عوام وخواص کی اصلاح وتربیت کا ملکہ ان کی زبان میں ودیعت رکھا ہے، حضرت مدظلہم جس موضوع پر بھی گفتگو فرماتے ہیں، اس موضوع سے متعلقہ تمام ضروری پہلواور بزرگوں خصوصاً حضرت تھانویؒ اور حضرت عارفیؒ کے ملفوظات سامعین کے سامنے آجاتے ہیں، تہذیب اخلاق، تربیت باطن اور روحانی امراض اوران کے علاج کے سلسلے میں حضرت مدظلہم کے بیانات بہت ہی مؤثر ہیں، جن کو سننے کے بعد انسان کے اندر عمل کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور انسان کی روحانی بیماریوں کا کافی شافی علاج ہوجاتا ہے۔

اللہ تعالی نے دل میں یہ داعیہ پیدا فرمایا کہ حضرت مدظلہم کے ''روحانی بیماریوں اوران کے علاج'' سے متعلقہ بیانات کو کتابی شکل میں لایا جائے، چنانچہ اللہ کا نام لیکر اس پر کام شروع کردیا اور واقعتاً اسے بہت مفید اور اس موضوع پر لکھی گئی دوسری کتب سے انوکھا پایا۔ اس مجموعہ کا نام ''روح کی بیماریاں اوران کا علاج'' تجویز کیا گیا ہے، اس موضوع پر چونکہ ہمارے پاس اور بھی بیانات موجود ہیں جن پر کام جاری ہے، اس وجہ سے اس مجموعہ کو جلد اول اور آنے والے مجموعہ کو جلد ثانی بنادیا گیا، تاکہ کتاب بہت زیادہ ضخیم نہ ہوجائے۔

اس کتاب کی ضبط وترتیب کے دوران حضرت مدظلہم کی بیان فرمودہ باتوں اور نکات کو مستقل عنوانات لگاکر مزید آسان کرنے کی کوشش کی ہے، تاکہ پڑھنے والوں کو آسانی ہو، اس کتاب میں پچیس بیانات جمع کئے گئے ہیں، ان بیانات کو کل بارہ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

اللہ تعالی کا لاکھ احسان ہے کہ اس نے محض اپنے فضل وکرم سے حضرت مدظلہم جیسی عظیم شخصیت کے بیانات کو جمع کرنے کی توفیق اور ہمت بخشی، اللہ تعالی سے استدعا ہے کہ وہ حضرت مدظلہم کے طفیل اس کتاب کو بندہ ناچیز کے لئے، اس کے والدین کے لئے نجاتِ اخروی کا ذریعہ بنائے۔ اور حضرت والا کی دوسری کتب کی طرح اس کو بھی مقبولیت سے نوازے۔ آمین

محمد طلحہ نظامی

۹رمئی ۲۰۱۰ء

# اجمالی فہرست

# فہرست مضامین

## باب......(۱)

### باب اول کا پہلا بیان ......روح کی بیماریاں اور طبیب روحانی کی ضرورت

## باب اول کا دوسرا بیان ...... نفس کی کش مکش

## باب اول کا تیسرا بیان...... اصلاح نفس کی ضرورت اوراس کا طریقہ کار

## باب اول کا چوتھا بیان...... اصلاح اعمال اور اصلاح باطن کا طریقہ

## باب اول کا پانچواں بیان...... ریاضت اور مجاہدہ کی حقیقت وضرورت



## باب اول کا چھٹا بیان...... مجاہدہ کی ضرورت واہمیت

## باب اول کا ساتواں بیان...... بری صفات سے بچنے کی اہمیت

## باب......(۲) بدنظری اور اس کا علاج

## باب......(۳)

### باب سوم کا پہلا بیان ...... غیبت اوراس کا علاج

## باب سوم کا دوسرا بیان...... غیبت سے بچنے کا طریقہ

## باب سوم کا تیسرا بیان...... غیبت کی معافی کا طریقہ

## باب سوم کا چوتھا بیان...... غیبت مباح کی صورت

## باب.....(۴) تواضع رفعت اور بلندی کا ذریعہ

## باب......(۵)

## باب پنجم کا پہلا بیان...... تکبر اور اس کا علاج

## باب پنجم کا دوسرا بیان...... کبر کی اقسام

## باب پنجم کا تیسرا بیان...... کبر کا ایک اور علاج

## باب......(۶) بدگمانی، تجسس اوران کا علاج

## باب......(۷)

## باب ہفتم کا پہلا بیان......وعدہ خلافی اور اس کی مروجہ صورتیں

## باب ہفتم کا دوسرا بیان...... عہد اور وعدہ کی اہمیت

# باب......(۸)

## باب ہشتم کا پہلا بیان......امانت کی اہمیت



## باب ہشتم کا دوسرا بیان......امانت میں خیانت اور اس کی مروجہ صورتیں

## باب ...... (۹) جھوٹ اور اس کی مروجہ صورتیں

## باب......(۱۰) حسد ایک مہلک بیماری اور معاشرتی ناسور

## باب......(۱۱) سستی کا علاج

## باب......(۱۲) گناہ گار کی ہرگز تحقیر نہ کیجئے

# روح کی بیماریاں اوران کا علاج

## باب......(۱)



- دل کی بیماریاں اور طبیب روحانی کی ضرورت
- نفس کی کش مکش
- اصلاح نفس کی ضرورت واہمیت اوراس کا طریقہ کار
- اصلاح اعمال اوراصلاح باطن کا طریقہ
- ریاضت اور مجاہدہ کی حقیقت وضرورت
- مجاہدہ کی ضرورت واہمیت
- بری صفات اور خراب باتوں سے بچنے کی اہمیت

باب اول کا پہلا بیان:

# روح کی بیماریاں
# اور طبیب روحانی کی ضرورت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا۔ اَمَّا بَعْدُ قَالَ النَّبِیُّ ﷺ اَلَا اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَۃً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ. وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ. (اتحاف السادۃ المتقین: ۳/۱۵۳)

## اصلاحِ اخلاق کی اہمیت:

اخلاق کی درستی اور اس کو اللہ جل جلالہ کے احکام کے مطابق بنانا اتنا ہی ضروری اور اتنا ہی اہم اور واجب ہے، جتنا کہ عبادات کو بجالانا ضروری ہے، بلکہ اگر ذرا اور گہری نظر سے دیکھا جائے، تو یہ نظر آئے گا کہ عبادات، معاملات اور معاشرت کے جتنے احکام ہیں، ان میں سے کوئی بھی حکم اس وقت تک صحیح طریقے سے بجا نہیں لایا جاسکتا، جب تک اخلاق درست نہ ہوں، اگر اخلاق درست نہ ہوں، تو بعض اوقات یہ نماز، روزہ بھی بیکار ہو جاتا ہے، نہ صرف بے کار، بلکہ الٹا وبال بن جاتا ہے، اسی لیے اخلاق کی درستی اور اس کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے مطابق بنانا عملی زندگی کی بنیاد ہے، یہ بنیاد نہ ہو تو عمارت کھڑی نہیں ہوسکتی۔

## اخلاق کا کیا مطلب ہے؟

اخلاق کا مطلب آج کل عرف عام میں کچھ اور سمجھا جاتا ہے اور جس اخلاق کی میں بات کررہا ہوں وہ کچھ اور ہے، عرف عام میں اخلاق اس کو کہتے ہیں کہ ذرا مسکرا کر کسی آدمی سے مل لے، اس کے ساتھ خندہ پیشانی سے، نرمی سے بات کرے، اس کو کہتے ہیں کہ یہ بہت خوش اخلاق آدمی ہے، اس کے اخلاق بہت اچھے ہیں۔ لیکن جس اخلاق کی میں بات کررہا ہوں اور جس اخلاق کا مطالبہ دین نے ہم سے کیا ہے، اس کا مفہوم اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے، صرف اتنی بات نہیں ہے کہ لوگوں سے خندہ پیشانی سے مل لے، یہ لوگوں سے خندہ پیشانی سے ملنا بھی اس کا ایک نتیجہ ہوتا ہے، لیکن اصل اخلاق یہ نہیں ہے، بلکہ اصل اخلاق انسان کے باطن کی، اس کے دل کی، اس کی روح کی ایک صفت ہے، انسان کے باطن کے اندر مختلف قسم کے جذبات، خیالات، خواہشات پروان چڑھتے ہیں، ان کو اخلاق کہتے ہیں اور ان کو درست کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔

## انسان کس کو کہتے ہیں؟

اس بات کو ذرا وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ انسان کس کو کہتے ہیں؟ انسان نام ہے جسم اور روح کے مجموعے کا، صرف جسم کا نام انسان نہیں، بلکہ انسان وہ جسم ہے جس میں روح موجود ہو، فرض کرو ایک شخص کا انتقال ہوگیا، بتایئے کہ اس کے ظاہری جسم میں کیا فرق ہوا؟ آنکھ اسی طرح موجود ہے، ناک اسی طرح موجود ہے، کان اسی طرح موجود ہیں، زبان اسی طرح موجود ہے، چہرہ ایسا ہی ہے، ہاتھ پاؤں ویسے ہی ہیں، سارا جسم جوں کا توں ہے، لیکن کیا فرق پیدا ہوا؟ فرق یہ ہوا کہ پہلے اس جسم کے اندر روح سمائی ہوئی تھی، اب وہ روح نکل گئی اور روح کے نکل جانے سے انسان انسان نہیں رہتا، لاش بن جاتا ہے، جمادات میں داخل ہو جاتا ہے۔

## انسان کے جسم اور روح کا باہمی جوڑ:

وہی انسان جو روح نکلنے سے پہلے دیکھنے والوں کی نگاہوں کا پیارا تھا، عزیز تھا، لوگ اس

سے محبت کرتے تھے ،زمین جائیداد کا مالک تھا، بیوی بچوں کی دیکھ بھال کرنے والا تھا، دوست احباب کا عزیز تھا، سبھی کچھ تھا، لیکن ادھر روح جسم سے نکلی، ادھر نہ تو زمین جائیداد اس کی رہی، نہ وہ بیوی کا شوہر رہا، نہ بچوں کا خبر گیری کرنے والا رہا، جو لوگ اس سے محبت کرتے تھے، اس کو اچھی نگاہ سے دیکھتے تھے، اس کو اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے، اب وہ اس فکر میں ہیں کہ جلد از جلد اس کو اٹھا کر قبر میں پہنچا کر ٹھکانے لگائیں، کوئی کہے کہ بھئی یہ تمہارا عزیز ہے، اس کو ذرا اپنے گھر میں رکھ لو، تو کوئی اس کو رکھنے کو تیار نہیں، زیادہ سے زیادہ ایک دن رکھے گا، بہت کوئی رکھ لے تو برف وغیرہ لگا کر ہفتہ بھر رکھ لے گا، لیکن اس سے زیادہ نہیں رکھے گا، اب سب اس فکر میں ہیں کہ جلد سے جلد اٹھا کر اس کو قبر میں پھینکو اور دفن کردو۔

وہی محبت کرنے والے جو دن رات اس کی چشم و آبرو کو دیکھتے تھے، اس کے اشاروں پر ناچتے تھے، روح کے نکلنے کے بعد اب یہ حالت ہوگئی کہ بیٹا اپنے ہاتھ سے باپ کو قبر میں رکھنا چاہتا ہے اور مٹی دے کر جلد از جلد اسکو دفن کر دینا چاہتا ہے، بلکہ کسی نے قصہ بتایا کہ اخبار میں چھپا تھا کہ ایک آدمی کو جیسے شاید سکتہ ہوگیا تھا لوگوں نے غلطی سے مردہ سمجھ کر دفن کر دیا، جب سکتہ ختم ہوا تو وہ بچارہ قبر پھاڑ کر کسی طرح گھر پہنچا، جب اس نے دستک دی، تو باپ نے اندر سے پوچھا کون ہے؟ جب اس نے اپنا نام بتایا، تو باپ گھر سے لاٹھی لے کر نکلا اور لاٹھی سے اس کو مارا کہ یہ اس کا بھوت کہاں سے آ گیا، جو غریب پہلے نہیں مرا تھا اب لاٹھی سے مر گیا۔ آخر یہ کیا انقلاب عظیم واقع ہوا کہ سارا جسم اسی طرح ہے، جیسے پہلے تھا، مگر اب کوئی اس کو گھر میں رکھنے کو تیار نہیں؟ فرق یہ واقع ہوا کہ اس کے جسم سے روح نکل گئی، معلوم یہ ہوا کہ انسان کے جسم کے اندر اصل چیز اس کی روح ہے۔ جب تک یہ روح انسان کے اندر موجود ہے، اس وقت تک انسان انسان ہے، لیکن جب یہ روح نکل جائے، تو پھر وہ انسان نہیں ہے، محض ایک لاش ہے، جس سے کسی کو کوئی تعلق نہیں، سب اس فکر میں ہیں کہ اس کو جلد سے جلد قبرستان میں لے جا کر دفن کر دیں۔

## روحانی بیماریاں:

جس طرح انسان کے جسم کے اندر بہت سی صفات ہوتی ہیں، کہ بعض اوقات جسم صحت مند ہے، خوبصورت ہے، طاقتور ہے، توانا ہے اور بعض دفعہ جسم نحیف، کمزور، دبلا، پتلا، بیمار،

بدصورت ہے۔ اسی طرح انسان کی روح کی بھی کچھ صفات ہوتی ہیں، بعض اوقات روح طاقتور ہوتی ہے، بعض اوقات کمزور ہوتی ہے، بعض اوقات روح اچھی صفات کی مالک ہوتی ہے اور بعض اوقات خراب صفات کی مالک ہوتی ہے۔

جس طرح انسان کے جسم کو بیماریاں لگتی ہیں کہ کبھی بخار ہوگیا، کبھی پیٹ خراب ہوگیا، کبھی قبض ہوگیا، کبھی دست آ گئے، اسی طرح روح کو بھی بیماریاں لگتی ہیں، روح کو کیا بیماریاں لگتی ہیں؟ روح کو یہ بیماریاں لگتی ہیں کہ کبھی اس میں تکبر پیدا ہوگیا، کبھی اس میں حسد پرورش پانے لگا، کبھی اس میں بغض پیدا ہوگیا، کبھی اس میں ناشکری پیدا ہوگئی، یہ ساری کی ساری روح کی بیماریاں ہیں۔

## روحانی حسن وجمال:

اسی طرح جیسے انسان کے جسم کی خوبصورتی ہے، مثلاً کہتے ہیں کہ اس کا چہرہ بہت خوبصورت ہے، اس کی آنکھیں بڑی خوبصورت ہیں، اس کا جسم بہت خوبصورت ہے، اسی طرح روح کی بھی کچھ خوبصورتی ہے، اس کا بھی کچھ جمال ہے، اس کا کچھ حسن ہے، روح کا حسن کیا ہے؟ روح کا حسن یہ ہے کہ انسان کے اندر تواضع ہو، صبر وشکر ہو، اخلاص ہو، خود پسندی نہ ہو، ریاکاری نہ ہو، یہ سب روح کا حسن وجمال ہے۔

## نماز، روزہ، حج اور زکوۃ جسمانی عبادات ہیں:

اللہ تعالیٰ نے ہمیں اور آپ کو بہت سے احکام دیئے ہیں، جن کا تعلق ہمارے ظاہری جسم سے ہے، مثلاً نماز ہے کہ نماز کس طرح سے پڑھی جاتی ہے؟ جسم کو کبھی کھڑا کیا جاتا ہے، کبھی رکوع میں چلے جاتے ہیں، کبھی سجدے میں چلے جاتے ہیں، کبھی سلام پھیرتے ہیں، یہ ساری حرکات جسم کے ذریعے انجام پاتی ہیں، یہ ایک جسمانی عبادت ہے۔

روزہ کس طرح رکھتے ہیں؟ ایک مقررہ وقت تک بھوکے، پیاسے رہتے ہیں، یہ بھی ایک جسمانی عبادت ہے۔

مال کی ایک خاص مقدار غریب کو دینا فرض کیا گیا ہے، جس کو زکوۃ کہتے ہیں، یہ بھی اپنے ہاتھ سے دی جاتی ہے۔ (یہ بھی ایک جسمانی عبادت ہے)

اور حج بھی ایک جسمانی اور مالی عبادت ہے، حج کے اندر محنت کرنی پڑتی ہے، سفر کرنا پڑتا ہے، خاص ارکان انجام دینے پڑتے ہیں، یہ سارے کام جسم سے ادا کیے جاتے ہیں، اس لیے یہ بھی ایک جسمانی عبادت ہے۔

## تواضع، صبر، شکر وغیرہ روحانی عبادات ہیں:

جس طرح یہ ساری عبادتیں اللہ تبارک وتعالی نے ہمارے جسم سے متعلق رکھی ہیں، اسی طرح بہت سے فرائض ہماری روح اور باطن سے متعلق رکھے ہیں، مثلاً یہ حکم دیا کہ ہر انسان کو تواضع اختیار کرنی چاہیے، اب یہ تواضع جسم کا فعل نہیں ہے، یہ دل کا فعل ہے، باطن کا فعل ہے، روح کا فعل ہے، اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ یہ صفت اپنے دل میں پیدا کی جائے۔

## جسمانی تواضع مطلوب نہیں:

بہت سے بے پڑھے لکھے لوگ تواضع کا یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ کوئی مہمان آیا، تو اس کی خاطر تواضع کردو، کچھ کھانا وغیرہ اس کو کھلا دو، اس کو تواضع کہتے ہیں۔ تواضع کا مطلب یہ نہیں جو کچھ پڑھے لکھے مطلب سمجھے ہیں کہ دوسروں سے انکساری کے ساتھ پیش آنا۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آدمی کی ذرا گردن جھکی ہوئی ہو، سینہ مڑا ہوا ہو، تو جو آدمی اس طرح لوگوں سے ملتا ہے، اس کو کہتے ہیں بڑا منکسر المزاج آدمی ہے، بہت متواضع ہے۔



## تواضع کا تعلق قلب اور روح سے ہے، جسم سے نہیں:

خوب سمجھ لیجئے کہ تواضع کا کوئی تعلق جسم سے نہیں ہے، تواضع کا تعلق قلب اور روح سے ہے، انسان اپنے دل میں اپنے آپ کو بے حقیقت سمجھے، کہ میری کوئی حقیقت نہیں ہے، میری کوئی قدرت نہیں ہے، میں تو ایک بے کس، بے بس بندہ ہوں، یہ خیال دل کے اندر پیدا ہو جائے، اس کو کہتے ہیں تواضع اور اللہ تعالیٰ نے اسی کا حکم دیا ہے۔

## اخلاص دل کی ایک روحانی کیفیت ہے:

اللہ تبارک تعالیٰ نے اخلاص کا حکم دیا ہے کہ اپنے اندر اخلاص پیدا کرو، عبادتوں میں

اخلاص پیدا کرو، جو کام کرو، اللہ جل شانہ کی رضا مندی اور خوشنودی کے لیے کرو، یہ ہے اخلاص، اخلاص زبان سے کہنے سے نہیں حاصل ہوتا، یہ دل کی ایک کیفیت ہے، باطن کی ایک صفت ہے، جس کو حاصل کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔

## شکر ایک روحانی فعل ہے:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے شکر کا حکم دیا ہے کہ جب کوئی نعمت تمہیں حاصل ہو، تو اللہ جل جلالہ کا شکر ادا کرو، یہ شکر بھی انسان کے قلب کا فعل ہے، انسان کی روح کا فعل ہے، جتنا شکر ادا کرے گا، روح اتنی ہی زیادہ طاقتور ہوگی۔

## صبر کی حقیقت وروحانیت:

اللہ تعالیٰ نے صبر کا حکم دیا ہے، کہ اگر کوئی ناگوار بات پیش آ جائے تو سمجھو کہ اللہ جل جلالہ کی طرف سے ہے، جو کچھ بھی ہوا ہے اللہ تبارک تعالیٰ کی حکمت سے ہوا، اس کی مشیت کے مطابق ہے، چاہے یہ مجھ کو کتنا ہی ناگوار ہو، لیکن اللہ تبارک تعالیٰ کی مصلحت اسی میں تھی، انسان ہر ناگوار واقعے کے وقت یہ سوچے اور اس کا احساس دل میں پیدا کرے اس کو صبر کہتے ہیں۔

## روحانی فرائض کی ادائیگی جسمانی فرائض کی طرح ضروری ہے:

لہذا بہت سے احکام ایسے ہیں جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہماری روح اور ہمارے باطن سے متعلق ہم کو عطا فرمائے ہیں، یاد رکھئے کہ صبر کے موقع پر صبر کرنا ایسا ہی فرض ہے، جیسا کہ نماز پڑھنا فرض ہے، شکر کے موقع پر شکر کرنا ایسا ہی فرض ہے، جیسا کہ روزہ رکھنا فرض ہے، اخلاص کے موقع پر اخلاص کرنا ایسا ہی فرض ہے، جیسا کہ زکوٰۃ دینا فرض ہے۔ یہ سب فرائض ہیں، جو اللہ تبارک تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمائے ہیں۔

## جسمانی گناہوں کی روحانی گناہ بھی حرام ہیں:

بہت سے کام ظاہری اور جسمانی اعتبار سے گناہ قرار دیئے گئے ہیں، مثلاً جھوٹ بولنا، غیبت کرنا، رشوت لینا، سود کھانا، شراب پینا، ڈاکہ ڈالنا۔ یہ سارے کے سارے کام گناہ

ہیں، جو ہمارے ظاہری جسم سے متعلق ہیں، ہمارے اعضا سے سرزد ہوتے ہیں، اسی طرح اللہ تبارک تعالیٰ نے بہت سے باطنی کاموں کو بھی گناہ قرار دیا ہے، مثلاً تکبر ایک باطنی بیماری ہے، جو ہاتھ پاؤں سے انجام نہیں دی جاتی، یہ انسان کے باطن کا ایک روگ ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام قرار دیا ہے اور یہ اتنا ہی حرام ہے جتنا شراب پینا حرام ہے، جتنا سود کھانا حرام ہے، جتنا زنا اور بدکاری کرنا حرام ہے۔ اسی طرح حسد بھی ایک باطنی بیماری ہے اور اس کو بھی اللہ تبارک تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے اور یہ بھی اتنا ہی حرام ہے جتنے وہ گناہ حرام ہیں، جن کا میں نے پہلے آپ کے سامنے ذکر کیا ہے۔

## اخلاق کے درست ہونے کا صحیح مطلب:

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ نے انسان کے باطن اور روح سے متعلق بھی کچھ احکام رکھے ہیں، کچھ صفات کو پیدا کرنے کا حکم دیا ہے اور کچھ صفات سے بچنے کا حکم دیا ہے، جن صفات کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے پیدا کرنے کا حکم دیا ہے وہ صفات اپنے باطن کے اندر پیدا کرلے اور جن صفات سے بچنے کا حکم دیا ہے وہ صفات اپنے باطن سے الگ کرلے، تو کہیں گے کہ اس کے اخلاق درست ہوگئے، اخلاق انہی باطنی کیفیات اور روح کی صفات کا نام ہے، جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، اچھے اخلاق جن کو اپنے اندر پیدا کرنا چاہیے، ان کو اخلاق فاضلہ اور برے اخلاق جن کو دور کرنا چاہیے ان کو اخلاق رزیلہ کہتے ہیں۔

امید ہے کہ اب یہ بات سمجھ میں آگئی ہوگی کہ اخلاق کا مطلب ایک دوسرے سے اچھی طرح بات کرلینا یا اچھی طرح مسکرا دینا نہیں ہے، یہ اس کا ایک نتیجہ ہوتا ہے، کیونکہ جب اخلاق درست ہوجاتے ہیں، تو انسان کا رویہ ہر دوسرے انسان کے ساتھ بہتر ہوجاتا ہے لیکن بنیادی طور پر اس کو اخلاق نہیں کہتے، اخلاق کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کا باطن درست ہوجائے، اخلاق فاضلہ پیدا ہوجائیں، اخلاق رزیلہ دور ہوجائیں اور انسان کا باطن اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق ڈھل جائے۔

## غصہ بے شمار روحانی بیماریوں کی جڑ ہے:

اخلاق کی اصلاح کیسے ہوتی ہے؟ یہ بات ایک مثال کے ذریعے آسانی کے ساتھ سمجھ

میں آ جائے گی، مثلاً غصہ انسان کے باطن کی ایک صفت ہے، یہ غصہ انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے، پھر اس کا مظاہرہ بعض اوقات ہاتھ پاؤں سے ہوتا ہے، بعض اوقات زبان سے ، جب غصہ آ گیا اور غصے سے مغلوب ہوگیا، تو چہرہ سرخ ہوگیا، رگیں تن گئیں، زبان بے قابو ہوکر اول فول بکنے لگی، ہاتھ پاؤں چلنے لگے، یہ غصہ کا نتیجہ ہے، لیکن اصل غصہ اس کیفت کا نام ہے جو انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہے، یہ غصہ ایسی چیز ہے کہ بے شمار باطنی رزائل کی بنیاد اور جڑ ہے اس کی وجہ سے بہت سے گناہ سرزد ہوتے ہیں اور بہت سی باطنی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔

## غصہ نہ آنا بھی ایک بیماری ہے:

اگر یہ غصہ انسان میں بالکل بھی نہ ہو، کوئی کچھ بھی کرتا رہے، لیکن اس کو کبھی غصہ آتا ہی نہیں، یہ بھی بیماری ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کو غصہ اس مقصد کے لیے دیا ہے کہ انسان اپنی جان کا، اپنی آبرو کا، اپنے دین کا دفاع کر سکے، اب اگر کوئی شخص پستول تانے کھڑا ہے اور اس کی جان لینا چاہتا ہے اور ان صاحب کو غصہ آتا ہی نہیں ، یہ بیماری ہے ،اگر کوئی آدمی ۔نعوذ باللہ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتا ہے، تو اس وقت ایک آدمی کو غصہ آتا ہی نہیں، اس کے معنی ہیں کہ یہ بیمار ہے، یہ مواقع ایسے تھے کہ غصہ آنا چاہیے تھا، اگر نہیں آ رہا تو یہ بیماری ہے۔

## غصہ اعتدال سے زیادہ ہو تو یہ بھی بیماری ہے:

اور اگر غصہ حد اعتدال سے زیادہ ہے، تو یہ بھی بیماری ہے، غصہ اس لیے آئے ، تاکہ دوسرے آدمی کے شر سے اپنی حفاظت کر سکے، اس حد تک تو غصہ صحیح ہے، اب اگر غصہ کرنے کی جتنی ضرورت تھی، اس سے زیادہ کر رہا ہے، مثلاً ایک تھپڑ مار دینے سے کام چل سکتا تھا، لیکن اب یہ غصہ میں آ کر ایک تھپڑ کے بجائے مارے جا رہا ہے، یہ غصہ حد اعتدال سے زیادہ اور گناہ ہے ۔لہٰذا غصہ اگر کم ہو تو یہ بھی باطن کی بیماری اور زیادہ ہو تو یہ بھی باطن کی بیماری، غصہ اعتدال کی حد میں ہونا چاہیے کہ ضرورت کے موقع پر آئے اور بلا ضرورت نہ آئے اور اگر بلا ضرورت آئے بھی تو آدمی اس کو استعمال نہ کرے۔

## حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے غصہ کا عجیب وغریب واقعہ:

حضرت علیؓ کا واقعہ ہے کہ ایک یہودی نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کوئی گستاخانہ کلمہ دیا، حضرت علیؓ کہاں سننے والے تھے، وہ اس یہودی کو گرا کر اس کے سینے پر چڑھ بیٹھے، یہودی نے جب دیکھا کہ اب کچھ اور نہیں کرسکتا، تو اس نے وہیں زمین پر لیٹے لیٹے حضرت علیؓ کے چہرہ مبارک پر تھوک دیا، حضرت علیؓ فوراً اس کو چھوڑ کر الگ کھڑے ہو گئے، کسی نے پوچھا کہ یہ آپ نے کیا کیا؟ اب تو اس نے مزید گستاخی کی، اس کو اور مارنا چاہیے تھا؟ فرمایا کہ اصل میں بات یہ ہے کہ پہلے میں نے اس کو اس لیے سزا دی تھی کہ اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی گستاخی کی تھی، اس وقت میرا غصہ ذات کیلئے نہیں تھا، بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ناموس کی حفاظت کے لیے تھا، اس واسطے میں اس پر چڑھ بیٹھا، جب اس نے مجھ پر تھوکا، تو میرے دل میں اپنی ذات کے لیے غصہ پیدا ہوا، کہ اس نے میرے منہ پر کیوں تھوکا؟ اپنی ذات کا انتقام لینے کا جذبہ میرے دل میں پیدا ہوا، اس وقت مجھے خیال آیا کہ اپنی ذات کے لیے انتقام لینا کوئی اچھی بات نہیں ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی ذات کے لیے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا، اس لیے میں اسے چھوڑ کر الگ کھڑا ہو گیا۔

یہ ہے غصے میں اعتدال کہ پہلے غصے کا صحیح موقع تھا، تو غصہ آیا اور اس پر عمل بھی کیا اور دوسرے غصے کا صحیح موقع نہیں تھا، اس لیے اس پر عمل نہیں کیا اور اس یہودی کو چھوڑ کر الگ کھڑے ہو گئے۔

## روحانیات میں حد اعتدال کی ضرورت:

انسان کے باطن کے جتنے بھی اخلاق ہیں، ان سب کا یہی حال ہے کہ اپنی ذات میں وہ برے نہیں ہوتے، جب تک وہ حد اعتدال میں رہیں اس وقت تک وہ صحیح ہیں، لیکن اگر اعتدال سے کم ہو گئے، تو وہ بھی بیماری اور اعتدال سے زیادہ ہو گئے تو وہ بھی بیماری، اصلاح نفس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ان اخلاق کو اعتدال پر رکھا جائے، نہ کم ہوں، نہ زیادہ ہوں۔

## جسم انسانی میں دل کی اہمیت اوراس کی مراد:

اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

أَلَا إِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ. وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ. (اتحاف السادة المتقین:۳/۱۵۳)

یعنی خوب یادرکھو کہ انسان کے جسم کا ایک لوتھڑا ہے، اگر وہ صحیح ہو جائے تو سارا جسم صحیح ہو جاتا ہے اور اگر وہ خراب ہو جائے، تو سارا جسم خراب ہو جاتا ہے، پھر فرمایا کہ خوب سن لو کہ وہ لوتھڑا جس کی وجہ سے سارا جسم صحیح ہوتا ہے یا خراب ہوتا ہے، وہ انسان کا دل ہے۔ مگر اس لوتھڑے سے وہ گوشت کا لوتھڑا مراد نہیں ہے، اس لیے کہ اگر دل کو چیر کر دیکھو تو اس میں یہ بیماریاں نظر نہیں آئیں گی، نہ تکبر نظر آئے گا، نہ حسد نظر آئے گا، نہ بغض نظر آئے گا اور اگر ڈاکٹر کے پاس جاؤ تو وہ دل کی ظاہری بیماریاں چیک کر کے بتا دے گا کہ اس کی دھڑکن صحیح ہے یا نہیں ہے؟ رگیں صحیح کام کر رہی ہیں یا نہیں؟ اس میں خون کی سپلائی صحیح ہو رہی ہے یا نہیں؟ لیکن یہ تمام چیزیں جو چیک اپ اور آلات کے ذریعے معلوم کی جاسکتی ہیں، یہ دل کے صرف ظاہری عمل کا نقشہ پیش کرتی ہیں۔

## دل کی بیماریاں اندیکھی بیماریاں ہیں:

لیکن انسان کے قلب کے ساتھ کچھ چیزیں ایسی وابستہ ہیں، جو اندیکھی ہیں، آنکھوں سے نظر نہیں آتیں، وہ یہی ہیں جن کا میں نے اوپر ذکر کیا یعنی دل میں شکر ہے یا نہیں؟ حسد ہے یا نہیں؟ بغض ہے یا نہیں؟ صبر وشکر کی کیفیات ہیں یا نہیں؟ یہ ایسی چیزیں ہیں جو ظاہری امراض کا ڈاکٹر دیکھ کر نہیں بتا سکتا اور کوئی ایسی مشین ایجاد نہیں ہوئی ہے جس کے ذریعے چیک کر کے بتا دیا جائے کہ اس کو یہ باطنی بیماری ہے۔

## دل کے ڈاکٹر کون ہوتے ہیں؟

اس بیماری کے ڈاکٹر، اس کی تشخیص کرنے والے، اس کا علاج کرنے والی کوئی اور ہی قوم ہے، یہی وہ قوم ہے جن کو ''حضرات صوفیاء کرام'' کہتے ہیں۔ جو علم الاخلاق کے ماہر

ہوتے ہیں، باطن کی بیماریوں کی تشخیص اور ان کا علاج کرتے ہیں، یہ ایک مستقل فن ہے، ایک مستقل علم ہے، اس کو بھی اسی طریقے سے پڑھا اور پڑھایا جاتا ہے، جس طرح ڈاکٹری پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے۔ پھر آپ نے ظاہری بیماری میں دیکھا ہوگا کہ بہت سی ظاہری بیماریاں ایسی ہوتی ہیں، جن کا انسان کو خود پتہ لگ جاتا ہے، بخار ہوگیا تو معلوم ہوگا کہ گرمی لگ رہی ہے، بدن میں درد ہے، معلوم ہوگا کہ بخار ہے، بیمار خود بھی پہچان لے گا کہ بخار ہے اور اگر خود نہیں پہچان سکے گا تو تھرمامیٹر لگا کر دیکھ لے گا، اس سے پتہ چل جائے گا کہ بخار ہے، اگر خود بھی نہیں پہچان سکا تو اس کے گھر والے ذاتی آلات سے بھی نہیں پہچان سکے تو ڈاکٹر کے پاس چلا جائے گا، وہ ڈاکٹر بتادیگا کہ فلاں بیماری ہے۔

لیکن باطن کی بیماریاں ایسی ہیں کہ نہ تو بسا اوقات مریض کو خود پتہ لگتا ہے کہ میرے اندر یہ بیماری ہے اور نہ کوئی آلہ ایسا انسان کے پاس موجود ہے، جس سے پتہ لگ جائے کہ تکبر کا ٹمپریچر کیا ہے؟ اور ظاہری ڈاکٹر کے پاس جائے تو وہ بھی بے چارہ نہیں بتا سکتا کہ اس کے اندر یہ بیماری ہے یا نہیں؟ اس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کسی باطن کے معالج کے پاس جا کر تشخیص کرائے کہ میرے اندر تکبر ہے یا نہیں؟

## تواضع اور تواضع کے دکھاوے میں تکبر و بڑائی:

تواضع کا مطلب آپ کی سمجھ میں آ گیا کہ تواضع کا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو بے حقیقت سمجھنا، اس کو عرف عام میں انکساری بھی کہتے ہیں، اب سنئے حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ بسا اوقات لوگ کہتے ہیں کہ میں تو بڑا بے کار آدمی ہوں، میں تو بے حقیقت ہوں، جاہل ہوں، بہت گناہ گار ہوں، بڑا ناچیز آدمی ہوں، میری کوئی حقیقت نہیں ہے، اس سے بظاہر شبہ یہ ہوتا ہے کہ یہ بے چارہ بہت تواضع کر رہا ہے کہ اپنے آپ کو بے حقیقت، ناکارہ، ناچیز، جاہل اور گناہ گار سمجھ رہا ہے۔

بظاہر دیکھنے میں یہ تواضع معلوم ہو رہی ہے، لیکن حضرت فرماتے ہیں کہ بکثرت ایسا ہوتا ہے کہ جو شخص یہ الفاظ کہہ رہا ہوتا ہے، حقیقت میں وہ متواضع نہیں ہوتا، بلکہ اس میں دو بیماریاں ہوتی ہیں: ایک تکبر اور دوسری تواضع کا دکھاوا۔ یعنی یہ کہہ رہا ہے کہ میں بڑا بے حقیقت آدمی ہوں، جاہل آدمی ہوں، یہ سچے دل سے نہیں کہہ رہا، بلکہ اس لیے کہہ رہا ہے

تا کہ دیکھنے والے اس کو متواضع سمجھیں اور کہیں کہ یہ تو بڑا منکسر المزاج ہے۔

## تواضع کے دکھاوے والے شخص کی آزمائش وامتحان کا طریقہ:

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص یہ کہہ رہا ہو کہ میں بڑا گناہ گار، جاہل، نا کارہ اور ناچیز ہوں، اس کے امتحان کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو اگر اس وقت دوسرا آدمی یہ کہہ دے کہ بے شک آپ نا کارہ اور ناچیز بھی، گناہ گار بھی، جاہل بھی اور بے حقیقت بھی پھر دیکھو کہ اس وقت اس کے دل پر کیا گزرے گی؟ کیا اس کا شکر گزار ہو گا کہ آپ نے بڑی اچھی بات کہی؟ میرے خیال میں تقریباً سو فیصد معاملات میں اگر وہ دوسرا کہہ دے گا کہ بے شک آپ ایسے ہی ہیں، تو طبیعت کو بڑی ناگواری ہو گی کہ دیکھو اس نے مجھے ناچیز، نا کارہ اور جاہل کہہ دیا۔

معلوم ہوا کہ صرف زبان سے کہہ رہا تھا کہ نا کارہ ہے، ناچیز ہے، جاہل ہے، لیکن دل میں یہ خیال نہیں تھا بلکہ مقصد یہ تھا کہ جب میں اپنی زبان سے کہوں گا کہ جاہل ہوں، نا کارہ، ناچیز ہوں، تو سامنے والا یہ کہے گا کہ نہیں حضرت! یہ تو آپ کی تواضع ہے، آپ تو حقیقت میں بڑے عالم فاضل آدمی ہیں، بڑے متقی پارسا ہیں، یہ کہلوانے کے لیے یہ سب کچھ کہہ رہا ہے اور دکھاوا کر رہا ہے کہ میں بڑا متواضع ہوں، حقیقت میں دل میں تکبر بھرا ہوا ہے، دکھاوا بھرا ہوا ہے اور ظاہر یہ کر رہا ہے کہ میں بہت متواضع ہوں۔

## روحانی معالج کی ضرورت واہمیت:

آپ اندازہ لگائیے کہ اس کو کون پہچانے گا؟ کہ یہ الفاظ سچے دل سے کہے جا رہے ہیں، یا اندر بیماری بھری ہوئی ہے، اس کو تو وہی پہچان سکتا ہے جو باطنی امراض کا ماہر اور معالج ہو، اسی لیے ضرورت ہوتی ہے معالج کے پاس جانے کی کہ اکثر اوقات انسان خود اپنے باطنی امراض کو نہیں پہچان سکتا۔

## روحانی معالج کے تجویز کردہ نسخہ کی افادیت واہمیت:

ایک صاحب میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ کی مجلس میں آیا کرتے تھے، ایک دن والد صاحب نے دیکھا کہ انہوں نے خود اپنی مرضی سے مجلس میں

آنے والوں کے جوتے سیدھے کرنے شروع کر دیئے، اس کے بعد ہر دفعہ وہ آ کر پہلے مجلس میں آنے والوں کے جوتے سیدھے کرتے اور پھر مجلس میں بیٹھتے، والد صاحب نے کئی دفعہ ان کو یہ کام کرتے دیکھا، تو ایک دن ان کو منع کر دیا کہ یہ کام مت کیا کرو، پھر بعد میں بتایا کہ بات دراصل یہ تھی کہ یہ بے چارہ یہ سمجھا تھا کہ میرے اندر تکبر ہے اور اس تکبر کا علاج اپنی رائے سے تجویز کر لیا، کہ لوگوں کے جوتے سیدھے کروں گا، تو اس سے میرا تکبر دور ہوگا، تو والد صاحب فرماتے ہیں کہ اس علاج سے فائدہ ہونے کے بجائے اس کو نقصان ہوتا، تکبر اور عجب میں اضافہ ہوتا، اس لیے کہ جب جوتے سیدھے کرنے شروع کیے، تو دل و دماغ میں یہ بات پیدا ہوتی کہ میں نے تو اپنے آپ کو مٹا دیا، میں نے تواضع کی حد کر دی کہ لوگوں کے جوتے سیدھے کرنے شروع کر دیئے، اس سے مزید خود پسندی پیدا ہوتی ہے، اس لیے اسے روک دیا کہ تمہارا کام یہ نہیں اور اس کے لیے دوسرا علاج تجویز فرمایا۔

اب بتایئے بظاہر دیکھنے میں جو شخص دوسروں کے جوتے سیدھے کر رہا ہو، وہ متواضع معلوم ہو رہا ہے، لیکن جاننے والا جانتا ہے کہ یہ کام حقیقت میں تکبر پیدا کر رہا ہے، تواضع سے اس کا کوئی تعلق نہیں، لہذا نفس کے اندر اتنے باریک نکتے ہوتے ہیں، کہ آدمی خود سے اندازہ نہیں لگا سکتا، جب تک کہ کسی باطنی امراض کے ماہر سے رجوع نہ کرے اور وہ نہ بتائے کہ تمہارا یہ عمل اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مقرر کی ہوئی حد کے اندر ہے یا نہیں؟ وہی بتا سکتا ہے کہ اس حد تک درست ہے اور اس حد سے باہر یہ عمل درست نہیں ہے۔

## تصوف کی حقیقت صرف وظائف نہیں؟

یہی وجہ ہے کہ آج کل تصوف نام ہو گیا اس بات کا کہ کسی پیر صاحب کے پاس چلے گئے، ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور بیعت کرنے کے بعد انہوں نے کچھ وظیفے بتا دیئے، کچھ اوراد سکھا دیئے، کہ صبح یہ پڑھا کرو، شام کو یہ پڑھا کرو اور بس اللہ اللہ خیر سلا، اب نہ باطن کی فکر، نہ اخلاق کے درست کرنے کا اہتمام، نہ اخلاق فاضلہ کو حاصل کرنے کا شوق، نہ اخلاق رزیلہ کو ختم کرنے کی فکر، یہ سب کچھ نہیں، بس بیٹھے ہوئے وظیفے پڑھ رہے ہیں اور بعض اوقات یہ وظیفے پڑھنا ان بیماریوں کے اندر اور زیادہ شدت پیدا کر دیتا ہے۔

## وظائف ومعمولات کی حقیقت:

ان وظائف، اذکار اور معمولات کی مثال ایسی ہے، جیسے مقویات اور مقویات کا اصول یہ ہے کہ اگر کسی کے اندر بیماری موجود ہے اور بیماری کی حالت میں وہ مقویات کھاتا رہے، تو بسا اوقات نہ صرف یہ کہ اس کو قوت حاصل نہیں ہوتی، بلکہ بیماری کو قوت حاصل ہوتی ہے، بیماری بڑھ جاتی ہے، اگر دل میں تکبر بھرا ہوا ہے، عجب بھرا ہوا ہے، اور بیٹھ کر وظیفے گھونٹ رہا ہے اور ذکر بہت کر رہا ہے، تو بعض اوقات اس کے نتیجے میں اصلاح ہونے کے بجائے تکبر اور بڑھ جاتا ہے، اس لیے یہ جو بتایا جاتا ہے کہ جب بھی کوئی وظیفہ کرو، یا ذکر کرو، کسی شیخ کی رہنمائی میں کرو، اس لیے کہ شیخ جانتا ہے کہ اس سے زیادہ اگر بتاؤں گا، تو وہ اس کے اندر بیماری پیدا کرے گا، اس واسطے وہ اس کو روک دیتا ہے کہ بس اب مزید ذکر کی ضرورت نہیں، حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ نے کتنے آدمیوں کے لیے یہ علاج تجویز کیا کہ تمام وظائف واذکار ترک کر دیں، حضرت نے ان کے تمام معمولات چھڑوا دیئے، خاص حالات میں جب دیکھا کہ اس کے لیے یہ وظیفہ مضر ثابت ہو رہا ہے تو وہ چھڑوا دیا۔

## اصلاح کا پہلا قدم اخلاق کی اصلاح ہے:

لیکن آج کل تصوف کا اور پیری مریدی کا سارا زور اس پر ہے کہ معمولات بتا دیئے گئے کہ فلاں وقت یہ ذکر کرنا ہے، فلاں وقت یہ ذکر کرنا ہے، بس وہ محض ذکر کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، چاہے باطن کے اندر کتنی ہی بیماریاں جوش مار رہی ہوں، پہلے زمانے میں صوفیاء کرام کے ہاں معمول تھا کہ کسی شخص کی اصلاح کا پہلا قدم یہ ہوتا تھا کہ اس کے اخلاق کی اصلاح کرنے کی فکر کرتے، اس کے لیے مجاہدات کروائے جاتے تھے، ریاضتیں ہوتی تھیں، رگڑا جاتا تھا، تب جا کر اندر کی اصلاح ہوتی تھی اور اس کے بعد انسان کسی قابل ہوتا تھا۔

## شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے پوتے کی اصلاح کا واقعہ:

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی، بڑے اونچے درجے کے اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ ہمارے بزرگوں کے شجرے کے اندر ان کا اعلیٰ درجے کا واسطہ ہے، ان کے ایک پوتے تھے،

جب تک شیخ حیات تھے، پوتے کو فکر نہ ہوئی، ساری دنیا آ کر دادا سے فیض حاصل کرتی رہی، لیکن وہ صاحب زادگی کی موج میں رہے اور دادا کی طرف اس نقطہ نظر سے رجوع نہ کیا کہ اپنی اصلاح کرائیں، جب شیخ کا انتقال ہو گیا، تب ان کو حسرت ہوئی کہ یا اللہ میں کتنا محروم ہو گیا، کہاں کہاں سے آ کر ساری دنیا فیض اٹھا گئی اور میں گھر میں ہوتے ہوئے کچھ بھی حاصل نہ کر سکا اور چراغ تلے اندھیرا۔ اب حسرت ہوئی تو سوچا کہ کیا کروں؟ تلافی کیسے ہو ؟ خیال آیا کہ میرے دادا سے جن لوگوں نے اصلاح نفس کی دولت حاصل کی تھی ان میں سے کسی کی طرف رجوع کروں، معلوم کیا کہ میرے دادا کے خلفاء میں سے کون اونچے مقام کا بزرگ ہے، معلوم ہوا کہ بلخ میں ایک اونچے مقام کے بزرگ ہیں، اب کہاں گنگوہ اور کہاں بلخ؟ تو یہ کہ گھر میں دولت موجود تھی اور ہر وقت ان سے رجوع کر سکتے تھے، وہ نہ کیا، آخر اس کی نوبت آئی کہ بلخ تک اتنا لمبا چوڑا مشقت کا سفر کریں، اب چونکہ طلب صادق تھی، اس لیے سفر پر روانہ ہو گئے۔

## بلخ پہنچنے پر شیخ کے پوتے کا استقبال:

ادھر جب شیخ کے خلیفہ جو بلخ میں مقیم تھے، معلوم ہوا کہ میرے شیخ کے پوتے آ رہے ہیں، تو اپنے شہر سے باہر نکل کر انہوں نے بڑا شاہانہ استقبال کیا، اکرام کے ساتھ گھر لے کر آئے اور شاندار کھانے پکوائے، اعلیٰ درجے کی دعوت کی، بہت اعلیٰ درجے کی رہائش کا انتظام کیا، قالین بچھوائے اور اللہ جانے کیا کچھ کیا۔

## حمام کی آگ روشن کیجئے:

جب ایک دو دن گزر گئے، تو انہوں نے کہا کہ حضرت آپ نے میرے ساتھ بڑی شفقت کا معاملہ کیا، بڑا اکرام فرمایا، لیکن درحقیقت میں کسی اور مقصد کے لیے آیا تھا، پوچھا کیا مقصد ؟ کہا کہ مقصد یہ تھا کہ آپ میرے گھر سے جو دولت لے کر آئے تھے، اس دولت کا کچھ حصہ مجھے بھی عنایت فرما دیں، اس لیے حاضر ہوا تھا، شیخ نے کہا اچھا وہ دولت لینے آئے ہو؟ کہا کہ جی ہاں! کہا کہ اگر وہ دولت لینے آئے ہو تو یہ غالیچے، یہ قالین، یہ اعزاز و اکرام، یہ کھانے پینے کا انتظام سب ختم کر دیا جائے، رہائش کا انتظام، جو اعلیٰ درجے کا کیا گیا تھا، وہ بھی ختم

کر دیا جائے، انہوں نے پوچھا کہ اب کیا کروں؟ فرمایا ہماری مسجد کے پاس ایک حمام ہے، اس میں وضو کرنے والوں کے لیے لکڑیاں جلا کر پانی گرم کیا جاتا ہے، تم وہاں حمام کے پاس بیٹھا کرو اور لکڑیاں جھونک کر وضو کرنے والوں کے لیے پانی گرم کیا کرو، بس تمہارا یہی کام ہے، نہ بیعت، نہ وظیفہ، نہ ذکر، نہ معمولات، نہ کچھ اور انہوں نے پوچھا رہائش کہاں؟ فرمایا رات کو جب سونا ہو، تو وہیں حمام کے پاس سو جایا کرو، کہاں تو یہ اعزاز و اکرام، استقبال ہو رہا ہے، قالین بچھ رہے ہیں، کھانے پک رہے ہیں، دعوتیں ہو رہی ہیں، اور کہاں اب حمام جھونکنے پر لگا دیئے گئے، اب حمام میں بیٹھے ہیں اور آگ میں لکڑیاں جھونک رہے ہیں۔

## ابھی بہت کسر ہے، ابھی چاول گلا نہیں:

لکڑیاں جھونکتے جھونکتے شیخ نے ایک دن جمعدارنی کو ہدایت کی کہ ایسا کرنا کہ حمام کے پاس ایک آدمی بیٹھا ہوگا یہ کچرے کا ٹوکرا لیکر اس کے قریب سے گزر جانا اور اس طرح گزرنا کہ اس ٹوکرے کی بو اس کی ناک میں پہنچ جائے، اب وہ ٹوکرا لے کر حمام کے پاس سے جو گزری، تو چونکہ یہ تو صاحب زادے تھے، نواب زادگی کی زندگی گزاری تھی، ایک کڑی نگاہ اس پر ڈالی اور کہا تیری یہ مجال کہ تو یہ ٹوکرا لے کر میرے پاس سے گزرے، نہ ہوا گنگوہ، ورنہ میں تجھے بتاتا، شیخ نے جمعدارنی کو بلا کر پوچھا کہ جب تو ٹوکرا لے کر گزری تو کیا ہوا؟ اس نے کہا جی وہ تو بہت غصے ہوئے اور انہوں نے کہا گنگوہ ہوتا تو تجھے بہت سخت سزا دیتا، کہا کہ او ہو ابھی بہت کسر ہے، ابھی چاول گلا نہیں۔

پھر کچھ دن گزرے تو شیخ نے جمعدارنی سے کہا کہ اب کے نہ تو صرف وہ ٹوکرا لے کر ان کے قریب سے گزرنا بلکہ اس طرح گزرنا کہ ٹوکرا ان کے جسم سے لگ جائے اور پھر مجھے بتانا کہ کیا ہوا؟ اس نے یہی کیا، شیخ نے پوچھا کیا ہوا؟ اس نے کہا کہ جی ہوا یہ کہ جب میں ٹوکرا لے کر گزری اور ٹوکرا بالکل ان کے جسم کے رگڑ کھاتا ہوا گزرا، تو انہوں نے نہایت ترش نگاہ سے میری طرف دیکھا لیکن زبان سے کچھ نہیں کہا، شیخ نے کہا الحمدللہ فائدہ ہو رہا ہے۔

## دل کا طاغوت اب ٹوٹ گیا:

پھر کچھ دن بعد شیخ نے کہا کہ اب اس طرح گزرنا کہ ٹوکرا گر جائے اور اس طرح گرے

کہ تھوڑا سا کچرا ان کے اوپر بھی پڑ جائے اور پھر مجھے بتا دینا کہ انہوں نے کیا کہا؟ اس نے ایسا ہی کیا، شیخ نے پوچھا کہ اب کیسا ہوا؟ اس نے کہا جی اب تو عجیب معاملہ ہوا، میں نے جو ٹوکرا گرایا، تو تھوڑا سا کوڑا ان کے اوپر بھی پڑا اور میں بھی گر گئی، میں جو گری تو ان کو اپنے کپڑوں کا تو ہوش نہیں تھا، مجھ سے پوچھنے لگے کہ چوٹ تو نہیں لگی؟ فرمایا کہ الحمدللہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ دل میں جو طاغوت تھا وہ ٹوٹ گیا۔

## زنجیر مت چھوڑنا

اب ان کو بلا کر ڈیوٹی بدل دی اور کہا کہ اب تمہارا وہ حمام کا کام ختم، اب تم ہمارے ساتھ رہا کرو، وہ اس طرح کہ ہم کبھی کبھی شکار کے لیے جاتے ہیں، تو تم ہمارے شکاری کتوں کی زنجیر پکڑ کر ہمارے ساتھ چلا کرو، اب ذرا اونچا درجہ عطا ہوا کہ شیخ کے ساتھ صحبت اور ہم رکابی کا شرف بھی عطا ہو رہا ہے، لیکن کتے کی زنجیر تھام کر ساتھ چلنے کا حکم ہے، شکار کے دوران کتوں نے کوئی شکار دیکھ لیا اور اس کی طرف جو دوڑے تو چونکہ شیخ کا حکم تھا کہ زنجیر نہ چھوڑنا، اس لیے انہوں نے زنجیر نہیں چھوڑی، کتنے تیز بھاگے جا رہے ہیں اور یہ زنجیر چھوڑتے ہیں نہیں، اسی حالت میں زمین پر گر گئے اور کتوں کے پیچھے زمین پر گھسٹتے ہوئے چلے جا رہے ہیں، جسم پر کئی زخم لگ گئے اور لہولہان ہو گئے۔

## دادا کی وراثت آپ کی طرف منتقل ہوگئی:

رات کو شیخ نے اپنے شیخ حضرت عبدالقدوس گنگوہی کو خواب میں دیکھا، انہوں نے فرمایا کہ میاں ہم نے تم سے ایسی محنتیں نہیں لی تھیں، اس وقت ان کو تنبیہ ہوئی، بلایا اور بلا کر گلے لگا کر فرمایا آپ جو دولت لینے آئے تھے اور جو دولت آپ کے گھر سے اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمائی تھی الحمدللہ میں نے وہ ساری دولت آپ کے حوالے کر دی، دادا کی وراثت آپ کی طرف منتقل ہوگئی، اللہ کے فضل وکرم سے اب آپ اطمینان سے وطن واپس تشریف لے جائیں۔

## اصلاح کا اصل مقصد کیا ہے؟

عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ حضرات صوفیاء کرام کا اصل کام اندر کی بیماریوں کا علاج تھا

محض وظیفے، ذکر، تسبیح، معمولات نہیں تھیں۔ یہ ذکر، وظیفے، تسبیح، معمولات یہ سب بطور مقویات کے ہیں، یہ اصلاح کے عمل میں معاونت کرنے کے لیے کروائے جاتے تھے، لیکن اصل مقصد یہ تھا کہ باطن کی بیماریاں دور ہوں، تکبر دل سے نکلے، حسد دل سے نکلے، بغض دل سے نکلے، عجب دل سے نکلے، منافقت دل سے نکلے، دکھاوے کا شوق دل سے نکلے، حب جاہ دل سے نکلے، حب دنیا دل سے نکلے، قلب کو ان چیزوں سے صاف کرنا اصل مقصود ہے، اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا ہو، اللہ تعالیٰ سے امید وابستہ ہو، اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہو، توکل ہو، استقامت ہو، اخلاص ہو، اللہ تبارک تعالیٰ کے لیے تواضع ہو، یہ چیزیں پیدا کرنا تصوف کا اصل مقصود ہے۔

## شریعت وطریقت دو جدا چیزیں نہیں؟

لوگ سمجھتے ہیں کہ تصوف شریعت سے کوئی الگ چیز ہے، خوب سمجھ لو کہ یہ شریعت کا ایک حصہ ہے، شریعت انسان کے ظاہری اعمال وافعال سے متعلق جتنے احکام ہیں ان کے مجموعے کا نام ہے اور طریقت یا تصوف باطن کے اعمال وافعال سے متعلق احکام کے مجموعے کا نام ہے اور باطن کی اہمیت اس لیے زیادہ ہے کہ اگر یہ درست نہ ہو تو ظاہری اعمال بھی بیکار ہو جاتے ہیں، فرض کرو کہ اخلاص نہیں ہے، اخلاص کے کیا معنی ہیں؟ اخلاص کے معنی یہ ہیں ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی فکر کہ انسان جو کام بھی کرے صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے کرے، یہ ہے اخلاص، اخلاص ایک باطنی فعل ہے، ایک شخص کو اخلاص حاصل نہیں ہے، تو اگر وہ نماز بغیر اخلاص کے پڑھ رہا ہے اور اس لیے پڑھ رہا ہے کہ لوگ مجھے متقی پرہیزگار سمجھیں، عبادت گزار سمجھیں، اب ظاہری اعمال تو درست ہیں، لیکن چونکہ باطن میں اخلاص کی روح نہیں ہے، اس واسطے وہ ظاہری اعمال بے کار ہیں، بے مصرف ہیں، گناہ ہیں، کیونکہ حدیث شریف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

مَنْ صَلّٰی یُرَائِیْ فَقَدْ أَشْرَکَ بِاللّٰهِ . (مشکوۃ، کتاب الرقاق، الریاء والسمعۃ)

یعنی جو شخص لوگوں کو دکھانے کے لیے نماز پڑھ رہا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کا ارتکاب کر رہا ہے۔

گویا اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخلوق کو شریک ٹھہرایا، اللہ تعالیٰ کے بجائے مخلوق کو راضی کرنا چاہتا ہے، اس لیے باطن کی اصلاح ظاہری اعمال کو درست کرنے کے لیے بھی لازمی ہے، کہ اگر یہ نہیں ہوگی، تو ظاہری اعمال بھی بے کار ہو جائیں گے۔

## اپنا روحانی معالج تلاش کیجئے:

ہمارے بزرگوں نے یہ طریقہ بتایا کہ چونکہ انسان ان چیزوں کی اصلاح خود نہیں کرسکتا، لہذا کوئی معالج تلاش کرنا چاہیے، اس معالج کو چاہے پیر کہہ لو اور چاہے شیخ کہہ لو، چاہے استاد کہہ لو، لیکن اصل میں وہ معالج ہے، باطن کی بیماریوں کا ڈاکٹر ہے، جب تک انسان یہ نہیں کرے گا، اس وقت تک اسی طرح بیماریوں میں مبتلا رہے گا اور اس کے اعمال خراب ہوتے چلے جائیں گے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

(ماخذہ: اصلاحی خطبات: جلد سوم)

باب اول کا دوسرا بیان:

# نفس کی کش مکش

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَ نُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَ نَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾

## مجاہدہ کے لغوی اور اصطلاحی معنی:

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے (ریاض الصالحین میں) آگے ایک نیا باب قائم فرمایا ہے ''باب فی المجاہدۃ'' مجاہدہ کے لفظی معنی ہیں ''کوشش کرنا، محنت کرنا''، ''جہاد'' بھی اسی سے نکلا ہے، اس لیے کہ عربی زبان میں ''جہاد'' کے معنی لڑنے کے نہیں ہیں، بلکہ محنت اور کوشش کرنے کے ہیں اور لفظ ''مجاہدہ'' کے معنی بھی یہی ہیں، یعنی کوشش کرنا۔

اور قرآن وسنت اور صوفیاء کی اصطلاح میں ''مجاہدہ'' اس کو کہا جاتا ہے کہ انسان اس بات کی کوشش کرے کہ اس کے اعمال درست ہو جائیں، اس کے اخلاق درست ہو جائیں اور گناہوں سے بچ جائے اور اپنے نفس کو غلط سمت میں جانے سے بچائے، اس کام کا نام ''مجاہدہ'' ہے۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ'' (ترمذی، باب ماجاء فی فضل من مات مرابطا)

فرمایا کہ اصلی مجاہدہ وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے، لڑائی کے میدان میں دشمن سے لڑنا بھی جہاد ہے، لیکن اصلی مجاہدہ وہ ہے کہ جو اپنے نفس سے اس طرح جہاد کرے کہ

نفس کی خواہشات، نفس کی آرزوئیں، نفس کے تقاضے ایک طرف بلا رہے ہیں اور انسان نفس کے ان تقاضوں اور آرزوؤں کو پامال کر کے دوسرا راستہ اختیار کر لیتا ہے، تو اس کا نام ''مجاہدہ'' ہے۔ لہٰذا جو شخص بھی اپنی اصلاح کی طرف قدم بڑھانا چاہے اور اللہ جل شانہ کی طرف قدم بڑھانا چاہیے تو اس کو مجاہدہ کرنا ہی پڑتا ہے، یعنی اپنے نفس کی مخالفت کرنا اور نفسانی خواہشات کے مخالف زبردستی کر کے، محنت کر کے، کوشش کر کے کڑوا گھونٹ پی کر عمل کرنا اور کسی طرح اپنے نفس کی خواہشات کو دبا کر اور کچل کر اس کی خلاف ورزی کرنا، اس کا نام مجاہدہ ہے۔

## نفس کے تقاضوں پر عمل پیرا ہونے والا انسان، جانور بن جاتا ہے:

ہمارا اور آپ کا نفس یعنی ''وہ قوت جو انسان کو کسی کام کرنے کی طرف ابھارتی ہے'' وہ نفس دنیاوی لذتوں کا عادی بنا ہوا ہے، لہٰذا جس کام میں اس کو ظاہری لذت اور مزہ آتا ہے، اس کی طرف یہ دوڑتا ہے، یہ اس کی جبلت اور خصلت ہے کہ اپنے کاموں کی طرف انسان کو مائل کرے، یہ انسان سے کہتا ہے کہ یہ کام کر لو، تو مزہ آ جائے گا، یہ کام کر لو، تو لذت حاصل ہو گی، لہٰذا یہ نفس انسان کے دل میں خواہشات کے تقاضے پیدا کرتا رہتا ہے، اب اگر انسان اپنے نفس کو بے لگام اور بے مہار چھوڑ دے اور جو بھی لذت کے حصول کا تقاضا پیدا ہو، اس پر عمل کرتا جائے اور نفس کی ہر بات مانتا جائے، تو اس کے نتیجے میں پھر وہ انسان انسان نہیں رہتا بلکہ جانور بن جاتا ہے۔

## خواہشات نفسانی کی پیروی میں ہرگز سکون نہیں:

نفسانی خواہشات کا اصول یہ ہے کہ اگر ان کی پیروی کرتے جاؤ گے اور ان کے پیچھے چلتے جاؤ گے، اس کی باتیں مانتے جاؤ گے، تو پھر کسی حد پر جا کر قرار نہیں آئے گا، انسان کا نفس کبھی یہ نہیں کہے گا، کہ اب ساری خواہشات پوری ہو گئیں، اب مجھے کچھ نہیں چاہیے، یہ کبھی زندگی بھر نہیں ہوگا، اس لیے کہ کسی انسان کی ساری خواہشات اس زندگی میں پوری نہیں ہو سکتیں اور اس کے ذریعہ کبھی قرار اور سکون نصیب نہیں ہوگا، یہ قاعدہ کہ اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ میں نفس کے ہر تقاضے پر عمل کرتا جاؤں اور ہر خواہش پوری کرتا جاؤں تو کبھی اس

شخص کو قرار نہیں آئے گا، کیوں؟ اس لیے کہ اس نفس کی خاصیت یہ ہے کہ ایک لطف اٹھانے کے بعد، ایک مرتبہ لذت حاصل کر لینے کے بعد یہ فوراً دوسری لذت کی طرف بڑھتا ہے، لہٰذا اگر چاہتے ہو کہ نفسانی خواہشات کے پیچھے چل کر سکون حاصل کر لیں، تو ساری عمر کبھی سکون نہیں ملے گا، تجربہ کر کے دیکھ لو۔

## ہر خواہش اپنے بعد دوسری خواہش پیدا کرتی ہے:

آج جن کو ترقی یافتہ اقوام کہا جاتا ہے، انہوں نے یہ ہی کہا ہے کہ انسان کی پرائیویٹ زندگی میں کوئی دخل اندازی نہ کرو، جس کی مرضی میں جو کچھ آ رہا ہے، وہ اس کو کرنے دو اور جس شخص کو جس کام میں مزہ آ رہا ہے، وہ اسے کرنے دو، نہ اس کا ہاتھ روکو، نہ اس پر کوئی پابندی لگاؤ اور اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہ کرو، چنانچہ آپ دیکھ لیں کہ آج انسان کو لطف حاصل کرنے اور مزہ حاصل کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں، نہ قانون کی رکاوٹ، نہ مذہب کی رکاوٹ، نہ اخلاق کی رکاوٹ، نہ معاشرے کی رکاوٹ ہے، کوئی پابندی نہیں ہے اور ہر شخص وہ کام کر رہا ہے جو اس کی مرضی میں آ رہا ہے اور اگر اس شخص سے کوئی پوچھے کہ کیا تمہارا مقصد حاصل ہو گیا؟ تم جتنا لطف اس دنیا سے حاصل کرنا چاہتے تھے، کیا لطف کی وہ آخری منزل اور مزے کا وہ آخری درجہ تمہیں حاصل ہو گیا، جس کے بعد تمہیں اور کچھ نہیں چاہیے؟ کوئی شخص بھی اس سوال کا ''ہاں'' میں جواب نہیں دے گا، بلکہ ہر شخص یہی کہے گا کہ مجھے اور مل جائے، مجھے اور مل جائے، آگے بڑھتا چلا جاؤں، اس لیے کہ ایک خواہش دوسری خواہش کو ابھارتی رہتی ہے۔

## قربِ قیامت کا سب سے نیک شخص:

مغربی معاشرے میں ایک مرد اور ایک عورت آپس میں ایک دوسرے سے جنسی لذت حاصل کرنا چاہتے ہیں، تو ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلے جاؤ، کوئی رکاوٹ نہیں، کوئی ہاتھ پکڑنے والا نہیں، حد تو یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ارشاد فرمایا تھا وہ آنکھوں نے دیکھ لیا، آپ نے فرمایا کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ زنا اس قدر عام ہو جائے گا کہ دنیا میں سب سے نیک شخص وہ ہو گا کہ دو آدمی ایک سڑک کے چوراہے

پر بدکاری کا ارتکاب کر رہے ہوں گے، وہ شخص آکر ان سے کہے گا کہ اس درخت کی اوٹ میں کرلو، وہ ان کو اس کام سے منع نہیں کرے گا کہ یہ کام برا ہے، بلکہ وہ یہ کہے گا کہ یہاں سب کے سامنے کرنے کی بجائے اس درخت کی اوٹ میں جا کر کرلو، وہ کہنے والا شخص سب سے نیک آدمی ہوگا، آج وہ زمانہ تقریباً قریب آچکا ہے، آج کھلم کھلا بغیر کسی رکاوٹ اور پردے کے یہ کام ہو رہا ہے۔

## امریکہ میں ''زنا بالجبر'' کی کثرت کیوں؟

لہٰذا اگر کوئی شخص اپنے جنسی جذبات کو تسکین دینے کے لیے حرام طریقہ اختیار کرنا چاہے، تو اس کے دروازے چوپٹ کھلے ہوئے ہیں، لیکن اس کے باوجود زنا بالجبر کے واقعات جتنے امریکہ میں ہوتے ہیں اور کہیں نہیں ہوتے، حالانکہ رضامندی کے ساتھ یہ کام کرنے کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں اور جو آدمی جس طرح چاہے، اپنے جذبات کو تسکین دے سکتا ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ رضامندی کے ساتھ زنا کر کے دیکھ لیا، اس میں جو مزہ تھا وہ حاصل کرلیا، لیکن اس کے بعد اس میں بھی قرار نہ آیا، تو اب باقاعدہ یہ جذبہ پیدا ہوا کہ یہ کام زبردستی کرو، تاکہ زبردستی کرنے کا جو مزہ ہے وہ بھی حاصل ہو جائے، لہٰذا یہ نفسانی خواہشات کسی مرحلے میں جا کر رکتی نہیں ہیں، بلکہ اور آگے بڑھتی چلی جاتی ہیں اور یہ ہوس کبھی ختم ہونے والی نہیں۔

## نفس کو حصول لذت کا مرض استسقاء اور جوع البقر ہے:

آپ نے ایک بیماری کا نام سنا ہوگا جس کو ''جوع البقر'' کہتے ہیں، اس بیماری کی خاصیت یہ ہے کہ انسان کو بھوک لگتی رہتی ہے، جو دل چاہے کھالے، جتنا چاہے کھالے، مگر بھوک نہیں مٹتی۔

اسی طرح ایک اور بیماری ہے جس کو ''استسقاء'' کہا جاتا ہے، اس بیماری میں انسان کو پیاس لگتی رہتی ہے، گھڑے کے گھڑے پی جائے، کنویں بھی ختم کر جائے، مگر پیاس نہیں بجھتی، یہی حال انسان کی خواہشات کا ہے، اگر ان کو قابو نہ کیا جائے اور ان پر کنٹرول نہ کیا جائے اور جب تک ان کو شریعت اور اخلاق کے بندھن میں نہ باندھا جائے، اس وقت تک اس کو ''استسقاء'' کی بیماری کی طرح لطف ولذت کے کسی بھی مرحلے پر جا کر قرار نصیب نہیں

ہوتا، بلکہ لذت کی وہ ہوس بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔

## نفس سے عادات چھڑانے میں کچھ مشقت برداشت کرلو:

اسی لیے اللہ تبارک وتعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نفسانی خواہشات کے پیچھے مت چلو، ان کا اتباع مت کرو، اس لیے کہ یہ تمہیں ہلاکت کے گڑھے میں لے جاکر ڈال دے گی، بلکہ اس کو ذرا قابو میں رکھو اور اس کو کنٹرول کر کے شریعت کی معقول حدود کے اندر رکھو اور اگر تم رکھنا چاہو گے تو شروع شروع میں یہ نفس تمہیں وارننگ دے گا، تکلیف ہوگی، صدمہ ہوگا، دکھ ہوگا، ایک کام کو دل چاہ رہا ہے، مگر اس کو روک رہے ہیں، دل چاہ رہا ہے کہ ٹی وی دیکھیں اور اس میں جو خراب فلمیں آرہی ہیں، وہ دیکھیں، یہ نفس کا تقاضہ ہو رہا ہے، اب جو آدمی اس کا عادی ہے، اس سے کہو کہ اس کو مت دیکھو اور اس نفسانی تقاضہ پر عمل نہ کرو، اگر وہ نہیں دیکھے گا اور آنکھ کو اس سے روکے گا، تو شروع میں اس کو دقت ہوگی اور مشقت ہوگی، برا لگے گا، اس لیے کہ وہ دیکھنے کا عادی ہے، اس کو دیکھے بغیر چین نہیں آتا، لطف نہیں آتا۔

## ہمت کرلو تو نفس کمزور پڑ جائے گا:

لیکن ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے اس نفس کی خاصیت یہ رکھی ہے کہ اگر کوئی شخص اس مشقت اور تکلیف کے باوجود ایک مرتبہ ڈٹ جائے، کہ چاہے مشقت ہو یا تکلیف ہو، چاہے دل پر آرے چل جائیں، تب بھی یہ کام نہیں کروں گا، جس دن یہ شخص نفس کے سامنے ڈٹ گیا، بس اس دن سے یہ نفسانی خواہش خود بخود ڈھیلی پڑنی شروع ہو جائے گی، یہ نفس اور شیطان کمزور کے اوپر شیر ہیں، جو اس کے سامنے بھیگی بلی بنا رہے اور اس کے تقاضوں پر چلتا رہے، اس کے اوپر یہ چھا جاتا ہے اور غالب آجاتا ہے اور جو شخص ایک مرتبہ پختہ ارادہ کر کے اس کے سامنے ڈٹ گیا کہ میں یہ کام نہیں کروں گا، چاہے کتنا تقاضا ہو، چاہے دل پر آرے چل جائیں، پھر یہ نفس ڈھیلا پڑ جاتا ہے اور اس کام کے نہ کرنے پر پہلے دن جتنی تکلیف ہوئی تھی، دوسرے دن اس سے کم ہوگی اور تیسرے دن اس سے کم اور ہوتے ہوتے وہ تکلیف ایک دن بالکل رفع ہو جائے گی اور نفس اس کا عادی بن جائے گا۔

## ترک معصیت میں نفس دودھ پیتے بچے کی مانند ہے:

علامہ بوصیری رحمتہ اللہ علیہ ایک بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں، جن کا ''قصیدہ بردہ شریف'' بہت مشہور ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ایک نعتیہ قصیدہ ہے، اس میں انہوں نے عجیب وغریب حکیمانہ شعر کہا ہے:

اَلنَّفْسُ كَالطِّفْلِ اِنْ تَمْهِلْهُ شَبَّتْ عَلٰی ☆ حُبِّ الرَّضَاعِ وَاِنْ تَفْطِمْهُ يَنْفَطِمُ

یہ انسان کا نفس ایک چھوٹے بچے کی طرح ہے، جو ماں کا دودھ پیتا ہے اور وہ بچہ دودھ پینے کا عادی بن گیا، اب اگر اس سے دودھ چھڑانے کی کوشش کرو، تو وہ بچہ کیا کرے گا؟ روئے گا، چلائے گا، شور کرے گا، اب اگر ماں باپ یہ سوچیں کہ دودھ چھڑانے سے بچے کو بڑی تکلیف ہو رہی ہے، چلو چھوڑو، اسے دودھ پینے دو، دودھ پیتا رہے، تو علامہ بوصیریؒ فرماتے ہیں کہ اگر بچے کو اس طرح دودھ پینے کی حالت میں چھوڑ دیا تو نتیجہ یہ ہوگا وہ جوان ہو جائے گا اور اس سے دودھ نہیں چھوٹ پائے گا، اس لیے کہ تم اس کی تکلیف، اس کی فریاد اور اس کی چیخ و پکار سے ڈر گئے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس سے دودھ نہیں چھڑا سکے۔ اب اگر اس کے سامنے روٹی لاتے ہیں، تو وہ کہتا ہے میں تو نہیں کھاؤں گا، میں تو دودھ ہی پیوں گا، لیکن دنیا میں کوئی ماں باپ ایسے نہیں ہوں گے، جو یہ کہیں کہ چونکہ بچے کو دودھ چھڑانے سے تکلیف ہو رہی ہے، اس لیے دودھ نہیں چھڑاتے، ماں باپ جانتے ہیں کہ دودھ چھڑانے سے روئے گا، چلائے گا، رات کو نیند نہیں آئے گی، خود بھی جاگے گا، ہمیں بھی جگائے گا، لیکن پھر بھی دودھ چھڑاتے ہیں، اس لیے وہ جانتے ہیں کہ بچے کی بھلائی اسی میں ہے، اگر آج اس کو دودھ نہ چھڑایا، تو ساری عمر یہ کبھی روٹی کھانے کے لائق نہیں ہوگا۔

## نفس کی تکلیف پر ڈر گئے تو ساری عمر کا قرار ختم:

علامہ بوصیری رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ انسان کا نفس بھی بچے کی مانند ہے، اس کے منہ کو گناہ لگے ہوئے ہیں، گناہوں کا ذائقہ اور اس کی چاٹ لگی ہوئی ہے، اگر تم نے اس کو ایسے ہی چھوڑ دیا، کہ چلو کرنے دو، گناہ چھڑانے سے تکلیف ہوگی۔ نظر غلط جگہ پر پڑتی ہے اور اس کو ہٹانے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ زبان کو جھوٹ بولنے کی عادت پڑ گئی ہے، اگر

جھوٹ بولنا چھوڑیں گے تو بڑی تکلیف ہوگی۔ اور اس زبان کو مجلسوں کے اندر بیٹھ کر غیبت کرنے کی عادت پڑ گئی ہے، اگر اس کو روکیں گے، تو بڑی دقت ہوگی۔ نفس ان باتوں کا عادی بن گیا ہے، رشوت لینے کی عادت پڑ گئی ہے، اللہ بچائے سود کھانے کی عادت پڑ گئی اور بہت سے گناہوں کی عادت پڑ گئی ہے اور اب ان عادتوں کو چھڑانے سے نفس کو تکلیف ہو رہی ہے، اگر نفس کی اس تکلیف سے گھبرا کر، ڈر کر بیٹھ گئے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ساری عمر نہ کبھی گناہ چھوٹیں گے اور نہ قرار ملے گا۔

## سکون نفس کی پیروی میں نہیں، اللہ کے ذکر میں ہے:

یاد رکھو! کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں قرار اور سکون نہیں ہے، ساری دنیا کے اسباب و وسائل جمع کر لیے، لیکن اس کے باوجود سکون نصیب نہیں، چین نہیں ملتا، میں نے آپ کو ابھی مغربی معاشرے کی مثال دی تھی کہ وہاں پیسے کی ریل پیل، تعلیم کا معیار بلند، لذت حاصل کرنے کے سارے دروازے چوپٹ کھلے ہوئے ہیں، کہ جس طرح چاہو، لذت حاصل کرلو، لیکن اس کے باوجود یہ حال ہے کہ خواب آور گولیاں کھا کھا کر اس کی مدد سے سو رہے ہیں، کیوں دل میں سکون و قرار نہیں؟ سکون کیوں نہیں ملا؟ اس لیے کہ گناہوں میں سکون کہاں؟ تلاش کرتے پھر رہے ہو۔

یاد رکھو! ان گناہوں اور نافرمانیوں اور معصیتوں میں سکون نہیں، سکون تو صرف ایک چیز میں ہے اور وہ ہے:

﴿ آلا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴾ (سورہ الرعد۔ ۲۸)

اللہ کی یاد میں اطمینان اور سکون ہے، اس واسطے یہ سمجھنا دھوکہ ہے، کہ نافرمانیاں کرتے جائیں گے اور سکون ملتا جائے گا۔

یاد رکھو! زندگی بھر نہیں ملے گا، اس دنیا سے تڑپ تڑپ کر جاؤ گے، اگر نافرمانیوں کو نہ چھوڑا، تو سکون کی منزل حاصل نہ ہوگی۔

سکون اللہ تعالیٰ انہی لوگوں کو دیتے ہیں، جن کے دل میں اس کی محبت ہو، جن کے دل میں اس کی یاد ہو، جن کا دل اس کے ذکر سے آباد ہو، ان کے سکون اور اطمینان کو دیکھو کہ ظاہری طور پر پریشان حال بھی ہیں، فقر ہے، فاقے بھی گزر رہے ہیں، لیکن دل کو سکون اور

قرار کی نعمت میسر ہے، لہٰذا اگر دنیا کا بھی سکون حاصل کرنا چاہتے ہو، تو ان نافرمانیوں اور گناہوں کو چھوڑنا پڑے گا اور گناہوں کو چھوڑنے کے لیے ذرا سا مجاہدہ کرنا پڑے گا نفس کے مقابلے میں ذرا سا ڈٹنا پڑے گا۔

## نفس کے خلاف ایک دفعہ قدم بڑھاؤ پھر اللہ کی مدد دیکھو:

اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ بھی فرمالیا کہ

﴿ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ﴾

جو لوگ ہمارے راستے میں یہ مجاہدہ اور محنت کرتے ہیں، کہ ماحول کا، معاشرے کا، نفس کا، شیطان کا اور خواہشات کا تقاضہ چھوڑ کر وہ ہمارے حکم پر چلنا چاہتے ہیں، تو ہم کیا کرتے ہیں؟ لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا حضرت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس کا ترجمہ فرماتے ہیں کہ ''ہم ان کا ہاتھ پکڑ کر لے چلیں گے'' یہ نہیں کہ دور سے دکھا دیا، کہ ''یہ راستہ ہے'' بلکہ فرمایا کہ ہم اس کا ہاتھ پکڑ کر لے جائیں گے، لیکن ذرا کوئی قدم تو بڑھائے، ذرا کوئی ارادہ تو کرے، ذرا کوئی اپنے اس نفس کے مقابلے ایک مرتبہ ڈٹے تو سہی، پھر اللہ تعالیٰ کی مدد آتی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے جو کبھی جھوٹا نہیں ہوسکتا۔

لہٰذا ''مجاہدہ'' اسی کا نام ہے کہ ایک مرتبہ آدمی ڈٹ کر ارادہ کرلے کہ یہ کام نہیں کروں گا، دل پر آرے چل جائیں گے، خواہشات پامال ہوجائیں گی، دل و دماغ پر قیامت گزر جائے گی، لیکن یہ گناہ کا کام نہیں کروں گا، جس دن نفس کے سامنے ڈٹ گیا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس دن سے ہمارا محبوب ہوگیا، اب ہم خود اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے راستے پر لے جائیں گے۔

## اب تو اس دل کو بنانا ہے تیرے قابل مجھے:

اس لیے اصلاح کے راستے میں سب سے پہلا قدم ''مجاہدہ'' ہے، اس کا عزم کرنا ہوگا، ہمارے ڈاکٹر عبدالحئی صاحب قدس سرہ یہ شعر پڑھا کرتے تھے کہ

آرزوئیں خون ہوں یا حسرتیں پامال ہوں
اب تو اس دل کو بنانا ہے تیرے قابل مجھے

جو آرزوئیں دل میں پیدا ہورہی ہیں، وہ چاہے برباد ہو جائیں، چاہے ان کا خون ہو جائے، اب میں نے تو ارادہ کرلیا ہے کہ

اب تو اس کو بتانا ہے تیرے قابل مجھے

اب اس دل میں اللہ جل جلالہ کے انوار کا نزول ہوگا، اب اس دل میں اللہ کی محبت جاگزیں ہوگی، اب یہ گناہ نہیں ہوں گے، پھر دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیسی رحمتیں نازل ہوتی ہیں اور آدمی اس راہ پر چل پڑتا ہے۔

یاد رکھو! کہ شروع شروع میں تو یہ کام کرنے میں بڑی دقت ہوتی ہے، کہ دل تو کچھ چاہ رہا ہے اور اللہ کی خاطر اس کام کو چھوڑنے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے لیکن بعد میں اس تکلیف میں ہی مزہ آنے لگتا ہے اور لطف آنے لگتا ہے، جب یہ خیال آتا ہے کہ میں نفس کو جو کچل رہا ہوں اور آرزوؤں کو جو خون کررہا ہوں یہ اپنے مالک اور خالق کی خاطر کر رہا ہوں اس میں جو مزہ اور کیف ہے، آپ بھی اس کا تصور نہیں کرسکتے۔

## ماں تکلیف کیوں برداشت کرتی ہے؟

ماں کو دیکھئے کہ اس کی کیا حالت ہوتی ہے؟ سخت سردی کا عالم ہے اور کڑکڑاتے جاڑے کی رات ہے، لحاف میں لیٹی ہوئی ہے اور بچہ پاس پڑا ہے، اس حالت میں اس بچے نے پیشاب کردیا، اب نفس کا تقاضا تو یہ ہے کہ یہ گرم گرم بستر چھوڑ کر کہاں جاؤں؟ یہ تو جاڑے کا موسم ہے، گرم گرم بستر چھوڑ کر جانا تو بڑا مشکل کام ہے، لیکن ماں یہ سوچتی ہے کہ اگر میں نہ گئی تو بچہ گیلا پڑا رہے گا، اس کے کپڑے گیلے ہیں، اس طرح پڑا رہے گا تو کہیں اس کو بخار نہ ہو جائے، اس کی طبیعت خراب نہ ہو جائے، وہ بے چاری اپنے نفس کا تقاضہ چھوڑ کر سخت کڑاکے کے جاڑے میں باہر جاکر ٹھنڈے پانی سے اس کے کپڑے دھو رہی ہے، اس کے کپڑے بدل رہی ہے، یہ کوئی معمولی مشقت ہے؟ معمولی تکلیف ہے؟ لیکن ماں یہ تکلیف برداشت کررہی ہے، کیوں؟ اس لیے کہ اپنے بچے کی فلاح اور اس کی صحت ماں کے پیش نظر ہے. اس لیے وہ اس سخت جاڑے میں اپنے نفس کے تقاضے کو پامال کرکے یہ سارے کام کررہی ہے۔

## اولاد کی محبت کی وجہ سے مشکلات، مشکلات ہی نہیں؟

ایک عورت کا کوئی بچہ نہیں ہے، کوئی اولاد نہیں، وہ کہتی ہے بھائی کسی طرح میرا علاج کراؤ، تاکہ بچہ ہو جائے، اولاد ہو جائے اور اس کے لیے دعائیں کراتی پھرتی ہے، کہ دعا کرو اللہ میاں سے مجھے اولاد دیدے اور اس کے لیے تعویذ گنڈے اور اللہ جانے کیا کیا کراتی پھر رہی ہے؟

ایک دوسری عورت اس سے کہتی ہے کہ ارے تو کس چکر میں پڑی ہے؟ بچہ پیدا ہوتا تو تجھے بہت سی مشقتیں برداشت اٹھانی پڑیں گی، جاڑے کی راتوں کو اٹھ کر ٹھنڈے پانی سے کپڑے دھونے ہوں گے، تو وہ عورت جواب دیتی ہے کہ میرے ایک بچے پر ہزاروں جاڑوں کی راتیں قربان ہیں، اس لیے کہ اس بچے کی قدر و قیمت اور اس کے دولت ہونے کا احساس اس کے دل میں ہے، اس واسطے اس ماں کے لیے ساری تکلیفیں راحت بن گئیں، وہ ماں جو اللہ سے مانگ رہی ہے، کہ یا اللہ مجھے اولاد دیدے، اس کے معنی یہ ہیں کہ اولاد کی جتنی ذمہ داریاں ہیں، جتنی تکلیفیں ہیں، وہ دیدے، لیکن وہ تکلیفیں اس کی نظر میں تکلیفیں ہی نہیں، بلکہ وہ راحت ہیں، اب جو ماں جاڑے کی رات میں اٹھ کر کپڑے دھو رہی ہے، اس کو طبعی طور پر تکلیف تو ضرور ہو رہی ہے، لیکن عقلی طور پر اسے اطمینان ہے میں یہ کام اپنے بچے کی بھلائی کی خاطر کر رہی ہوں، جب یہ اطمینان ہوتا ہے تو اس وقت اسے اپنی آرزوؤں کو کچلنے میں بھی لطف آنے لگتا ہے۔

اسی بات کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ اس طرح فرماتے ہیں:

از محبت تلخہا شریں شود

کہ جب محبت پیدا ہو جاتی ہے، تو کڑوی سے کڑوی چیزیں بھی میٹھی معلوم ہونے لگتی ہیں، جن کاموں میں تکلیف ہو رہی تھی، محبت کی خاطر ان میں بھی مزہ آنے لگتا ہے، لطف آنے لگتا ہے، کہ میں یہ کام محبت کی وجہ سے کر رہا ہوں، محبت کی خاطر کر رہا ہوں۔

## عشق خدا محبت لیلیٰ سے کم نہ ہونا چاہئے:

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے مثنوی میں محبت کی بڑی عجیب حکایتیں لکھی ہیں، لیلیٰ مجنون کا

قصہ لکھا ہے کہ مجنون لیلیٰ کی خاطر کس طرح دیوانہ بنا اور کیا کیا مشقتیں اٹھائیں۔ دودھ کی نہر نکالنے کے ارادہ سے چل کھڑا ہوا اور کام شروع بھی کر دیا، یہ ساری مشقتیں اٹھا رہا ہے، کوئی اس سے کہے کہ تو یہ جو کام کر رہا ہے وہ بڑی مشقت کا کام ہے، اسے چھوڑ دے، تو وہ کہتا ہے کہ ہزار مشقتیں قربان جس کی خاطر یہ کام کر رہا ہوں، اس کی محبت میں کر رہا ہوں، مجھے تو اسی نہر کھودنے میں مزہ آ رہا ہے، اس لیے کہ میں اپنی محبوبہ کی خاطر کر رہا ہوں۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود
گوئے گشتن بہر او اولیٰ بود

مولیٰ کا عشق حقیقی کب لیلیٰ کے عشق سے کم ہو سکتا ہے؟ مولیٰ کے لئے گیند بن جانا زیادہ اولی ہے، لہٰذا جب آدمی محبت کی خاطر یہ تکلیفیں اٹھاتا ہے، تو پھر بڑا لطف آنے لگتا ہے۔

## تنخواہ سے محبت ہے تو سب تکلیفیں برداشت ہیں:

ایک آدمی ملازمت کرتا ہے، جس کے لیے صبح سویرے اٹھنا پڑتا ہے، اچھی خاصی سردی میں بستر پر لیٹا ہوا ہے اور جانے کا وقت آ گیا، تو بستر چھوڑ کر جا رہا ہے، نفس کا تقاضا تو یہ تھا کہ گرم گرم بستر میں پڑا رہتا، لیکن گھر چھوڑ کر، بیوی بچوں کو چھوڑ کر جا رہا ہے اور سارا دن محنت کی چکی میں پسنے کے بعد رات کو کسی وقت گھر واپس آتا ہے اور بے شمار لوگ ایسے بھی ہیں جو صبح اپنے بچوں کو سوتا ہوا چھوڑ کر جاتے ہیں اور رات کو واپس آ کر سوتا ہوا پاتے ہیں، غرض وہ شخص یہ سب تکلیفیں برداشت کر رہا ہے، اب اگر کوئی شخص اس سے کہے کہ ارے بھائی تم ملازمت میں بہت تکلیف اٹھا رہے ہو، چلو میں تمہاری ملازمت چھڑا دیتا ہوں؟ وہ جواب دے گا، نہیں بھائی، نہیں، بڑی مشکل سے تو یہ ملازمت لگی ہے، اس کو مت چھڑانا، اس کو صبح سویرے اٹھ کر جانے میں ہی مزہ آ رہا ہے اور اولاد کو، بیوی کو چھوڑ کر جانے میں بھی مزہ آ رہا ہے، کیوں؟ اس لیے کہ اس کو اس تنخواہ سے محبت ہو گئی ہے، جو مہینے کے بعد ملنے والی ہے، اس محبت کے نتیجے میں یہ ساری تکلیفیں شیریں بن گئیں، اب اگر کسی وقت ملازمت چھوٹ گئی تو روتا پھر رہا ہے کہ ہائے وہ دن کہاں گئے، جب صبح کو سویرے اٹھ کر جایا کرتا تھا اور لوگوں سے سفارشیں کراتا پھر رہا ہے کہ مجھے ملازمت پر دوبارہ بحال کر دیا جائے، اگر محبت کسی چیز

سے ہو جائے، تو اس راستے کی ساری تکلیفیں آسان اور مزے دار ہو جاتی ہیں، اسی سے لطف آنے لگتا ہے۔

اسی طرح گناہوں کو چھوڑنے میں تکلیف ضرور ہے، شروع میں مشقت ہوگی، لیکن جب ایک مرتبہ ڈٹ گئے اور اس کے مطابق عمل شروع کر دیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد بھی ہوگی اور پھر انشاء اللہ اس تکلیف میں مزہ آنے لگے گا، اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مزہ آنے لگے گا۔

## نفس کوئی لذت چاہتا ہے، اسکو عبادت کی لذت سے آشنا کر دو:

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی قدس اللہ سرہ نے ایک مرتبہ بڑی عجیب وغریب بات ارشاد فرمائی کہ انسان کے اس نفس کو لذت اور مزہ چاہیے، اس کی خوراک لذت اور مزہ ہے، لیکن لذت اور مزے کی خاص شکل اس کو مطلوب نہیں، کہ فلاں قسم کا مزہ چاہیے اور فلاں قسم کا نہیں چاہیے، بس اس کو تو مزہ چاہیے، اب تم نے اس کو خراب قسم کے مزے کا عادی بنا دیا ہے، خراب قسم کی لذتوں کا عادی بنا دیا ہے، ایک مرتبہ اس کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادت کی لذت سے آشنا کر دو اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق زندگی گزارنے کی لذت سے آشنا کر دو، پھر یہ نفس اسی میں لذت اور مزہ لینے لگے گا۔

## نفس کو دن رات کوئی بے خودی چاہیے:

غالب کا ایک مشہور شعر ہے، اللہ جانے لوگ اس کا کیا مطلب لیتے ہوں گے، لیکن ہمارے حضرت نے اس کا بڑا اچھا مطلب نکالا ہے، وہ شعر ہے

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے

شراب سے مجھ کو کوئی تعلق نہیں، مجھے تو دن رات لذت کی بے خودی چاہیے، تم نے مجھے شراب کا عادی بنا دیا تو مجھے شراب میں بے خودی حاصل ہوگئی، شراب میں لذت آنے لگی اگر تم مجھے اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کے ذکر اور اس کی اطاعت کا عادی بنا دیتے تو یہ بے خودی مجھے اللہ کے ذکر میں حاصل ہو جاتی، میں تو اسی میں خوش ہو جاتا، لیکن یہ تمہاری غلطی ہے کہ تم نے مجھے ان چیزوں کے بجائے شراب کا عادی بنا دیا۔

## نفس کو کچلنے میں ہی مزہ آنے لگے گا:

اسی طرح یہ مجاہدہ شروع میں تو بڑا مشکل لگتا ہے، کہ بڑا کٹھن سبق دیا جاتا ہے، کہ اپنے نفس کی مخالفت کرو، اپنے نفس کے خواہشات کی خلاف ورزی کرو، نفس تو چاہ رہا ہے کہ غیبت کروں، مجلس میں غیبت کرنے کا موضوع چڑھ گیا، اب جی چاہ رہا ہے کہ اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لوں، اب اس وقت اس کو لگام دینا کہ نہیں یہ کام مت کرو، یہ بڑا مشکل کام لگتا ہے، لیکن یاد رکھئے کہ دور دور سے یہ مشکل نظر آتا ہے، جب آدمی نے پختہ ارادہ کرلیا کہ یہ کام نہیں کروں گا، تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اور فضل وکرم سے بھی مدد بھی ہوگی اور پھر تم نے اس لذت، آرزو اور خواہش کو جو کچلا ہے، اس کچلنے میں جو مزہ آئے گا انشاء اللہ ثم انشاء اللہ اس کی حلاوت اس غیبت کی لذت سے کہیں زیادہ ہوگی۔

## گناہ چھوڑ کر ایمان کی حلاوت حاصل کرو:

حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک شخص کے دل میں تقاضا پیدا ہوا کہ نگاہ غلط جگہ پر ڈالوں اور کون شخص ہے جس کے دل میں یہ تقاضا نہیں ہوتا، اب دل بڑا کسمسا رہا ہے کہ اس کو دیکھ ہی لوں، لیکن آپ نے اللہ تعالیٰ کے ڈر اور خشیت کے خیال سے نظر کو بچالیا اور نگاہ نہیں ڈالی، بڑی تکلیف ہوئی، دل پر آرے چل گئے، لیکن اسی تکلیف کے بدلے اللہ تعالیٰ ایمان کی ایسی حلاوت عطا فرمائیں گے، کہ اس سے آگے دیکھنے کی لذت ہیچ ہے، یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وعدہ ہے اور حدیث میں موجود ہے۔

(مسند احمد: ۵/۲۶۴)

یہ وعدہ صرف نگاہ کے گناہ کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ ہر گناہ کے چھوڑنے پر یہ وعدہ ہے، مثلاً غیبت میں بڑا مزہ آرہا ہے، لیکن ایک مرتبہ آپ نے اللہ جل جلالہ کے خیال سے غیبت چھوڑ دی اور غیبت کرتے کرتے رک گئے، اللہ کے ڈر کے خیال سے غیبت کا خیال زبان پر آتے آتے رک گیا، پھر دیکھو کیسی لذت حاصل ہوتی ہے اور جب انسان گناہوں کی لذتوں کے مقابلے میں اس لذت کا عادی ہوتا چلا جاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کے ساتھ تعلق پیدا ہوجاتا ہے۔

## حضرت تھانویؒ کی نظر میں تصوف کا حاصل وخلاصہ:

حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ نے کیا اچھی بات ارشاد فرمائی، یاد رکھنے کے لائق ہے، فرمایا: ''ذراسی بات جو حاصل ہے تصوف کا، یہ ہے کہ جب دل میں کسی اطاعت کرنے میں سستی پیدا ہو، مثلاً نماز کا وقت ہوگیا، لیکن نماز کو جانے میں سستی ہوری ہے، اس سستی کا مقابلہ کر کے اس کی اطاعت کو کرے اور جب گناہ سے بچنے میں دل سستی کرے، تو اس سستی کا مقابلہ کر کے اس گناہ سے بچے، پھر فرمایا کہ بس اسی سے تعلق مع اللہ پیدا ہوتا ہے، اسی سے تعلق مع اللہ میں ترقی ہوتی ہے اور جس شخص کو یہ بات حاصل ہو جائے، اس کو پھر کسی چیز کی ضرورت نہیں، لہذا نفسانی خواہشات پر آرے چلا چلا کر اور ہتھوڑے مار مار کر جب اس کو کچل دیا، تو اب یہ نفس کچلنے کے نتیجے میں اللہ جل جلالہ کی تجلی گاہ بن گیا۔

## دل کو جتنا توڑو گے اتنا ہی اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں محبوب بنے گا:

ہمارے والد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ ایک مثال دیا کرتے تھے، اب تو وہ زمانہ چلا گیا، پہلے زمانے میں یونانی حکیم ہوا کرتے تھے، وہ کشتہ بنایا کرتے تھے، سونے کا کشتہ، چاندی کا کشتہ، سنکھیا کا کشتہ اور نہ جانے کیا کیا کشتے تیار کرتے تھے اور کشتہ بنانے کے لیے وہ سونے کو جلاتے تھے اور اتنا جلاتے تھے کہ وہ سونا راکھ بن جاتا تھا اور کہتے تھے کہ سونے کو جتنا زیادہ جلایا جائے، اتنا ہی اس کی طاقت میں اضافہ ہوگا، اب جلا جلا کر جب کشتہ تیار کیا، تو وہ کشتہ طلا تیار ہوگیا، کوئی اس کو ذرا سا کھالے تو پتہ نہیں کہاں کی قوت آجائے گی، تو جب سونے کو جلا جلا کر، مٹا مٹا کر، پامال کر کے راکھ بنا دیا، تو اب یہ کشتہ تیار ہوگیا، ہمارے حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ ان خواہشات نفس کو جب کچلو گے اور کچل کچل کر، پیس پیس کر راکھ بنا کر دفنا دوں گے، تب یہ کشتہ بن جائے گا، اس میں اللہ جل شانہ کے ساتھ تعلق کی قوت آجائے گی اور اللہ تبارک وتعالی کی محبت آجائے گی، اب دل اللہ تعالیٰ کی تجلی گاہ بن جائے گا، اس دل کو جتنا توڑو گے اتنا ہی اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں محبوب بنے گا:

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے کہ یہ آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

تم اس پر جتنی چوٹیں لگاؤ گے، اتنا ہی یہ بنانے والے کی نگاہ میں محبوب ہوگا، بنانے والے نے اس کو اسی لیے بنایا ہے کہ اسے توڑا جائے، اس کی خاطر اس کی خواہشات کو کچلا جائے اور جب وہ کچل جاتا ہے، تو کیا سے کیا بن جاتا ہے؟ ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب قدس سرہ کیا اچھا شعر پڑھا کرتے تھے کہ

یہ کہہ کے کاسہ ساز نے پیالہ ٹپک دیا
اب اور کچھ بنائیں گے اس کو بگاڑ کے

اور کچھ بنائیں گے یعنی جو وہ چاہیں گے، وہ بنائیں گے، لہذا یہ نہ سمجھو کہ خواہشات نفس کو کچلنے سے جو چوٹیں لگ رہی ہیں اور جو تکلیف ہو رہی ہے، بے کار جا رہی ہیں، بلکہ اس کے بعد جب یہ دل اللہ تعالیٰ کی محبت کا محل بنے گا اور اللہ تعالی کے ذکر اور اس کی یاد کا محل بنے گا، اس وقت اس کو جو حلاوت نصیب ہوگی، اللہ کی قسم اس کے مقابلے میں گناہوں کی یہ ساری لذتیں خاک در خاک ہیں، ان کی کوئی حقیقت نہیں، اللہ تعالیٰ یہ دولت ہم سب کو نصیب فرمائیں۔ بس شروع میں تھوڑی سی محنت اور مشقت اٹھانی پڑے گی اور اسی کا نام مجاہدہ ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بات کو حدیث شریف میں اسی طرح بیان فرمایا کہ:

اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ

مجاہد درحقیقت وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے، اپنے نفس کی خواہشات کو اللہ کی خاطر کچلے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔
اپنے نفس کی خواہشات کے ہاتھوں میں کھلونہ بننے سے بچائے۔
اوران خواہشات نفس کو قابو میں کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین

واخر دعوانا ان الحمدالله رب العالمین.

(ماخذہ: اصلاحی خطبات: جلد دوم)

باب اول کا تیسرا بیان:

# اصلاح نفس کی ضرورت واہمیت اور اس کا طریقہ کار

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ وَعَلٰی آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْدُ

## تمہید:

کئی سال سے رمضان المبارک میں حکیم الامت مجدد ملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات سنانے کا معمول ہے۔ سنانے سے مقصود یہ ہے کہ ہمارے اندر اپنی اصلاح کی فکر پیدا ہو، رمضان المبارلک کا مہینہ خصوصی طور پر اصلاح نفس اور تہذیب اخلاق کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نعمت ہے۔ اگر انسان اس ماہ کی قدر کرے اور اس ماہ میں اپنی اصلاح کی فکر اور اس کا اہتمام کرے تو وہ جلد منزل کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ اسی لیے کئی سالوں سے رمضان المبارک میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے (تہذیب اخلاق سے متعلق) ارشادات سنانے کا یہ سلسلہ شروع کیا ہوا ہے۔

## کتاب انفاس عیسیٰ اور اس کے مرتب کا تعارف:

جو کتاب اس وقت میرے سامنے ہے اس کا نام ''انفاس عیسیٰ'' ہے۔ یہ کتاب حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اصلاحی ملفوظات، آپ کی تربیتی ہدایات اور نفسانی امراض کے علاج کے لیے مفید اور مجرب نسخوں کا خلاصہ ہے، جس کو حضرت والا کے خاص خلیفہ مجاز حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مرتب کیا ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء کی بڑی تعداد ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنی بساط اور صلاحیت کے مطابق

حضرت والا سے کسب فیض کیا۔ اوران میں سے ہر ایک ہمارے لیے آفتاب اور مہتاب کا درجہ رکھتا ہے، لیکن ہر خلیفہ میں کچھ خصوصیات ایسی ہیں جو اس کو دوسرے سے ممتاز کرتی ہیں حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب رحمتہ اللہ علیہ حضرت والا کے ابتدائی دور کے خلفاء میں سے ہیں ان کے بارے میں یہ بات معروف اور مشہور ہے کہ حضرت والا کے ساتھ مشابہت میں ان کی کوئی نظیر نہیں تھی، ظاہری شکل وصورت، لباس، پوشاک، چال، ڈھال، رفتار وگفتار ہر چیز میں حضرت والا کے ساتھ بہت زیادہ مشابہت تھی، یہاں تک کہ آواز میں بھی مشابہت تھی، چنانچہ جب آپ قرآن کریم کی تلاوت کرتے تو باہر سے سننے والے کو دھوکہ ہو جاتا کہ حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ تلاوت کر رہے ہیں یا حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب تلاوت کر رہے ہیں۔ اتنی زیادہ مشابہت تھی اور جب ظاہری مشابہت اتنی زیادہ تھی تو اندر اور باطن میں حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ سے کیا کیا کسب فیض کیا ہوگا اس کا اندازہ ہم اور آپ کر ہی نہیں سکتے۔

جب کسی کو اپنے شیخ کے ساتھ شدید محبت ہو، مناسبت کامل ہو اور پھر طویل صحبت اور رفاقت رہی ہو اور اکتساب فیض رسوخ کے ساتھ کیا ہو تو بسا اوقات ظاہری انداز و عادات میں بھی مشابہت پیدا ہو جاتی ہے۔



## صحابہ کرام کے حالات سے مناسبت شیخ کے اثر کی مثال:

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے زمانہ میں بھی اس کی مثال ملتی ہے، چنانچہ روایات میں آتا ہے:

كَانَ اَشْبَهَ النَّاسِ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ دَلًّا وَسَمْتًا وَهَدْيًا

کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اپنے انداز و ادا میں اٹھنے بیٹھنے میں چال ڈھال میں لباس پوشاک میں جتنی مشابہت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھی اتنی مشابہت کسی اور کو حاصل نہیں تھی چنانچہ لوگ ان کو دیکھ کر اپنی آنکھیں اس طرح ٹھنڈی کیا کرتے تھے جس طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت سے ٹھنڈی کیا کرتے تھے

حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ تو بہرحال ایک الگ حیثیت رکھتا ہے، تاہم اس سے ملتی جلتی کیفیت کے نمونے امت میں پائے گئے ہیں

،اسی طرح ایک نمونہ حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب اوران کے شیخ علیہ الرحمتہ کا بھی ہے۔جس شخص میں ظاہری طور پر بھی ایسی مشابہت ہو جائے اس کے بارے میں یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ یہ اپنے شیخ کے مزاج و مذاق اوران کے علوم و فیوض کو جذب کئے ہوئے ہے اور پوری طرح ہضم کئے ہوئے ہے۔

## حضرت تھانوی کے ملفوظات میں ''انفاس عیسیٰ'' کی خصوصیت:

بہر حال حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت اور خدمت میں رہنے کے دوران حضرت والا سے جو باتیں سنیں اور تعلیمات حاصل کیں ان کا خلاصہ ہمارے لیے اس کتاب ''انفاس عیسیٰ'' میں جمع کردیا ہے۔ یہ کتاب حضرت کے دیگر عام ملفوظات کے مجموعوں کی طرح ملفوظات کی کتاب نہیں ہے چنانچہ عام ملفوظات اور مجالس کی کتابوں میں یہ نظر آئے گا کہ حضرت والا نے کسی موضوع سے متعلق ایک بات ارشاد فرمائی پھر تھوڑی دیر کے بعد دوسرے کسی اور موضوع سے متعلق دوسری بات ارشاد فرمائی اور پھر تیسری بات تیسرے موضوع سے متعلق ارشاد فرمائی اوران باتوں کو لوگوں نے جمع کرنا شروع کردیا۔لیکن اس کتاب میں حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے ایسا نہیں کیا بلکہ حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت میں رہنے کے دوران تصوف اور طریقت سے متعلق جو کچھ سنا اور جو تعلیم حاصل کی پہلے اس کو ہضم کیا پھر اس کی تلخیص اس طرح لکھی کہ اس میں اکثر الفاظ بھی حضرت والا ہی کے ہیں۔اس طرح ان تعلیمات کا نچوڑ اور خلاصہ ہمارے لیے اس کتاب کے اندر جمع کردیا ہے لہذا یہ کتاب ''انفاس عیسیٰ'' ہمارے لیے بڑی عجیب وغریب نعمت ہے۔

## تصوف کے مقصود اصلی میں لوگوں کی غلط فہمیاں:

تصوف ،طریقت ،سلوک ،احسان ایک ہی مفہوم کے مختلف عنوانات ہیں،اس تصوف کا اصل مقصود نہ تو محض ذکر ہے، چنانچہ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ تصوف کا مقصود ذکر ہی ہے، جب ہم کسی شیخ سے بیعت ہو جائیں گے تو وہ ہمیں وظائف بتائے گا اور بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تصوف کا مقصد عملیات اور روحانی علاج ہے کہ شیخ ہمیں کچھ عملیات اور تعویذ گنڈے اور

روحانی علاج کا طریقہ بتائے گا۔ خوب سمجھ لیں کہ تصوف کا ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں۔ حتی کہ "ذکر" بھی تصوف کا مقصود اصلی نہیں بلکہ مقصود اصلی کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔ اسی طرح بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تصوف کا مقصد یہ ہے کہ آدمی کہیں تنہائی میں بیٹھ کر مراقبہ کرے اور چلہ کاٹے، مجاہدے کرے حالانکہ یہ سب چیزیں بھی "تصوف" کا مقصود اصلی نہیں ہیں، بلکہ مقصود اصلی کو حاصل کرنے کے مختلف طریقے اور راستے ہیں۔

## تصوف کا مقصودِ اصلی:

پھر تصوف کا مقصود اصلی کیا ہے؟ تصوف کا مقصود اصلی وہ ہے جس کی طرف قرآن کریم نے اس آیت میں ارشاد فرمایا: ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا﴾ (سورۃ الشمس)

یعنی تزکیہ نفس، جس کو اللہ تعالیٰ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ﴾ (سورۃ بقرہ)

اس آیت میں تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت کو مقاصد بعثت میں سے بیان فرمایا پھر تزکیہ کو علیحدہ کر کے بیان فرمایا۔

## تزکیہ کا لغوی و اصطلاحی معنی:

تزکیہ کے لفظی معنی ہیں "پاک صاف کرنا"۔ شریعت کی اصطلاح میں تزکیہ سے مراد یہ ہے کہ جس طرح انسان کے ظاہری اعمال و افعال ہوتے ہیں اور ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی ہیں مثلاً یہ کہ نماز پڑھو، روزہ رکھو، زکوۃ دو، حج کرو وغیرہ یہ اوامر ہیں اور جھوٹ نہ بولو، غیبت نہ کرو، شراب نہ پیو، چوری نہ کرو، ڈاکہ نہ ڈالو وغیرہ یہ نواہی اور گناہ ہیں، ان سے بچنے کا شریعت نے حکم دیا ہے۔ اسی طرح انسان کے باطن یعنی قلب میں بعض صفتیں مطلوب ہیں، وہ اوامر میں داخل ہیں، ان کو حاصل کرنا واجب ہے اور ان کو حاصل کئے بغیر فریضہ ادا نہیں ہوتا اور بعض صفات ایسی ہیں جن کو چھوڑنا واجب ہے وہ نواہی میں داخل ہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ کی نعمت پر شکر کرنا واجب ہے، اگر کوئی ناگوار واقعہ پیش آئے، تو اس پر صبر کرنا واجب ہے، اللہ تعالیٰ پر توکل اور بھروسہ رکھنا واجب ہے۔ "تواضع" اختیار کرنا

یعنی اپنے آپ کو کمتر سمجھنا واجب ہے، ''اخلاص'' حاصل کرنا یعنی جو کام بھی آدمی کرے، وہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے کرے، اس اخلاص کی تحصیل واجب ہے، اخلاص کے بغیر کوئی عمل مقبول نہیں، لہذا یہ صفات ''شکر، صبر، توکل، تواضع، اخلاص وغیرہ یہ سب صفات ''فضائل'' اور ''اخلاق فاضلہ'' کہلاتی ہیں۔ ان کی تحصیل واجب ہے۔

اسی طرح باطن کے اندر بعض بری صفات ہیں، جو حرام اور ناجائز ہیں، جس سے بچنا ضروری ہے، وہ ''رزائل'' اور ''اخلاق رزیلہ'' کہلاتی ہیں۔ یعنی یہ صفات کمینی اور گھٹیا صفات ہیں، اگر یہ صفات باطن کے اندر موجود ہوں، تو ان کو کچلا اور مٹایا جاتا ہے، تاکہ یہ صفات انسان کو گناہ پر آمادہ نہ کریں، مثلاً تکبر کرنا، اپنے آپ کو بڑا سمجھنا، حسد کرنا، ریاکاری اور دکھاوا یعنی انسان اللہ کو راضی کرنے کے بجائے مخلوق کو راضی کرنے کے لیے اور ان کو دکھانے کے لیے کوئی دینی کام کرے یہ ریا ہے، لہذا تکبر حرام، حسد حرام، بغض حرام، ریاکاری حرام اور بے صبری یعنی اللہ تعالیٰ کی قضا پر راضی نہ ہونا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کا شکوہ کرنا یہ حرام ہے، یہ سب رزائل ہیں، جو انسان کے باطن میں موجود ہوتے ہیں۔ اسی طرح غصہ کو اگر انسان بے محل استعمال کرے، تو یہ بھی رزائل میں داخل ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ باطن میں بہت سے ''فضائل'' ہیں، جن کو حاصل کرنا ضروری ہے اور بہت سے ''رزائل'' ہیں، جن سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔ اور حضرات صوفیاء اور مشائخ یہ کام کرتے ہیں کہ اپنے مریدین اور شاگردوں کے دلوں میں اخلاق فاضلہ کی آبیاری کرتے ہیں اور اخلاق رزیلہ کو کچلتے ہیں، تاکہ یہ اخلاق رزیلہ کچلتے کچلتے نہ ہونے کے حکم میں ہو جائیں۔ جس کے لیے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ اصطلاح بیان فرمائی کہ ''امالہ بدرجہ ازالہ'' یعنی باطن کے اندر جو رزیلہ ہے، اس کو اتنا کچلو اور اس کو اتنا پیٹو کہ اس کے بعد وہ رزیلہ باقی نہ رہے گا، ختم تو نہیں ہوگا، لیکن نہ ہونے کے حکم میں ہو جائے گا، بہر حال تصوف میں رزائل کو کچلنا ہوتا ہے اور فضائل کو حاصل کرنا ہوتا ہے، اسی کا نام تزکیہ ہے اور بس یہی تصوف کا مقصود اصلی ہے۔

## مقصودِ تصوف کے حصول کیلئے شیخ کی ضرورت:

لیکن عام طور پر یہ چیز کسی شیخ کی صحبت کے بغیر اور شیخ کے سامنے اپنے آپ کو فنا کئے بغیر

حاصل نہیں ہوتی۔ کیوں؟ اس لیے کہ ''لکل فن رجال'' یعنی ہر فن کو حاصل کرنے کے لیے اس کے ماہر کے پاس جانا ضروری ہے، اگر فقہ کا مسئلہ معلوم کرنا ہو تو کسی مفتی کے پاس چلے جاؤ کیونکہ اس کو یہ فن آتا ہے وہ جانتا ہے کہ کس سوال کا کیا جواب دینا چاہیے۔ لیکن اعمال باطنہ کے بارے میں مہارت حاصل کرنا اور یہ پہچاننا کہ آیا اس شخص کے اندر یہ بیماری پیدا ہو رہی ہے یا نہیں؟ کیونکہ باطن کی بیماریاں بھی مخفی اور باریک قسم کی ہوتی ہیں، ایک چیز بڑی اچھی ہے اور دوسری چیز بڑی خراب ہے لیکن دونوں کے درمیان فرق کرنا بڑا مشکل ہے۔ مثلاً تکبر کرنا حرام ہے اور اس سے بچنا واجب ہے، اس لیے کہ یہ تکبر اُم الامراض ہے۔ لیکن دوسری صفت ''عزت نفس'' ہے اس کو حاصل کرنا واجب ہے۔ کیونکہ اپنے نفس کو ذلیل کرنا جائز نہیں لیکن یہ دیکھنا کہ کہاں ''تکبر'' ہے اور کہاں ''عزت نفس'' ہے جو کام میں کر رہا ہوں یہ ''تکبر'' کی وجہ سے کر رہا ہوں یا یہ ''عزت نفس'' کی وجہ سے کر رہا ہوں، دونوں کے درمیان کون خطِ امتیاز کھینچے؟ اور دونوں کو کون پہچانے کہ یہ تکبر ہے اور یہ ''عزت نفس'' ہے؟ یہ ہر ایک کے بس کا روگ نہیں، خاص طور پر انسان کا خود اپنے اندر ان بیماریوں کا پہچاننا بڑا مشکل ہے۔

مثلاً ایک بیماری ہے ''اپنی بڑائی بیان کرنا'' کہ میں ایسا اور ویسا ہوں، میرے اندر یہ اچھائی ہے، میرے اندر یہ خوبی ہے، یہ حرام ہے اسی کو ''تعلّی'' کہا جاتا ہے۔ دوسری چیز ہے ''تحدیث نعمت''، جس کا قرآن کریم کے اندر ذکر ہے:

﴿ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ﴾ (سورۃ الضحیٰ)

اب کون اس کے درمیان فرق کرے کہ میں جو اپنی اچھائی بیان کر رہا ہوں یہ ''تعلّی'' ہے یا ''تحدیث نعمت'' ہے؟

## تعلّی اور تحدیثِ نعمت پر حضرت تھانویؒ کا ایک واقعہ:

اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنی ہوئی ایک بات یاد آ گئی، فرمایا کہ ایک مرتبہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ دھلی میں مسجد کے منبر پر بیٹھ کر وعظ فرما رہے تھے، بہت بڑا مجمع سامنے بیٹھا ہوا تھا، وعظ فرماتے فرماتے کہنے لگے کہ آج میں ایک بات آپ لوگوں سے بیان کرتا ہوں، یہ بات مجھ ہی سے سنیں گے

اور کسی سے سننے میں نہیں آئے گی اور میں یہ بات ''تحدیث نعمت'' کے طور پر کہہ رہا ہوں کہ یہ علم اللہ تعالیٰ نے مجھے ہی القاء فرمایا ہے۔ یہ بات کہنے کے بعد ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگئے پھر فرمایا کہ استغفر اللہ استغفر اللہ استغفر اللہ استغفر اللہ میں نے یہ کیا جملہ کہہ دیا کہ یہ بات آپ مجھ ہی سے سن سکیں گے اور کہیں سننے میں نہیں آئے گی یہ تو دعویٰ اور ''تعلّی'' ہے اور میں نے اپنی بڑائی بیان کی ہے اور اس کو میں نے ''تحدیث نعمت'' کا نام دے دیا لہٰذا میں اس پر استغفار کرتا ہوں استغفر اللہ استغفر اللہ اول تو میں نے اپنی بڑائی بیان کی اور پھر اس بڑائی کو ''تحدیث نعمت'' کے پردے میں چھپانے کی کوشش کی اور قاعدہ ہے کہ

''تَوْبَةُ السِّرِّ بِالسِّرِّ وَالْعَلَانِيَةِ بِالْعَلَانِيَةِ''

کیونکہ یہ گناہ میں نے اعلانیہ کیا تھا اس لیے توبہ بھی اعلانیہ کرتا ہوں کہ یہ مجھ سے غلطی ہوئی اس غلطی پر استغفار کرتا ہوں۔ استغفر اللہ استغفر اللہ۔ عین وعظ کے دوران یہ کام کیا اس طرح کوئی دوسرا کر کے دکھائے یہ کام وہی شخص کر سکتا ہے جو اپنے آپ کو مٹا چکا ہو، اپنے کو فنا کر چکا ہو اور پھر نفس کی باریک چالوں سے باخبر ہو اور اپنے نفس کا نگران رہتا ہو اس کا احتساب ہمہ وقت کرتا رہتا ہو۔ اب آپ دیکھیں کہ جو بات میں بیان کر رہا ہوں یہ ''تعلّی'' کے طور پر بیان کر رہا ہوں یا ''تحدیث نعمت'' کے طور پر بیان کر رہا ہوں ان کے درمیان فرق کرنا بڑا مشکل ہے اور اس کو پہچاننا ہر ایک کے بس کا کام نہیں۔



## تواضع اور ذلت نفس میں فرق:

اسی طرح ''تواضع'' بڑی عمدہ چیز ہے، اعلیٰ درجے کی صفت ہے اور مطلوب ہے۔ ایک دوسری صفت ہوتی ہے ''ذلت نفس'' یعنی دوسرے کے سامنے نفس کو ذلیل کرنا یہ حرام ہے، اللہ تعالیٰ نے نفس کی عزت واجب کی ہے، اس کو ذلیل نہیں کرنا چاہیے، لیکن ان دونوں کے درمیان فرق کرنا کہ کونسا عمل ''تواضع'' کی وجہ سے کیا جا رہا ہے اور کونسے فعل میں ''ذلت نفس'' ہے ان کے درمیان فرق کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

## تواضع اور ذلت نفس کے فرق میں حضرت تھانوی کا ایک واقعہ:

اسی فرق کے سلسلے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا واقعہ بیان فرمایا کہ میں ایک

مرتبہ ریل میں سفر کر رہا تھا، ریل میں میرے پاس کچھ دیہاتی بھی بیٹھے ہوئے تھے، سفر کے دوران جب کھانے کا وقت آیا، تو ان دیہاتیوں نے اپنے ساتھ جو سالن روٹی لائے تھے وہ نکال کر سامنے رکھا اور مجھے بھی کھانے کی دعوت دیتے ہوئے کہا کہ حضرت جی کچھ گوہ موت ہمارے ساتھ بھی کھالو اس کھانے کو تواضعاً ''گوہ موت'' کا نام دے دیا، اب بظاہر تو یہ تواضع کی بات تھی لیکن حقیقت میں یہ اللہ تعالی کے رزق کی ناقدری تھی کہ اللہ تعالیٰ کے رزق کو ''گوہ موت'' قرار دے کر اس کی دوسرے کو دعوت دے اور بلائے یہ ''تواضع'' نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری اور بے توقیری ہے۔

بہر حال کبھی تواضع کی سرحد ذلت نفس کے ساتھ مل جاتی ہے اور کبھی اس کی سرحد ناشکری کے ساتھ مل جاتی ہے، اب کس حد تک تواضع کرے اور کس حد پر تواضع نہ کرے؟ کہاں تواضع ہے اور کہاں ناشکری ہے؟ کہاں تواضع ہے اور کہاں ذلت نفس ہے؟ ان کے درمیان فرق کو پہنچانا ہر ایک کا کام نہیں، جب تک کسی شیخ سے تربیت حاصل نہ کرلے۔

یہ چیز محض پڑھا دینے سے حاصل نہیں ہوتی کہ کتاب میں پڑھ کر کسی چیز کی حد تام معلوم کرلی اور پھر خود ہی اس کے فوائد اور قیود نکالنے شروع کر دیئے۔

یاد رکھئے! یہ اس قسم کا کام نہیں ہے، بلکہ یہ کام عملی ترتیب سے آتا ہے، جب کسی شیخ کو مسلسل آدمی دیکھتا رہے اور اس کے طرز عمل کا مشاہدہ کرتا رہے اور اس کو اپنے حالات بتا کر اس سے ہدایات لیتا رہے اور اس کے نتیجے میں پھر انسان کو یہ ادراک حاصل ہوتا ہے کہ عمل و اخلاق کا یہ درجہ قابل حصول صفت ہے اور یہ کیفیت یا درجہ قابل ترک رزیلہ ہے۔

## عملی ترتیب وتدریب سے اصلاح پر ایک مثال:

میں اس کی یہ مثال دیا کرتا ہوں جیسے ایک گلاب کا پھول ہے، کسی بڑے سے بڑے فلسفی اور منطقی سے کہا جائے کہ تم اس گلاب کے پھول کی خوشبو کی ایسی جامع مانع تعریف کرو جو اس کو چنبیلی کی خوشبو سے ممتاز کر دے، گلاب کے پھول سے بھی خوشبو آرہی ہے اور چنبیلی کے پھول سے بھی خوشبو آرہی ہے، اس کام کے لیے کسی بڑے سے بڑے فصیح اور بلیغ کو بلا لو کسی ادیب اور شاعر کو بلا لو اور اس سے کہو کہ گلاب اور چنبیلی کی خوشبو میں فرق بیان کر دو

بتایئے کوئی فرق بیان کرسکتا ہے؟ ہرگز نہیں بس اس کے فرق کرنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ پوچھنے والے سے کہا جائے کہ اس گلاب کو سونگھ لو اور اس چنبیلی کے پھول کو سونگھ لو۔ سونگھنے کے بعد پتہ چل جائے گا کہ گلاب کی خوشبو کیسی ہوتی ہے اور چنبیلی کی خوشبو کیسی ہوتی ہے اس کے علاوہ دونوں کے درمیان فرق معلوم کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔

## عملی ترتیب وتدریب سے اصلاح پر دوسری مثال:

ایک مثال اور سنئے دیکھیں آم بھی میٹھا ہوتا ہے اور گڑ بھی میٹھا ہوتا ہے گڑ کی مٹھاس کیسی ہے؟ اور آم کی مٹھاس کیسی ہے؟ دونوں کی مٹھاس میں جو فرق ہے وہ کسی بڑے سے بڑے فلسفی اور منطقی سے بیان کراؤ ہرگز بیان نہیں کرسکتا کیونکہ دونوں کی مٹھاس کا جو فرق ہے وہ زبان سے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا اس فرق کو جاننے کا یہ طریقہ ہے کہ اس پوچھنے والے کو کہا جائے کہ تو گڑ بھی کھا اور آم بھی کھا پھر پتہ چل جائے گا کہ آم کی مٹھاس کیسی ہوتی ہے اور گڑ کی مٹھاس کیسی ہوتی ہے۔

بالکل اسی طرح انسان کے باطن کے جو فضائل ہیں، مثلاً ''تواضع'' ہے اگر اس کی لفظوں میں کوئی مکمل تعریف بیان کرنا چاہے تو بہت مشکل ہے، لیکن جب کسی متواضع آدمی کو دیکھو گے اور اس کے طرز عمل کا مشاہدہ کروگے اور اس کی صحبت میں رہوگے، تو اس کے نتیجے میں وہ اوصاف تمہارے اندر بھی منتقل ہونے شروع ہوجائیں گے، اس لیے تصوف اور سلوک میں شیخ کی صحبت اور اس کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، صرف باتیں کرلینے سے یہ چیز حاصل نہیں ہوتی، بلکہ کسی کے سامنے رگڑے کھانے سے اللہ تعالیٰ فضل فرمادیتے ہیں اور یہ چیز حاصل ہوجاتی ہے۔

## بیعت ضروری نہیں بلکہ اصلاح ضروری ہے:

بہرحال پیر اور شیخ کے ہاتھ پر بیعت ہونا کوئی فرض نہیں، کہ آدمی کسی شیخ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر ضرور بیعت ہوجائے، لیکن اپنی اصلاح کرانا ضروری ہے اور جب اپنی اصلاح کے لیے کوئی شخص اپنے شیخ کی طرف رجوع کرتا ہے، تو اس رجوع کرنے کا اصل مقصد یہی ہوتا ہے کہ آدمی کو فضائل حاصل ہوں اور رزائل سے آدمی بچ جائے، ان رزائل کا امالہ ہو اور وہ

انسان کے قابو میں آ جائیں، سلوک وتصوف کا یہ اصل مقصد ہے۔

البتہ اس سلسلہ میں اذکار، اوراد، یا مختلف وظائف سالک کے لیے معین اور مددگار ہو جاتے ہیں مگر ہر شخص کے لیے ان اذکار اور اوراد کی مقدار، اس کا موقع اور وقت، یہ شیخ کی رہنمائی اور مشورے سے ہی مقرر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور اسی سے اصلاح حال کا فائدہ ہوتا ہے ورنہ عام حالات میں یہ اذکار اور اوراد اس درجہ میں خود مقصود نہیں، بلکہ اصل کام اپنے اخلاق کی اصلاح ہے اور اس کا تزکیہ ہے جس کے لیے ضروری ہے کہ شیخ کو اپنے حالات کی اطلاع دیتا رہے اور اس سے ہدایات لیتا رہے اور پھر ان ہدایات پر عمل کرتا رہے، بس ساری زندگی یہی کام کرتا رہے، شیخ کی طرف رجوع کرنے کا اصل مقصد یہی ہوتا ہے۔

اس کتاب ''انفاس عیسیٰ'' میں حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے ''رزائل'' اور ''فضائل'' سے متعلق جو ملفوظات جمع فرمائے ہیں ان کو پڑھ لیتے ہیں اور ساتھ ساتھ ان کی تھوڑی سی تشریح کر دیتا ہوں اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کو سمجھنے کی بھی توفیق عطا فرمائے اور ان کے ذریعہ اپنی اصلاح کرنے کی بھی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

باب اول کا چوتھا بیان:

# اصلاح اعمال اور اصلاح باطن کا طریقہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. اَلْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْدُ



## اصلاح اعمال اور اصلاح باطن کا مطلب کیا ہے؟

فرمایا کہ:

| ''اعمال کی اصلاح اور باطن کی اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ نفس کے جذبات کی مخالفت کی جائے اور اس کو مشقت کا عادی بنایا جائے۔'' |
|---|

''اعمال کی اصلاح'' سے مراد ہے ''اعمال ظاہرہ کی اصلاح''، یعنی وہ اعمال جو ظاہری اعضاء سے سرزد ہوتے ہیں، جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ۔

اور باطن کی اصلاح سے مراد باطن کے وہ اعمال ہیں جو انسان کے دل سے سرزد ہوتے ہیں، جیسے صبر، شکر، توکل، تواضع وغیرہ۔

## ظاہر و باطن کی اصلاح کیسے کی جائے؟

حضرت والا فرماتے ہیں کہ چاہے اعمال ظاہرہ کی اصلاح کا معاملہ ہو یا باطن کی اصلاح کا معاملہ ہو، دونوں کا طریقہ یہ ہے کہ نفس کے جذبات کی مخالفت کی جائے، دل میں جو غلط جذبہ، غلط داعیہ پیدا ہو رہا ہے، زبردستی اس کی مخالفت کی جائے اور اس کو مشقت کا عادی بنایا جائے۔

## نظرِ شیخ سے حالات نہیں بدلتے، مرید کی محنت کارگر ہوتی ہے:

لوگ سمجھتے ہیں کہ جب کسی اللہ والے کے پاس آدمی جاتا ہے، یا کسی شیخ کی خدمت میں حاضری دیتا ہے اوراس سے اصلاحی تعلق قائم کرتا ہے اوراس سے بیعت ہوتا ہے، تو وہ اپنی نظر سے کام بنادیتے ہیں، شیخ نے ایک نظر ڈال دی، تو بس دل کی دنیا بدل گئی۔

خوب سمجھ لیں کہ اصلاحِ نفس کے لیے یہ کوئی معمول کا طریقہ نہیں ہے، لہذا یہ نہیں ہوگا کہ کوئی اللہ والا نظر ڈال دے گا، تو تمہاری طبیعت بدل جائے گی اور تمہارے حالات میں خود بخود انقلاب آجائے گا، بلکہ کرنا تو خود ہی پڑے گا، ہمت کرنی ہوگی، کوشش کرنی ہوگی، مشقت اٹھانی ہوگی، شیخ کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ توجہ دلا دے اور راستہ بتادے، ایسی تدبیریں بتادے، جس کے ذریعہ کام نسبتاً آسان ہوجائے، لیکن کرنا خود ہی پڑے گا، چلنا خود ہی پڑے گا، کوئی شخص یہ سوچے کہ مجھے خود کچھ نہ کرنا پڑے، بلکہ دوسرا آدمی مجھے منزل تک پہنچادے، تو یہ بات نہیں ہے، اگر ایسا ہوتا تو پھر انبیاء اکرام علیہم السلام کو اشاعتِ دین کے لیے مجاہدات اور مشقتیں اٹھانے کی ضرورت نہ ہوتی، بس لوگوں پر ایک نظر ڈال دیتے اور سب لوگ مسلمان ہوجاتے۔

اللہ تعالیٰ نے ایسا معاملہ نہیں کیا، کیونکہ ہر انسان کو جزا اور سزا اس کے اپنے عمل پر دی جائے گی، لہذا عمل تو اسی کو کرنا ہے اور عمل کرنے کے لیے ہمت چاہیے، عزم اور پختہ ارادہ چاہیے، کہ چاہے اس راستے میں مشقت ہو، پھر بھی یہ کام کروں گا، لہذا اعمال کی اصلاح اور باطن کی اصلاح کے لیے بھی ضروری ہے کہ خود ہمت کرے اور دل میں جو غلط جذبات پیدا ہورہے ہیں، ان کی مخالفت کرے اور ہمت کرکے ان کا مقابلہ کرے اور اپنے آپ کو اس مشقت کے اٹھانے کا عادی بنائے۔

## تصوف وطریقت کا حاصل:

ہمارے ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ کا ایک ملفوظ بہت کثرت سے نقل فرمایا کرتے تھے، حقیقت یہ ہے کہ وہ ملفوظ پورے تصوف اور طریقت کا عطر اور خلاصہ ہے، فرماتے تھے کہ:

"وہ ذرا سی بات جو حاصل ہے تصوف کا، یہ ہے کہ جب کسی طاعت کے ادا کرنے میں سستی ہو تو اس سستی کا مقابلہ کر کے اس اطاعت کو انجام دے اور جب کسی گناہ سے بچنے میں نفس سستی کرے، تو اس سستی کا مقابلہ کر کے اس گناہ سے بچے، بس اسی سے تعلق مع اللہ پیدا ہوتا ہے، اسی سے ترقی کرتا ہے اور اسی سے تعلق باقی رہتا ہے۔"

یہ وہ بات ہے جو ایک مجددِ تصوف وطریقت، جس نے اس طریق کے سارے دفتر چھان مارے، اس راستے کی خاک چھانی، وہ کہہ رہا ہے کہ سارے تصوف کا حاصل یہ ہے کہ سستی کا مقابلہ کرو، مثلاً نماز پڑھنے میں سستی ہو رہی ہے اور دل چاہ رہا ہے کہ مسجد میں نہ جاؤ، گھر میں ہی نماز پڑھ لو، یا نماز کی چھٹی کرلو، اب اس سستی کا علاج سوائے چستی کے اور کچھ نہیں ہے، لہذا سستی کے مقابلے کے لیے اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو ہمت دی ہے، اس کو استعمال کرو، جب ہمت کو استعمال کرو گے، تو سستی زائل ہو گی، اگر ہمت کو استعمال نہیں کرو گے، تو یہ سستی تمہارے اوپر اور قبضہ جماتی چلی جائے گی، کیونکہ اس سستی کا حال یہ ہے کہ تم جتنا اس کے سامنے ہتھیار ڈالو گے، یہ اتنی ہی تمہارے اوپر قابو پائے گی، آج تم سے ایک فرض چھڑایا، کل کو دوسرا فرض چھڑائے گی، آج ایک گناہ کرایا، کل کو دوسرا گناہ کرا دے گی اور اگر تم اس کے مقابلے میں ڈٹ گئے اور اپنے آپ کو مضبوط کرلیا کہ مجھے یہ کام نہیں کرنا، یا مجھے یہ کام ضرور کرنا ہے، تو پھر یہ سستی کمزور پڑتی چلی جائے گی۔

## تربیت میں انسان کا نفس دودھ پیتے بچے کی مانند ہے:

علامہ بوصیری رحمۃ اللہ علیہ نے "قصیدہ بردہ" میں کیا خوبصورت بات فرمائی، فرمایا

اَلنَّفْسُ كَالطِّفْلِ اِنْ تُمْهِلْهُ شَبَّ عَلٰى
حُبِّ الرَّضَاعِ وَاِنْ تَفْطِمْهُ يَنْفَطِمِ

یعنی انسان کا نفس چھوٹے بچے کی طرح ہے، اگر تم بچے کو دودھ پلاتے رہو گے اور کبھی دودھ نہیں چھڑاؤ گے تو وہ بچہ جوان ہو جائے گا اور دودھ پیتا رہے گا، لیکن اگر ایک مرحلے پر تم یہ محسوس کرو کہ اب دودھ پلانا اس کے لیے مضر ہے، اسے چھڑا دینا چاہیے، تو اس وقت دودھ چھڑانے کے لیے تھوڑی سی دقت اور مشقت ضرور ہو گی، وہ بچہ روئے گا، چیخے گا، چلائے گا، راتوں کو خود جاگے گا اور تمہیں بھی جگائے گا، لیکن بالآخر دودھ چھوڑ ہی دے گا اور اگر تم اس

مشقت سے گھبرا گئے اور کہا کہ بچے کا دودھ چھڑانا تو بہت مشکل ہے یہ رات کو خود بھی نہیں سوئے گا اور مجھے بھی نہیں سونے دے گا، چلو دودھ پلاتے رہو، اس صورت میں وہ بچہ جوان ہو جائے گا، لیکن اس کی شیر خواری نہیں جائے گی۔

اسی طرح تمہارا نفس بھی بچے کی طرح ہے، اس کو تو گناہوں کی لت لگی ہوئی ہے، اس کو تو معصیتوں اور نافرمانیوں کی عادت پڑی ہوئی ہے، اس کو مزہ اسی میں آتا ہے کہ نافرمانی کرے، گناہ کرے، طاعت سے بچے، اب اگر تم نے اس کو اس معصیت اور گناہوں پر لگائے رکھا اور کہا کہ چل تو گناہ کا دودھ پیتا رہ، تو یہ نفس کبھی بھی گناہ نہیں چھوڑے گا اور اگر کبھی تم نے اس سے گناہ چھڑانا چاہا تو اس وقت مشقت ضرور ہوگی، لیکن بالآخر وہ گناہ چھوڑنے پر آمادہ ہو جائے گا اور گناہ چھوڑ دے گا، بس اس نفس کو تھوڑی سی مشقت اور مشق کرانے کی دیر ہے، یہ علامہ بوصیری رحمتہ اللہ علیہ کا عجیب وغریب پیغام ہے اور حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ بھی یہی فرماتے ہیں کہ تصوف کا حاصل بھی یہی ہے کہ سستی کا مقابلہ کر کے آدمی طاعت کرے اور سستی کا مقابلہ کر کے معصیت سے بچے۔

## ہمت بہت سارے کام کروا اور چھڑوا سکتی ہے:

جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر سستی پیدا فرمائی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر ایک اور چیز پیدا فرمائی ہے، وہ ہے ''ہمت'' یہ ہمت بڑی عجیب وغریب چیز ہے اور اس کی مثال ربڑ ہے اگر ربڑ کو کھینچو تو وہ کھینچتی چلی جائے گی، اس طرح انسان کے اندر جو ہمت ہے، اس کو اللہ تعالیٰ نے ایسا بنایا ہے کہ اس کو جتنا چاہو، کھینچ لو اور اونچے سے اونچے مقام تک پہنچ جاؤ، اس دنیا کے اندر جس شخص نے بھی کوئی کارنامہ انجام دیا ہے، وہ اسی ہمت کی بنیاد پر انجام دیا ہے، چاہے وہ دنیا کا کارنامہ ہو، یا دین کا کارنامہ ہو، چاہے وہ فضول اور لغو کارنامہ ہو، فضولیات اور لغویات کے کارنامے بھی ہمت ہی سے انجام پاتے ہیں۔

## امریکہ کی نیاگرہ آبشار پر ہمت و جوانمردی کے کارنامے:

امریکہ میں ایک مشہور آبشار ہے ''نیاگرہ''، دنیا کے عجائبات میں اس کا شمار ہے، ایک مرتبہ میرا وہاں جانے کا اتفاق ہوا، تو ایک صاحب نے وہاں پر ایک کتابچہ لاکر دیا، اس

کتابچے میں اس آبشار کے تاریخی واقعات لکھے تھے کہ اس ''نیاگرہ آبشار'' پر کیا کیا عجائبات وغرائب پیش آئے ہیں؟ اور لوگوں نے یہاں کیا کیا کارنامے انجام دیئے ہیں؟ اور کیا کیا مہم جوئیاں کیں؟ اس آبشار میں پورا دریا اوپر سے نیچے بڑی قوت سے گرتا ہے، چنانچہ اس کتابچہ میں لکھا ہے کہ کن کن لوگوں نے یہاں یہ کارنامہ انجام دیا کہ وہ ایک ربڑ کی کشتی میں بیٹھے اور آبشار کے دھانے پر کشتی لاکر کشتی سمیت اس آبشار کے ذریعہ نیچے گرتے تھے چنانچہ اس میں لوگوں کے مقابلے ہوئے کہ کون جلدی گرتا ہے اور کون دیر لگاتا ہے اس کے نتیجے میں بہت سے لوگوں کی جانیں چلی گئیں اور اس کے ذریعے یہ ریکارڈ قائم کرنا تھا کہ ہم ''نیاگرہ آبشار'' کے ساتھ ساتھ اپنی کشتی کو گرا کر لے گئے۔

بہت سے لوگوں نے یہاں یہ مقابلہ کیا کہ ''نیاگرہ آبشار'' کی چوڑائی میں رسا باندھا اور پھر اس رسے پر چل کر اس آبشار کو عبور کر رہے ہیں۔ چنانچہ بہت سے لوگوں نے عبور کرنے کی کوشش کی لیکن درمیان میں گر پڑے اور گرنے کے نتیجے میں جسم کے ٹکڑے ہو گئے، کیونکہ جس رفتار سے پانی اوپر سے نیچے گرتا ہے، اس میں اگر کوئی جاندار آ کر گرے، تو اس کی ہڈی پسلی ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، چنانچہ کوشش کے نتیجے میں بعض لوگوں نے عبور کرلیا اور اپنا ریکارڈ قائم کرلیا۔

اس کے بعد پھر ایک شخص نے کہا کہ فلاں آدمی نے تو اس کو تنہا عبور کیا، میں ایک آدمی اپنے اوپر بٹھا کر رسے پر چل کر اس آبشار کو عبور کرتا ہوں، چنانچہ اس نے ایک اندھے آدمی کو سر پر بٹھا کر اس رسے کے ذریعہ اس آبشار کو عبور کیا اور اپنا ریکارڈ قائم کیا اور دنیا کی تاریخ میں آج تک اس کا نام لکھا ہوا ہے کہ فلاں شخص نے اس طرح ''نیاگراہ'' آبشار عبور کیا۔

اب بتایئے کیا آپ یہ کام کر سکتے ہیں؟ ایک چھوٹے سے نالے پر رسی باندھ کر اس کو پار کرنے کی کوشش کریں؟ آپ سے نہیں بنے گا، لیکن جب ایک شخص نے ہمت کر لی کہ مجھے یہ کام کرنا ہے اور عزم کرلیا کہ میں یہ کام کروں گا تو اس نے کرلیا، اللہ تعالیٰ نے اس ہمت میں ایسی قوت عطا فرمائی ہے کہ کافر، غیر مسلم اور اللہ کو نہ ماننے والا بھی جب کسی کام کو کرنے کی ہمت کرلیتا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اتنی قوت عطا فرمائی ہے کہ اس کے ذریعہ بڑے بڑے معرکے سر کرا دیتے ہیں، بس عزم کرنے کی دیر ہے۔

## نافرمانی سے بچنے کی ہمت کرو:

جب اللہ تعالیٰ ایک کافر کی ہمت میں یہ برکت عطا فرمادیتے ہیں، تو ایک صاحب ایمان اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لئے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنے کے لئے ہمت کرے، تو کیا اللہ تعالیٰ اس میں برکت نہیں دے گا؟ اس ہمت میں اللہ تعالیٰ نے اتنی قوت عطا فرمائی ہے کہ اس کے ذریعہ بڑے بڑے معرکے سر کرادیتے ہیں، بس عزم کرنے کی دیر ہے۔

دراصل ہوتا یہ ہے کہ انسان بے ہمتی اور سستی کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے اور پھر یہ کہتا ہے کہ میں بے بس ہو گیا، لیکن شریعت کا کہنا یہ ہے کہ تم کسی کے آگے بے بس نہیں ہو، قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (سورۃ بقرہ پارہ نمبر ۳)

لہٰذا جن کاموں کا تمہیں حکم دیا گیا ہے، وہ تمہاری وسعت میں ہیں، بس ہمت کرنے کی دیر ہے، اس لیے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سارے تصوف کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمت کر کے سستی کا مقابلہ کرے اور طاعات کو انجام دے اور معصیت سے بچے، پوری زندگی اس کام میں گزارنی ہے، اگر کسی وقت پھسل جاؤ تو پھر سے ہمت کو تازہ کر لو۔

## چلنا سیکھنے والے بچے کی ہمت سے سبق حاصل کرو:

حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ آپ نے بچے کو دیکھا ہے کہ وہ کس طرح چلنا سیکھتا ہے؟ جب پہلی مرتبہ وہ چلنا چاہتا ہے، تو ایک قدم چلتا ہے، پھر گر پڑتا ہے، اب اگر وہ بچہ گرنے کے بعد مایوس ہو کر بیٹھ جائے، کہ چلنا میرے بس میں نہیں، تو کبھی اس کو چلنا نہیں آئے گا، لیکن اگر وہ دوبارہ چلے گا، پھر گرے گا اور گر کر پھر چلے گا، پھر گرے گا، پھر چلے گا یہاں تک کہ گرتے پڑتے، چلتے چلتے، بالآخر اس کو چلنا آجائے گا، لہٰذا ہمت کے ذریعہ اپنے آپ کو آگے بڑھاؤ، آگے قدم بڑھاؤ، جب گر جاؤ تو کوئی پرواہ نہ کرنا، پھر دوبارہ کھڑے ہو کر چلنا شروع کر دو، پھر گر گئے پھر اٹھ کر چلنا شروع کر دو، آج دو مرتبہ گرے، کل کو ایک مرتبہ گرو گے، آج پورے گرے، کل کو آدھے گرو گے، رفتہ رفتہ چلنا آجائے گا، بہرحال ہمت کے ذریعہ انسان آگے بڑھتا ہے اور ہمت کے بغیر دنیا کا کوئی کام نہیں ہو سکتا، جو کچھ ہو گا وہ

انسان کی ہمت سے ہوگا۔

## نظر ڈالکر انقلاب برپا کرنے پر حافظ شیرازی کا واقعہ:

یہ جو مشہور ہے کہ فلاں بزرگ ایک نظر ڈال دیتے ہیں، تو زندگی بدل جاتی ہے، انقلاب آجاتا ہے، جیسا کہ حافظ شیرازی رحمتہ اللہ علیہ کا واقعہ مشہور ہے کہ حافظ شیرازی ابتداء میں ویسے ہی آوارہ پھرتے رہتے تھے، ان کے والد کے ایک شیخ تھے، والد کی یہ خواہش تھی کہ یہ میرا بیٹا آوارہ پھرتا رہتا ہے اور شیخ کے پاس ملاقات اور اصلاح کرنے نہیں جاتا، اس کو چاہیے کہ شیخ کے پاس جا کر اصلاح کرائے۔

ایک دن شیخ ان کے گھر تشریف لائے، حافظ صاحب ویسے ہی پھر رہے تھے، باپ نے ان کو بلایا کہ ادھر آؤ، چونکہ شاعر تھے ہی، جب قریب آئے تو ایک شعر پڑھا کہ

آں را کہ خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشہ چشم بما کنند

یعنی وہ لوگ جو ایک نظر سے خاک کو کیمیا بنا دیتے ہیں، دراصل شیخ کو خطاب ہے کہ آپ تو ایک نظر میں خاک کو کیمیا بنا دیتے ہیں،، کاش ایک نظر کا کنارہ ہم پر بھی ڈال دیں، شیخ نے فوراً جواب دیا کہ ''نظر کردم نظر کردم'' میں نے نظر ڈال دی، میں نے نظر ڈال دی، بس اس وقت سے حافظ کی دنیا بدل گئی اور وہ آوارہ گردی ختم ہوگئی اور پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو صاحب مقامات بنا دیا۔ بہر حال پچھلے زمانے کے صوفیاء کرام کے یہاں اس قسم کے چند واقعات ملتے ہیں، کہ شیخ نے ایک نظر ڈالی اور ایک نظر سے زندگی میں انقلاب آگیا۔

## جو پیر تصرف نہ کر سکے ''وہ بیعت کے لائق نہیں'' یہ غلط ہے:

اس بارے میں کئی باتیں سمجھنے کی ہیں:

۱)...... پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ نظر ڈالنا ''تصرف'' ہے اور یہ تصرف کرنا ہر ایک کو نہیں آتا اور تصرف نہ آنا کوئی عیب کی بات نہیں، یعنی اگر کسی شیخ اور ولی اللہ کی نظر میں تصرف کی قوت نہ ہو، تو اس کے اندر کوئی عیب نہیں، اگر تصرف کی یہ قوت حاصل ہو جائے، تو اللہ کی نعمت ہے اور اگر حاصل نہ ہو تو کوئی عیب نہیں۔

آجکل ایک پیر صاحب بڑے مشہور ہو رہے ہیں، انکی کتاب میں لکھا ہوا دیکھا ہے کہ

''جو پیر اپنے مریدوں کو بیت اللہ میں نماز نہ پڑھوا سکے، وہ پیر بیعت کے لائق نہیں''

یاد رکھئے! یہ گمراہی کی فکر ہے، اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں، تصرف کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، یہ تصرف کا عمل فاسق و فاجر کو بھی حاصل ہو جاتا ہے حتی کہ کافر اور غیر مسلم کو بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ حالت مقرب بارگاہ خداوندی ہونے کی علامت نہیں اور نہ ہی یہ متقی ہونے کی علامت ہے اور نہ اس کا نہ ہونا کوئی عیب ہے، بعض اوقات کسی کو تصرف حاصل ہو جاتا ہے اور بعض اوقات نہیں ہوتا۔

## تصرف کے نشاط کے بعد بھی اعمال ضروری ہیں:

۲)...... دوسری بات یہ ہے کہ ''تصرف'' کا حاصل صرف یہ ہے کہ جس شخص پر تصرف کیا گیا ہے، تصرف کے نتیجے میں اس کی طبیعت میں ذرا سا نشاط پیدا ہو جاتا ہے، لیکن یہ نشاط دیرپا نہیں ہوتا، بلکہ وقتی ہوتا ہے، آگے کام اس کو خود ہی کرنا پڑتا ہے، یہ نہیں ہو سکتا کہ اس تصرف کے نتیجے میں ساری عمر کام کرتا رہے، اس تصرف کی مثال ایسی ہے کہ جیسے گاڑی کو دھکا لگانا، اگر گاڑی اسٹارٹ نہیں ہو رہی ہے، تو اس کو دھکا لگا کر اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اس دھکا لگانے کے نتیجے میں اس گاڑی میں چلنے کی تھوڑی سی صلاحیت پیدا ہوئی، لیکن جب دھکے کے ذریعہ اسٹارٹ ہو گئی، تو اب وہ گاڑی انجن اور پٹرول کی طاقت سے چلے گی، لیکن اگر انجن ہی خراب ہے یا پٹرول ہی نہیں تو پھر ہزار دھکے لگاؤ، گاڑی نہیں چلے گی، بس دھکا لگانے سے دو چار قدم چل کر کھڑی ہو جائے گی۔

بالکل اسی طرح اگر انسان کے اندر سلوک میں اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں چلنے کی ہمت اور طاقت ہے، تو کسی کی نظر پڑ جانے سے اس کے اندر چلنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی اور طبیعت کے اندر ذرا سا نشاط پیدا ہو گیا، اب اگر اپنے اندر طاقت ہے، تو وہ اس کے ذریعہ آگے چلے گا، لیکن اگر اندر طاقت ہی نہیں تو ہزار نظر ڈالتے رہو، ہزار تصرف کرتے رہو، کچھ نہیں ہوگا، ہاں وقتی طور پر تھوڑا سا جذبہ پیدا ہوگا، پھر وہ ٹھنڈا پڑ جائے گا۔

بہرحال یہ ''نظر'' نہ تو دیرپا چیز ہے اور نہ دائمی ہے، نہ ہر ایک کو حاصل ہوتی ہے، نہ کوئی ایسی صفت مدح ہے، جس کا نہ ہونا عیب ہو اور اگر نظر سے فائدہ ہو بھی جائے تو وہ وقتی ہوگا،

آخر میں کام اپنی ہمت ہی سے کرنا ہوگا۔ انجن اپنا مضبوط کرنا ہوگا، اسی انجن سے ہی گاڑی چلے گی، دھکے سے نہیں چلے گی، لہذا اصل کام یہ ہے کہ اپنی ہمت کو تازہ کرو، اسی لیے حضرت والا فرماتے ہیں کہ: ''اعمال کی اصلاح اور باطن کی اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ نفس کے جذبات کی مخالفت کی جائے اور اس کو مشقت کا عادی بنایا جائے۔''

اس کو جتنا مشقت کا عادی بناؤ گے، وہ بنتا ہی چلا جائے گا اور اس کے نتیجے میں تمہارا کام بنتا چلا جائے گا۔ (انشاء اللہ تعالیٰ) پھر اس سے ظاہری اعمال بھی درست ہوتے چلے جائیں گے اور باطن بھی درست ہوتا چلا جائے گا۔

## حسن اخلاق کی ایک حد ہے، اس کے بعد انسان اسکا مکلّف نہیں:

آگے فرمایا کہ:

> ''حدیث میں ہے کہ جب تم سائل کو تین بار عذر سمجھا کر جواب دیدو اور پھر بھی نہ جائے، لپٹ کر جم ہی جائے، جس سے ایذا ہونے لگے، تو پھر اس کو جھڑک دینے میں کچھ ڈر نہیں، اس سے یہ معلوم ہوا کہ حسن اخلاق کی بھی ایک حد ہے اور بندہ اس کا مکلف نہیں کہ اس حد سے آگے ایذاء کا تحمل کرے۔'' (انفاس عیسیٰ ص ۱۳۸)

ایک طرف قرآن کریم کا تو یہ ارشاد ہے کہ ﴿وَاَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾ یعنی جو سائل تم سے مانگ رہا ہو، اس کو مت جھڑکو اور ڈانٹ ڈپٹ کر مت بھگاؤ، اگر منع کرنا ہے، تو نرمی سے منع کردو کہ بابا معاف کردو، اس وقت کچھ دینے کو نہیں ہے، یا کوئی اور عذر ہے تو بتادو، جھڑکنا نہیں چاہیے، لیکن اگر ایک مرتبہ سمجھا دیا کہ بابا اس وقت نہیں ہے معاف کرنا پھر بھی وہ مانگ رہا ہے، پھر سمجھا دیا کہ بابا معاف کرو پھر بھی وہ پریشان کررہا ہے، پھر تیسری مرتبہ سمجھا دیا، تین مرتبہ سمجھانے کے بعد اب تم نرمی کرنے کے مکلّف نہیں ہو، اب اگر تم اس کو جھڑک دو کہ بھاگ یہاں سے، یہ جھڑکنا تمہارے لیے جائز ہے اور یہ جھڑکنا ﴿اَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾ میں داخل نہ ہوگا جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔

حضرت والا فرماتے ہیں کہ اس سے پتہ چلا کہ لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق کی بھی ایک حد ہے، یہ نہیں کہ حسن اخلاق کا حکم انسان کو غیر متناہی تکلیف پہنچانے کے لیے دیا گیا ہے، دوسرا شخص چاہے کتنی تکلیف پہنچائے، مگر یہ برداشت ہی کرے اور حسن اخلاق ہی کا مظاہرہ

کرے، ایسا نہیں ہے، بلکہ ایک حد کے بعد ظاہراً بداخلاقی کا مظاہرہ کرنا پڑے، تو اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ ہر چیز کی اللہ تعالیٰ نے ایک حد مقرر رکھی ہے، اسی حد تک وہ محمود بھی ہے اور مطلوب بھی ہے، اس حد سے آگے کا انسان مکلف نہیں۔

## مبتدی کو چاہیے کہ وہ برمحل غصہ کو بھی چھوڑ دے:

اگرچہ انسان کو حتی الامکان یہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ غصہ نہ کرے، ہمارے حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ویسے تو بے محل غصہ کرنا گناہ ہے اور برمحل غصہ کرنا جائز ہے، لیکن بے محل غصہ کرنے سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے اس کی مشق کرنی پڑتی ہے کہ برمحل بھی غصہ نہ کرے اور مبتدی کو تو چاہیے کہ پہلے تو غصہ بالکل چھوڑ ہی دے، نہ برحق غصہ کرے، نہ ناحق غصہ کرے، پھر جب غصہ قابو میں آ جائے تو برحق غصہ کرنے میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ برحق غصہ کرنا جائز ہے، وہ کوئی رذیلہ نہیں ہے۔

اب یہ دیکھنا کہ کس حد تک انسان حسن اخلاق سے پیش آئے، یہ وہ مقام ہے جہاں انسان دھوکہ کھا جاتا ہے، یہی وہ چیز ہے جو بزرگوں کی صحبت سے حاصل کیجاتی ہے کہ کس جگہ آدمی غصہ کرے؟ اور کس جگہ غصہ نہ کرے؟ یہ کوئی ریاضی کا فارمولا نہیں ہے، جو دو اور دو چار کرکے سمجھا دیا جائے کہ فلاں جگہ پر رک جاؤ اور فلاں جگہ پر غصہ کرلو، بلکہ بزرگوں کی صحبت کے نتیجے میں ایک ذوق اور ملکہ پیدا ہو جاتا ہے اور پھر اس ملکہ کے ذریعہ انسان فیصلہ کرتا ہے کہ یہاں پر غصہ کرنا صحیح ہے اور یہاں پر غصہ کرنا غلط ہے اور یہ ملکہ صاحب ملکہ کی صحبت کے بغیر حاصل ہو ہی نہیں سکتا، صاحب کمال کو دیکھئے کہ وہ کس طرح عمل کر رہا ہے، اس کو دیکھنے سے اپنے اندر بھی وہ ملکہ رفتہ رفتہ پیدا ہو جاتا ہے۔

## ریاضت سے اخلاق جبلیہ زائل ہوتے ہیں یا مضمحل؟

> فرمایا کہ: ''حدیث میں ہے کہ جب تم سنو کہ اپنی جگہ سے پہاڑ ٹل گیا، تو تصدیق کرلو اور جب تم کسی شخص کے نسبت سنو کہ اپنے اخلاق سے ہٹ گیا، تو تصدیق مت کرو، اس سے معلوم ہوا کہ ریاضت سے اخلاق جبلیہ زائل نہیں ہوتے، ہاں مضمحل ہو جاتے ہیں۔'' (انفاس عیسیٰ ص ۱۳۹)

یہ مشہور حدیث ہے کہ اگر کوئی تم سے یہ کہے کہ فلاں پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ کر فلاں جگہ چلا گیا، تو اس کی تصدیق کرنے کی گنجائش ہے، کیونکہ اسکا امکان ہے، لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ فلاں شخص جبلی اور فطری اخلاق سے ہٹ گیا، تو اس کی تصدیق مت کرو۔

مطلب یہ کہ پہاڑ تو اپنی جگہ سے ہٹ سکتا ہے لیکن اخلاق فطری اور جبلی اپنی جگہ سے ہٹ نہیں سکتے جیسا کہ فارسی کی مثل مشہور ہے کہ

''زمیں جنبد، زمان جنبد، نہ جنبد گل محمد''

گل محمد سے مراد اخلاق جبلیہ ہیں، وہ اپنی جگہ سے نہیں ٹل سکتے۔

اس حدیث کو نقل کر کے حضرت والا یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ ریاضت سے اخلاق جبلیہ زائل نہیں ہوتے، ہاں مضمحل ہو جاتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ حدیث میں نفی اس بات کی کی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اس کا غصہ ختم ہو گیا، تو اس کی تصدیق مت کرو، کیونکہ غصہ ختم نہیں ہوتا البتہ ریاضت، مجاہدہ اور صحبت کے نتیجے میں غصہ مضمحل ہو جاتا ہے اور اب ہر جگہ غصہ نہیں آتا، بلکہ برمحل غصہ آتا ہے اور حد سے تجاوز نہیں کرتا، لیکن وہ غصہ بالکلیہ ختم نہیں ہوتا۔

## پہاڑ ٹلنے اور اخلاق نہ ٹلنے والی حدیث کو ذکر کرنے کا مقصد:

درحقیقت اس حدیث کو یہاں لانے کا منشا ان لوگوں کی تردید ہے کہ جو اس حدیث کو بنیاد بنا کر یہ کہتے ہیں کہ صاحب! پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل سکتا ہے، لیکن اخلاق انسان کے نہیں بدل سکتے، یہ سن کر لوگ اصلاح سے مایوس ہو جاتے ہیں کہ جب میرے اخلاق نہیں بدل سکتے، تو اصلاح کرانے سے کیا فائدہ؟ بس جیسے اخلاق ہیں ان کو ویسے ہی رہنے دیا جائے، حضرت نے اس حدیث کا صحیح مطلب واضح فرمایا کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جبلی اخلاق نہیں بدل سکتے البتہ کمزور پڑ جاتے ہیں اور کمزور پڑ جانے کے نتیجے میں برائی پر آمادہ کرنا ختم ہو جاتا ہے، لہذا یہ حدیث اس بات پر دلالت نہیں کرتی کہ انسان اپنے اخلاق کی اصلاح کی کوشش ہی نہ کرے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو رزائل سے بچنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔ آمین

باب اول کا پانچواں بیان:

# ریاضت اور مجاہدہ کی حقیقت وضرورت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ. اَلْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِیْمِ وَعَلٰی آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْدُ

## ریاضت اور مجاہدہ کی حقیقت اور ان میں فرق:

حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک درجہ تو ہے تقاضا معصیت کا، اس کی مخالفت کرنا تو ''مجاہدہ'' ہے۔ اور ایک اس تقاضے کا منشاء ہے ''خلق رزیل''، اس کے ازالہ بمعنی اضمحلال کو ''ریاضت'' کہتے ہیں۔

تصوف اور سلوک کی کتابوں میں آپ اکثر ''مجاہدہ'' اور ''ریاضت'' کی اصطلاح پڑھتے ہیں، لیکن ''مجاہدہ'' کسے کہتے ہیں؟ اور ''ریاضت'' کسے کہتے ہیں؟ اور دونوں میں کیا فرق ہے؟ حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ نے اس ملفوظ میں ان دونوں کا مطلب اور ان کے درمیان فرق کو بیان فرمایا ہے۔

فرمایا کہ ''مجاہدہ'' تو یہ ہے کہ جب نفس کسی کام کا تقاضا کر رہا ہے کہ یہ کام کرو، اب زبردستی نفس کو اس کام سے روکنا ''مجاہدہ'' ہے اور ریاضت کا مطلب یہ ہے کہ اس کام کے داعی کا جو منشاء تھا، بار بار مجاہدہ کرنے کے نتیجے میں اس منشاء پر ضرب لگی، اس ضرب لگنے کے نتیجے میں وہ کمزور ہو گیا اور اضمحلال ہو گیا۔ تو یہ ''ریاضت'' ہے۔

## مجاہدہ میں جائز امور کو چھوڑنے کا اثر:

گناہ سے بچنے کے لیے بعض اوقات انسان کو کچھ جائز چیزیں بھی ترک کرنی پڑ جاتی ہیں ایک کام بذات خود جائز ہے لیکن کبھی اس کو بھی اس لیے چھوڑنا پڑتا ہے کہ کہیں یہ نفس اس

جائز کام سے بلاآخر کسی ناجائز کام کی طرف لے جانے والا نہ بن جائے، مثلاً بعض اوقات صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ کھانا بھوک سے کم کھاؤ، اب بتایئے کہ بھوک کے مطابق کھانا کھانا کوئی گناہ ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ گناہ نہیں، اس کے باوجود فرماتے ہیں کہ کم کھاؤ، کیوں؟ اس لیے کہ کم کھانے کے نتیجے میں یہ تمہارے نفس کا مجاہدہ ہوگا اور مجاہدہ کا اثر یہ ہوگا کہ نفس کو تقاضوں کے خلاف کام کرنے کی عادت پڑے گی، جو معصیت کے تقاضے کی خلاف ورزی کرنے میں کام آئے گی۔

## کم کھانے کا مجاہدہ اور آج کل اس کا طریقہ کار:

مثال کے لیے میں نے کم خوراکی کے مجاہدے کی بات ذکر کی ہے۔تاہم ہمارے زمانہ میں خاص اسی چیز کا مجاہدہ کرنے کے بارے میں حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کم کھانے کا جو مجاہدہ پہلے زمانے کے صوفیاء کرام کرایا کرتے تھے، وہ آج کل مفید نہیں، کیونکہ پہلے زمانے کے لوگوں کے قویٰ مضبوط ہوا کرتے تھے اور خوراکیں زیادہ ہوا کرتی تھیں، اس میں کمی کرنا بنیادی صحت کے لیے نقصان دہ نہیں ہوتا تھا، بلکہ نفس کو قابو میں رکھنے کا ذریعہ ہو جاتا تھا، لیکن یہ کم خوراکی بھی انہی کے حساب سے تھی، چنانچہ ''احیاء العلوم'' میں امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے کم کھانے کی جو مقدار لکھی ہے، وہ آج کے دور میں مجھ جیسے دو آدمی کھالیں، اس لیے ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب عارفی قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ آج کے دور میں کم کھانے کی مقدار یہ ہے کہ ضرورت کے مطابق کھالے، اس سے زائد نہ کھائے اور اس کی پہچان کا طریقہ یہ ہے کہ کھانے کے دوران ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ آدمی کو یہ کشمکش ہوتی ہے کہ مزید کھاؤں یا نہ کھاؤں؟ اس وقت کھانا چھوڑ دے، بس آج کل کم خوراکی کے لیے اتنا مجاہدہ کرلو، اب بتایئے کہ اگر اس مرحلے میں کوئی شخص ایک دو نوالے اور کھالے تو کیا وہ ایک دو نوالے کھانا گناہ ہے؟ کوئی ناجائز ہے؟ نہیں، جائز ہے، لیکن اس کو مزید کھانے سے جو روکا جا رہا ہے وہ مجاہدہ کی وجہ سے روکا جا رہا ہے۔

بہرحال صوفیاء کرام بعض اوقات جائز چیزوں سے ابھی اس لیے روک دیتے ہیں، تاکہ نفس کو مجاہدہ کا عادی بنایا جائے۔

## صوفیاء کرام حلال چیزوں کو حرام کیوں قرار دیتے ہیں؟

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت یہ صوفیاء کرام بہت سی ایسی چیزوں سے بھی منع کر دیتے ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے، یہ کیوں حرام کر دیتے ہیں؟ مثلاً اللہ تعالیٰ نے کھانا حلال کیا تھا، صوفیاء کہتے ہیں کہ مت کھاؤ، سونا حلال ہے، صوفیاء کہتے ہیں کہ مت سوؤ، لوگوں سے ملنے جلنے اور بات چیت کرنے کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے، صوفیاء کہتے ہیں کہ بات چیت کم کرو، اس کی کیا وجہ ہے؟

حضرت نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ نے ایک کاغذ لیا اور فرمایا کہ اس کاغذ کو ایک طرف موڑو، پھر فرمایا کہ اس کاغذ کو سیدھا کرو، لیکن بار بار سیدھا کرنے کے باوجود یہ کاغذ سیدھا نہیں ہوتا جو سلوٹ اس میں پڑ گئی ہے، وہ اسی طرح اس کاغذ کو موڑ رہی ہے، اس کو سیدھا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کاغذ کو دوسری طرف الٹی سمت میں موڑ دو، اب یہ کاغذ سیدھا ہو جائے گا۔

پھر فرمایا کہ انسان کا نفس بھی گناہ کی طرف مڑا ہوا ہے، جب اس کو تم اعتدال پر لانا چاہتے ہو، تو یہ اعتدال پر نہیں آتا، اس لیے اس نفس کو دوسری طرف موڑو اور اس نفس سے جائز اور حلال چیزیں بھی چھڑاؤ، جب اس سے جائز چیزیں چھڑاؤ گے تو بلآخر اس کے اندر اعتدال پیدا ہو جائے گا اور پھر گناہ سے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے محفوظ رہے گا۔ یہ ہمارا نفس گناہوں کا عادی بنا ہوا ہے۔ العیاذ باللہ۔ ہماری نگاہ بدنظری کی عادی بنی ہوئی ہے، ناجائز چیزوں پر نگاہ ڈالنے اور ان سے لذت حاصل کرنے کی عادی بنی ہوئی ہے، جب کہ قرآن کریم میں فرمایا کہ

﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ﴾

آپ مومنوں سے فرما دیں کہ وہ اپنی آنکھیں نیچی رکھیں، اگر بازار جاتے ہوئے آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھتے بھالتے جاؤ گے، تو یہ جائز ہے یا ناجائز ہے؟ جائز ہے، کیونکہ جب سامنے وہ چیزیں نظر آ رہی ہیں، جن کا دیکھنا جائز ہے، مثلاً بلڈنگ نظر آ رہی ہے، سڑک نظر آ رہی ہے، کاریں آتی جاتی نظر آ رہی ہیں، ان سب کو دیکھنا جائز ہے، لیکن نگاہ چونکہ گناہ کی عادی بنی ہوئی ہے اور گناہ کی چیز کو بار بار دیکھنے کے تقاضے پیدا ہوتے رہتے ہیں، لہٰذا سد باب کے لیے اور حفظ ما تقدم کے طور پر فرمایا کہ جب بازار میں چلو تو نگاہ نیچی کر کے چلو

کیوں؟ اس لیے کہ جب تم جائز چیزوں کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھو گے، تو ایک مرحلہ ایسا آئے گا کہ بالآخر حرام پر نگاہ پڑ جائے گی اور یہ تمہارا دل، تمہارا نفس کمزور ہے، گناہ میں مبتلا ہو جائے گا اور اگر نیچے نگاہ کر کے چلو گے، تو محفوظ رہو گے۔

## نگاہ کی حفاظت کیلئے نگاہ نیچے رکھنے کا حکم کیوں؟

حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے شیطان کو راندۂ درگاہ کیا، تو شیطان نے قسم کھا کر کہا، آپ مجھے راندۂ درگاہ کررہے ہیں، تو اب میں انسان کے پاس بہکانے کے لیے دائیں طرف سے آؤں گا، بائیں طرف سے آؤں گا، آگے سے آؤں گا، پیچھے سے آؤں گا، شیطان کی چار سمتوں کو تو بیان کر دیا، لیکن دو سمت بھول گیا، ایک اوپر کی سمت اور ایک نیچے کی سمت، اس کا مطلب یہ ہے کہ اوپر اور نیچے کی سمت شیطان کی پہنچ سے محفوظ ہے، اگر اپنی نگاہ کو دائیں کرو گے، تو شیطان بہکا سکتا ہے، بائیں طرف کرو گے، تو بھی شیطان بہکا سکتا ہے، سامنے اور پیچھے کرو گے، تو بھی شیطان آ کر بہکا سکتا ہے، لیکن اگر اوپر یا نیچے کرو گے تو شیطان نہیں بہکا سکتا، البتہ اگر نگاہ اوپر کر کے چلو گے تو گرو گے لہذا ایک ہی راستہ ہے کہ نگاہ نیچے کر کے چلو، تو شیطان کے تصرفات سے انشاء اللہ محفوظ رہو گے۔

یہ مجاہدہ ہو رہا ہے، اس میں مقصود تو یہ ہے کہ نامحرم پر لذت لینے کی غرض سے نگاہ ڈالنے سے بچنا، لیکن پہرہ پہلے بٹھا دیا کہ نیچے دیکھو، دائیں بائیں نہ دیکھو، یہ مجاہدہ ہے، اس مجاہدہ کے بعد جب انسان اس بات کا عادی ہو جائے گا کہ اس کی نگاہ غیر محرم پر پڑے گی ہی نہیں اور اگر کسی وقت پڑے گی تو فوراً ہٹالی جائے گی، تو ایسی صورت میں پھر دائیں اور بائیں طرف دیکھنے میں کچھ مضائقہ نہیں، سب کچھ دیکھو، اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو دیکھنا حلال کیا ہے، وہ سب دیکھنا جائز ہے، بہر حال بعض اوقات حرام سے بچنے کے لیے حلال کو چھوڑنا پڑ جاتا ہے، اسی کا نام مجاہدہ ہے۔

### مجاہدات کا نتیجہ اور فائدہ:

ان مجاہدات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے باطن میں جو ''خلق رذیل'' ہے، وہ مہذب ہو جاتا ہے، مثلاً اگر مال کی محبت تھی، لیکن مجاہدہ کے نتیجے میں وہ محبت مہذب ہوگئی، دنیا کی

محبت تھی، لیکن مجاہدہ کے نتیجے میں مہذب ہوگئی، شہوت تھی مگر مجاہدہ کے نتیجے میں مہذب ہوگئی، غصہ تھا مگر مجاہدہ کے نتیجے میں مہذب ہوگیا، اب جب ان رذائل کی تہذیب ہوگئی، تو اسی کا نام ''ریاضت'' ہے۔

## رزائل کی تہذیب کے بعد ہمہ وقت دھیان ضروری ہے:

لیکن ان ''رذائل'' کے مہذب ہونے کے باوجود ان کی دیکھ بھال ہر وقت ضروری ہے، یہ نہ ہو کہ بس ایک مرتبہ ان کو مہذب بنا کر فارغ ہو گئے، تو اب چھٹی ہوگئی، نہیں، اس کی چھٹی نہیں ہوتی، آخر دم تک چھٹی نہیں ہوتی، میرے والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ جنم روگ ہے، زندگی بھر کی بیماری ہے کہ آدمی ہر وقت اس بات کا دھیان رکھے کہ کہیں کوئی کام غلط تو نہیں ہو رہا ہے؟ کہیں گڑبڑ تو نہیں ہو رہی ہے؟ کیونکہ مجاہدہ کے نتیجے میں یہ رذائل فنا نہیں ہوتے بلکہ کمزور پڑ جاتے ہیں، کسی وقت بھی ان کے اندر جان آ جائے، تو انسان کو گناہ کے اندر مبتلا کر دے، اس لیے ہر وقت دھیان رکھنا پڑتا ہے، چنانچہ مولانا رومی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

اندریں راہ می تراش و می خراش<br>
تا دم آخر دمے فارغ مباش

یعنی اس راستے میں ہر وقت تراش خراش کرنی پڑتی ہے، آخر دم تک ایک لمحے کے لیے بھی فارغ ہو کر نہیں بیٹھنا۔



## جب جب بیماری آتی جائے علاج کراتے رہو:

آگے حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ:

> ''مادہ کا استیصال جب تک نہ ہو، تجدید معالجہ کی ضرورت رہے گی اور استیصال کی تدبیر نہیں'' (انفاس عیسیٰ ۱۳۸)

اگر کسی چیز کا مادہ بالکل ختم نہ ہو، تو وہ مادہ کسی بھی وقت اپنا اثر دکھا سکتا ہے، اس لیے علاج معالجے کی تجدید کرنے کی ضرورت پڑتی رہتی ہے، یہ مت سمجھو کہ جب ہم شیخ کے پاس گئے ہیں، اس نے مجاہدات کرائے، اصلاح کی، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے

حالات بہتر ہوگئے، برائیوں کی طرف رغبت اتنی زیادہ نہ رہی اور برائیوں سے بچنے کا اہتمام ہوگیا، لیکن یہ نہیں ہے کہ اب دوبارہ برائیوں کی طرف عود ہی نہیں ہوگا، بلکہ دوبارہ عود ہوسکتا ہے، چنانچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس کو اس مثال سے سمجھا رہے ہیں کہ

''موسمی بخار کا نسخہ پینے کے بعد کیا پھر آئندہ فصل (موسم) میں بخار نہ ہوگا؟ وہ کونسی تدبیر ہے کہ صفراء ہی پیدا نہ ہو اور اگر ایسا کیا جائے گا تو بہت منافع جو خلط صفراء سے متعلق ہیں وہ فوت ہوجائیں گے، اسی طرح مادہ شہوانی میں بہت منافع ہیں۔''

یعنی تمہیں جب موسمی بخار آیا، تو تم ڈاکٹر کے پاس گئے، اس نے تمہیں نسخہ لکھ دیا کہ یہ نسخہ استعمال کرو، تم نے وہ نسخہ استعمال کرلیا اور تمہارا بخار اتر گیا، لیکن کیا اس بات کی کوئی گارنٹی ہے کہ وہ بخار دوبارہ نہیں آئے گا؟ کوئی ڈاکٹر، کوئی حکیم اس کی گارنٹی دے سکتا ہے کہ ایک دفعہ علاج کے بعد آئندہ بخار نہیں آئے گا؟ ڈاکٹر نے بس اتنا کام کردیا کہ جو تمہارا بخار اس وقت موجود تھا، اس کا علاج کردیا، اب آئندہ بخار نہ آئے، اس کے لیے خود تمہیں کچھ احتیاط اور پرہیز کرنا پڑے گا اور اس احتیاط اور پرہیز کے باوجود پھر بھی بخار آجائے، تو کچھ بعید نہیں، لیکن جب دوبارہ بخار آجائے، تو دوبارہ ڈاکٹر کے پاس چلے جاؤ اور اس سے کہو کہ یہ پھر بخار آگیا ہے، دوا دے دیں، وہ پھر دوا دے دے گا، دوا پینے کے بعد پھر ٹھیک ہوجاؤ گے۔

اسی طرح شیخ کے پاس جاکر اپنے کسی رذیلے کا علاج کرایا اور علاج ہوگیا اور وہ رذیلہ زائل ہوگیا تو اب یہ مت سمجھو کہ چھٹی ہوگئی اور اب وہ رذیلہ کبھی دوبارہ نہیں لوٹے گا، وہ دوبارہ لوٹ سکتا ہے، لہٰذا جب وہ رذیلہ دوبارہ لوٹے، تو دوبارہ شیخ کے پاس چلے جاؤ، اور علاج کرالو۔

## اخلاقِ رذیلہ کی صفائی بار بار کرتے رہو:

ایک مرتبہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے عرض کیا کہ حضرت یہ عجیب معاملہ ہے کہ جب تک آپ کی خدمت میں اور آپ کی صحبت میں رہتے ہیں، تو طبیعت میں بڑی پاکیزگی اور صفائی محسوس ہوتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ اخلاقِ رذیلہ کچلے جاچکے ہیں اور گناہوں سے نفرت محسوس ہوتی ہے اور نیکیوں کی طرف رغبت محسوس ہوتی ہے، لیکن جب واپس اپنے گھر جاتے ہیں، تو پھر وہی گناہوں کے تقاضے اور خواہشات پھر شروع ہوجاتی

ہیں، اس کا کیا کریں؟

جواب میں حضرت نے فرمایا کہ اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ میں تو دھوبی ہوں، جب تمہارے کپڑے میلے ہو جائیں، یہاں اٹھا کر لے آؤ، میں دھو دوں گا، لیکن جب ایک مرتبہ کپڑے دھل گئے، تو کوئی دھوبی اس بات کی گارنٹی نہیں دیتا، کہ یہ کپڑے آئندہ میلے نہیں ہوں گے، دھوبی نے کپڑے دھو دیئے اور صاف ستھرے کر کے تمہیں دے دیئے، کہ ان کو پہن لو، اب ہفتہ، دس دن کے بعد جب دوبارہ میلے ہو جائیں، پھر دھوبی کو دے دو، وہ پھر دھو دے گا۔

لہذا یہ نہ سمجھو کہ بات ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی، بلکہ تجدید معالجہ کی ضرورت رہتی ہے، یعنی بار بار رجوع کرنے اور علاج کرنے کی ضرورت رہتی ہے اور یہ جتنے مشائخ ہوتے ہیں جن کو بیعت کرنے کی اجازت دے دی جاتی ہے، ان کے بارے میں یہ مت سمجھو کہ وہ ایسے کامل ہو گئے کہ اب ان سے کوئی غلطی نہیں ہوگی اور وہ خطا سے معصوم ہو گئے یا اب ان کے اندر گناہ کا تقاضا پیدا نہیں ہوگا، بلکہ ان کے اندر بھی گناہوں کے تقاضے پیدا ہوتے ہیں، ان سے بھی غلطیاں ہوتی ہیں، لیکن چونکہ نفس کے اندر ایک صلاحیت پیدا ہو گئی ہے اور اخلاق کی تہذیب ہو گئی ہے، اس لیے فوراً تنبہ ہو جاتا ہے اور اس تنبہ کے بعد خود ان کو بھی اپنا معالجہ کرنا پڑتا ہے، خود حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب میں اپنے اندر ایسی کوئی بیماری دیکھتا ہوں، تو اس کا خود سے علاج کرتا ہوں۔

لیکن چونکہ ان حضرات کی طبیعت، ان کا مزاج، ان کے اخلاق مزکی اور مجلی ہو چکے ہوتے ہیں، اس لیے خود ہی بیماری کو پہچان لیتے ہیں اور خود ہی علاج کر لیتے ہیں، بخلاف ہم جیسے ایک عام آدمی کے، ہمیں علاج کے لیے معالج کے پاس جانے کی ضرورت پڑتی ہے، ان کے پاس جا کر اپنے حالات بیان کرنے کی اور ان سے ہدایات لینے کی ضرورت پڑتی ہے، لہذا علاج معالجہ آخر دم تک جاری رہتا ہے، بڑے بڑے اولیاء کرام کو بھی یہی حالت پیش آتی ہے۔

## انسان کی فرشتوں پر فضیلت کی اصل وجہ:

اگر انسان کے اندر گناہ کرنے کے جذبے اور تقاضے نہ ہوتے، تو پھر تم میں اور فرشتے

میں کیا فرق رہ جاتا؟ فرشتے کے اندر یہ تقاضے موجود نہیں، نہ ان کے اندر غضب ہے، نہ ان کے اندر شہوت ہے، نہ ان میں خواہشات نفس ہیں، نہ ان کے اندر بھوک پیاس ہے، کچھ بھی نہیں ہے، اب اگر تمہارے اندر سے بھی یہ چیزیں ختم ہو جائیں، تو تم فرشتے بن گئے، اب تمہاری ان پر کوئی فضیلت نہیں رہی، تمہاری فضیلت اسی وجہ سے ہے کہ تمہارے اندر اچھائی کے ساتھ برائی کا مادہ رکھا گیا ہے اور اس برائی کے مادے کے مقابلے کی وجہ سے تم فرشتوں سے آگے بڑھ جاتے ہو۔

معصوم تھا نہ وقف سجود و دعا تھا میں
خوبی میری یہی تھی کہ اہل خطا تھا میں

فرشتے معصوم بھی ہیں اور وقف سجود و دعا بھی ہیں اور انسان کی خوبی یہی ہے کہ اس کے اندر خطا کرنے اور گناہ کرنے کا مادہ موجود ہے، اس کے بعد وہ اس مادے سے مقابلہ کر کے اللہ کے لیے گناہ سے بچتا رہے، یہ خوبی خود یہ چاہتی ہے کہ مادہ موجود رہے اور جب یہ مادہ رہے گا تو کشاکشی بھی رہے گی، البتہ یہ ہوگا کہ شروع میں یہ کشاکشی بہت زور کی ہوتی ہے اور مجاہدوں کے بعد ہلکی ہو جاتی ہے، لیکن یہ ہلکی ہلکی کشاکشی آخر دم تک باقی رہے گی اور اس کشاکشی سے نہ تو گھبراؤ اور نہ مایوس ہو اور نہ اس سے غافل ہو کر بیٹھو۔

خلاصہ یہ ہے کہ مجاہدہ کے ذریعہ اپنے نفس کے تقاضوں کو کچلنا تا کہ وہ اعتدال پر آجائیں اور کسی ناجائز کام پر آمادہ نہ کریں، یہ کام مرتے دم تک جاری رہنا ہے، فرق اتنا ہے کہ پہلے زیادہ کشاکشی ہوتی تھی، بعد میں کم ہوتی چلے جائے گی۔

## حضرت تھانوی کا تجویز کردہ تمام اخلاق رذیلہ کا بہترین علاج:

فرمایا:

> ”تمام اخلاق رذیلہ کا علاج تامل اور تحمل ہے یعنی جو کام کرے سوچ کر کرے کہ شرعا جائز ہے یا نہیں اور جلدی نہ کرے بلکہ تحمل سے کیا کرے۔“ (انفاس عیسیٰ ص ۱۳۸)

اس ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انسان اخلاق رذیلہ کے علاج کے لیے دو کام کرے:

۱)...... ایک تامل۔ ۲)......دوسرے تحمل۔

تامل کا مطلب یہ ہے کہ جو کام کرے، غور کرے اور سوچ کر کرے کہ جو کام کر رہا ہوں، شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اور جو بات میں کہہ رہا ہوں یہ جائز ہے یا ناجائز؟ اگر تامل کے نتیجے میں پتہ چلا کہ جس کام کا میں نے ارادہ کیا ہے، وہ ناجائز ہے اور ناجائز ہونے کے باوجود نفس اس کی طرف مائل ہو رہا ہے، تو پھر اب تحمل سے کام کرے یعنی اس کام کو چھوڑنے پر جو مشقت ہو رہی ہو، اس کو برداشت کرے، اگر انسان یہ دو کام کرتا رہے، تو تمام رذائل قابو میں آجائیں گے۔

## رزائل کو چھوڑنا ہماری طاقت سے باہر نہیں:

اس بیان کا مقصد یہ نہیں ہے کہ یہ بہت مشکل راستہ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جس کام کا ہمیں اور آپ کو مکلف کیا ہے، وہ کبھی ہماری برداشت سے باہر نہیں ہو سکتا، لہٰذا گناہوں سے بچنے کی فکر، سوچ اور اس پر آنے والی تکلیف کو برداشت کرنا شروع کر دو، یہ کام کرتے کرتے کبھی پھسل بھی جاؤ گے، کبھی غلطی بھی ہو جائے گی اور تمہارے اور نفس کے درمیان کشا کشی ہوتی رہے گی اور تمہارے اور شیطان کے درمیان ایک دوسرے سے کشتی چلتی رہے گی، کبھی شیطان اور نفس تمہیں چت کر دے گا اور کبھی تم اس کو چت کر دو گے، جب تم اس کو چت کر دو، تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اور کہو "الحمد للہ" اور اگر وہ تمہیں چت کر دے، تو استغفار کرو اور کہو "استغفر اللہ" پھر کچھ عرصہ کے بعد یہ ہوگا کہ تم اس کو زیادہ چت کرو گے اور وہ تمہیں کم چت کرے گا، تم زیادہ غالب رہو گے۔ قرآن کریم کی یہ آیت

﴿ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ﴾

سے بھی یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔

## اصلاح نفس کا حال بچہ کی بڑوتری کی طرح ہے:

ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ آپ نے چھوٹے بچے کو دیکھا، وہ کس طرح بڑا ہو جاتا ہے؟ اور پتہ بھی نہیں چلتا کہ وہ کس طرح بڑا ہو رہا ہے؟ اگر وہ بچہ روزانہ اپنے آپ کو ناپے اور یہ دیکھے کہ میں آج کتنے انچ بڑا ہوا ہوں، تو اس کو یہ نظر آئے گا کہ میں تو بڑا ہی نہیں ہوا، جیسا کل تھا ویسا ہی آج ہوں، اگلے دن پھر ناپتا ہے کہ اب میں کتنا بڑا ہوا تو پھر ویسا کا

ویسا ہی پاتا ہے، لیکن حقیقت میں بڑھوتری ہورہی ہے اور بڑا ہورہا ہے، لیکن وہ بڑھوتری غیر محسوس ہے اور ہوتے ہوتے وہ بالغ اور جوان ہوگیا اور ڈاڑھی نکل آئی اور پورا آدمی بن گیا۔ اسی طرح جب آدمی اس راستے پر چلتا ہے بشرطیکہ اخلاص کے ساتھ چلے اور لگا رہے، چھوڑے نہیں اور غافل نہ ہو، تو دھیرے دھیرے اس کی ترقی ہوتی رہتی ہے۔

اور یہ بتدریج ترقی ہی بہتر ہے، کیونکہ اگر ایک آدمی ایک دم سے اپنے اندر ایسا انقلاب لے آئے، جس کے نتیجے میں اس کی طرف انگلیاں اٹھنے لگیں کہ فلاں آدمی کیا سے کیا بن گیا، یہ بعض اوقات فتنے کی نشانی ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے وہ فتنے میں مبتلا ہوجاتا ہے، اس لیے تدریج کے ساتھ، دھیرے دھیرے جو انقلاب آتا ہے اسی میں بہتری ہے، اسی میں خیر ہے اور اسی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے برکت ہوتی ہے۔

لہذا مایوس ہوکر مت بیٹھو، لگے رہو، اس راستے پر چلتے رہو، نفس و شیطان کے ساتھ لڑائی لڑتے رہو، یہاں تک کہ تم کامیاب ہوجاؤ گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ

﴿ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴾

اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

باب اول کا چھٹا بیان:

# مجاہدہ کی ضرورت واہمیت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَ نُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَ نَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا. اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (سورہ العنکبوت. ۶۹)

آمَنْتُ بِاللّٰهِ صَدَقَ اللّٰهُ مَوْلَانَا الْعَظِيْمُ وَصَدَقَ رَسُوْلُهُ النَّبِيُّ الْكَرِيْمُ وَنَحْنُ عَلٰى ذٰلِكَ لَمِنَ الشَّاهِدِيْنَ وَالشَّاكِرِيْنَ . وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

گزشتہ (صفحات میں) مجاہدہ سے متعلق جو گذارشات کی تھیں، ان کا خلاصہ یہ تھا کہ ''مجاہدہ'' کے معنی یہ ہیں کہ نفسانی خواہشات کا مقابلہ کرکے اللہ جل شانہ کے حکم کے مطابق چلنے کی فکر کرنا، یہ مجاہدہ ہے۔ اب اس کی مزید تفصیل عرض کرنی ہے، تاکہ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے کہ مجاہدہ کیوں کرنا پڑتا ہے؟ اس کی کیا ضرورت ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟

## دنیا کا کام ہو یا دین کا، مجاہدہ کے بغیر ناممکن ہے:

دین کا کام ''مجاہدہ'' کے بغیر نہیں چلتا، بلکہ دنیا کے کام بھی مجاہدے کے بغیر نہیں ہو سکتے، اگر کوئی شخص روزی حاصل کرنا چاہتا ہے، تو اس کے لیے اس کو بھاگ دوڑ کرنی پڑتی ہے، اس کے لیے اپنے نفس کے تقاضوں کو کچلنا پڑتا ہے، اس لیے کہ نفس کا تقاضہ تو یہ ہے کہ آرام سے گھر میں پڑا سوتا رہے، لیکن وہ یہ سوچتا ہے کہ اگر میں سوتا رہ گیا تو روزی کیسے کماؤں گا؟

## طبیعت کے خلاف کام کرنا مجاہدہ ہے:

بچپن ہی سے بچے کو مجاہدے کی عادت ڈالنی پڑتی ہے، بچے کو جب شروع شروع میں پڑھنے کے لیے بھیجا جاتا ہے، تو اس کی طبیعت کے خلاف ہوتا ہے، پڑھنے کے لیے جانے کو اس کا دل نہیں چاہتا، لیکن اس کو اس کی طبیعت کے خلاف پڑھنے پر آمادہ کیا جاتا ہے، یہ مجاہدہ ہے، لہٰذا تعلیم حاصل کرنے کے لیے، روزی کمانے کے لیے، بلکہ دنیا کے تمام مقاصد کے لیے انسان کو اپنی طبیعت کے خلاف کرنا پڑتا ہے، اگر انسان یہ سوچے کہ میں اپنی طبیعت کے خلاف کوئی کام نہیں کروں گا، ایسا شخص نہ دنیا کا کوئی مقصد حاصل کرسکتا ہے اور نہ دین کا مقصد حاصل کرسکتا ہے۔

## عالم جنت میں مجاہدہ نہیں، خواہش کی تکمیل ہی تکمیل ہے:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کائنات میں تین عالم پیدا فرمائے ہیں:

۱)...... ایک عالم وہ ہے جس میں آپ کی ہر خواہش پوری ہوگی، اس میں خواہش کے خلاف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، جو دل چاہے گا، وہ ہوگا، اس میں انسان نفس کے خواہش کے مطابق کرنے کے لیے آزاد ہوگا، اس کو اس کے مواقع میسر ہوں گے، وہ عالم ''جنت'' ہے۔ اس کے بارے میں قرآن کریم نے فرمایا ہے کہ

﴿وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيَ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُوْنَ﴾ (حم سجدہ)

یعنی جو تمہارا دل چاہے گا، وہ ملے گا اور جو مانگو گے، وہ ملے گا، بعض روایات میں یہ تفصیل آئی ہے کہ مثلاً بیٹھے بیٹھے یہ دل چاہا کہ انار کا جوس پی لوں، اب صورت حال یہ ہے کہ قریب میں نہ تو انار ہے، نہ انار کا درخت اور نہ جوس نکالنے والا ہے، لیکن یہ ہوگا کہ جس وقت تمہارے دل میں اس کے پینے کا خیال آئے گا، اسی وقت اللہ تعالیٰ کی قدرت سے انار کا جوس نکل کر تمہارے پاس پہنچ جائے گا، اللہ تبارک تعالیٰ اپنے بندوں کو یہ قدرت عطا فرمائیں گے کہ جس چیز کا دل چاہے گا، وہ ملے گا، وہاں پر تمہیں کسی خواہش کو کچلنے کی ضرورت نہیں ہوگی، کسی تقاضے کو دبانے کی ضرورت نہیں ہوگی، کسی خواہش کے خلاف کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی، کسی مجاہدے کی ضرورت نہیں ہوگی، یہ عالم جنت ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی

رحمت سے وہ عالم عطا فرمادے۔آمین

## عالم جہنم میں تکلیف ہی تکلیف ہوگی:

۲)......دوسرا عالم اس کے بالکل برعکس ہے، وہاں ہر کام طبیعت کے خلاف ہوگا، ہر کام دکھ دینے والا ہوگا، ہر کام غم میں مبتلا کرنے والا ہوگا، ہر کام میں تکلیف اور مصیبت ہوگی، کوئی آرام، کوئی راحت اور کوئی خوشی نہیں ہوگی، وہ عالم دوزخ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے۔آمین

## عالم دنیا میں مجاہدہ بھی ہے اور خواہش کی تکمیل بھی:

۳)......تیسرا عالم وہ ہے، جس میں طبیعت کے مطابق بھی کام ہوتے ہیں اور طبیعت کے خلاف بھی کام ہوتے ہیں، خوشی بھی حاصل ہوتی ہے، غم بھی آتا ہے، تکلیف بھی پہنچتی ہے، راحت بھی ملتی ہے، اس عالم میں کسی کی کوئی تکلیف خالص نہیں، کوئی راحت خالص نہیں، ہر راحت میں تکلیف کا کوئی کانٹا لگا ہوا ہے اور ہر تکلیف میں راحت کا پہلو بھی ہے یہ عالم دنیا ہے، اس دنیا میں آپ بڑے بڑے سرمایہ دار، بڑے سے بڑے دولتمند، بڑے سے بڑے صاحب وسائل سے پوچھ لیجئے کہ تمہیں کبھی کوئی تکلیف پہنچی ہے یا نہیں؟ یا تم ساری عمر آرام اور اطمینان سے رہے؟ کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں ملے گا جو یہ کہہ دے کہ مجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچی اور کوئی کام میری طبیعت کے خلاف نہیں، اس لیے کہ یہ عالم دنیا ہے، جنت نہیں ہے، یہاں راحت بھی پہنچے گی، تکلیف بھی پہنچے گی، یہ دنیا تو اسی کام کے لیے بنائی گئی ہے، کوئی شخص یہ چاہے کہ مجھے راحت ہی راحت ملے، کبھی تکلیف نہ ہو، تو ایسا کبھی زندگی بھر نہیں ہوسکتا، ایک شاعر نے کہا کہ

قید حیات بند و غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

لہذا یہ دنیا اللہ تبارک تعالیٰ نے اسی کام کے لیے بنائی ہے کہ اس میں تمہارے دل کو راحتیں بھی ملیں گی اور اس کو توڑنے والے اسباب اور حالات بھی پیدا ہوں گے، اس لیے جیتے جی مرتے دم تک غم سے نجات ممکن نہیں اور تو اور انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام جو اس

کائنات میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہوتے ہیں، ان کو بھی تکلیفیں پیش آئیں بلکہ بسا اوقات عام لوگوں سے زیادہ پیش آئیں، ان کو بھی طبیعت کے خلاف واقعات پیش آئے، اس دنیا کے اندر کوئی انسان بھی ان سے بچ نہیں سکتا۔ اگر انسان کافر بن کر رہے، تب بھی طبیعت کے خلاف ہوگا، اگر مومن بن کر رہے، تب بھی طبیعت کے خلاف ہوگا، اللہ کا انکار کرے تب بھی طبیعت کے خلاف ہوگا۔

## اللہ کی رضا کیلئے طبیعت کے خلاف کام کرو:

لہذا جب اس دنیا میں طبیعت کے خلاف باتیں پیش آنی ہی ہیں، تو پھر طبیعت کے خلاف کام کرنے کے دو طریقے ہیں:

۱)...... ایک طریقہ تو یہ ہے کہ طبیعت کے خلاف کام بھی کرو، صدمے بھی اٹھاؤ، تکلیفیں بھی برداشت کرو، لیکن ان تکلیفوں کے بدلے میں آخرت میں کوئی نتیجہ نہ نکلے، اس غم سے آخرت میں کوئی فائدہ نہ ہو، اللہ تعالیٰ اس سے راضی نہ ہو۔

۲)...... دوسرا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنی طبیعت کے خلاف کام کرے، نفس کے تقاضے کو کچلے، تاکہ آخرت سنور جائے اور اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو جائے، چنانچہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت یہ ہے کہ اس دنیا میں طبیعت کے خلاف تو ہونا ہی ہے، تمہارا دل چاہے یا نہ چاہے، لیکن ایک مرتبہ یہ عہد کرلو کہ طبیعت کے خلاف وہ کام کریں گے، جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوگا۔

مثلاً نماز کا وقت ہوگیا، مسجد سے پکار آرہی، لیکن جانے کو دل نہیں چاہ رہا اور سستی ہورہی ہے، تو اب ایک راستہ یہ ہے کہ دل کے چاہنے پر عمل کرلیا اور بستر پر لیٹے رہے اور اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی، معلوم ہوا کہ دروازے پر ایک ایسا آدمی آگیا ہے جس کے لیے نکلنا ضروری ہے، چنانچہ اس کی خاطر بستر چھوڑا اور باہر نکل گئے نتیجہ یہ نکلا کہ طبیعت کے خلاف بھی ہوا، خواہش کے خلاف بھی ہوا، اور آرام بھی نہ ملا، تکلیف جوں کی توں رہی، لہذا! آدمی یہ سوچے کہ تکلیف سے بچنا تو میرے قبضہ اور قدرت میں نہیں ہے، اس لیے کیوں نہ میں اللہ کو راضی کرنے کے لیے تکلیف برداشت کرلوں، یہ سوچ کر اس وقت اٹھ کر نماز کے لیے چلا جائے۔

## دین کے کام میں سستی کو چستی سے بدلنے کا نسخہ کیمیا:

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب قدس اللہ سرہ ہمارے لیے بڑی کارآمد باتیں فرمایا کرتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ بھئی اگر تمہیں نماز کے لیے جانے میں سستی ہورہی ہے یا کسی دین کے کام میں سستی ہورہی ہو، مثلاً فجر کی نماز کے لیے یا تہجد کی نماز کے لیے سستی ہورہی ہے، آنکھ تو کھل گئی، مگر نیند کا غلبہ ہے، بستر چھوڑنے کو دل نہیں چاہ رہا ہے، تو اس وقت ذرا یہ سوچو کہ اس نیند کے غلبے کے عالم میں اگر تمہارے پاس یہ پیغام آجائے کہ سربراہ مملکت تمہیں بہت بڑا انعام دینا چاہتے ہیں اور وہ اعزاز اسی وقت تمہیں ملے گا، تو یہ بتاؤ کہ اس وقت وہ نینداور سستی باقی رہے گی؟ ظاہر ہے کہ وہ نینداور سستی سب غائب ہوجائے گی، کیوں؟ اس لیے کہ تمہارے دل میں اس اعزاز کی قدرومنزلت ہے، جس کی وجہ سے تم طبیعت کے خلاف کرنے پر آمادہ ہوجاؤ گے اور یہ سوچو گے کہ کہاں کی غفلت کہاں کی نینداس اعزاز کو حاصل کرنے کے لیے دوڑ جاؤ، اگر یہ موقع نکل گیا، تو پھر ہاتھ آنے والا نہیں، چنانچہ اس کام کے لیے نینداور آرام چھوڑ کر فوراً نکل کھڑے ہوگے، لہذا جب تم ایک دنیا کے بادشاہ سے اعزاز حاصل کرنے کیلئے نیند چھوڑ سکتے ہو اور اپنی راحت چھوڑ سکتے ہو، تو پھر اللہ جل جلالہ اور احکم الحاکمین کو راضی کرنے کے لیے راحت اور نیند نہیں چھوڑ سکتے، جب کسی نہ کسی وجہ سے راحت اور نیند چھوڑنی ہے، تو پھر کیوں نہ اللہ کو راضی کرنے کے لیے راحت وآرام چھوڑا جائے؟

## اللہ کی خاطر نفس کے خلاف کام کرنے والوں کا مقام:

حضرات انبیاء علیہم السلام کا یہی پیغام ہے کہ اپنے نفس کو طبیعت کے خلاف ایسے کام کرنے کی عادت ڈالو، جو اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے والے ہوں، اسی کا نام مجاہدہ ہے، جو صدمے اور جو تکلیفیں غیر اختیاری طور پر پہنچ رہی ہیں، بظاہر ان سے کوئی فائدہ نہیں ہورہا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جو لوگ ہماری خاطر یہ مجاہدہ کریں گے، ہماری خاطر نفس کے خلاف کام کریں گے، تو ہم ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے راستے پر لے چلیں گے:

﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾.

اور وہ راستہ پر تنہا نہیں ہوں گے، بلکہ جو شخص اس راستے پر چل رہا ہے وہ محسنین میں سے ہے اور اللہ تبارک تعالیٰ محسنین کا ساتھی بن جاتا ہے۔

## اللہ تبارک وتعالیٰ کیسے ان کا ساتھی بن جاتا ہے؟

اللہ تبارک وتعالیٰ کیسے ان کا ساتھی بن جاتا ہے؟ اس طرح کہ شروع میں نفس کی مخالفت میں بڑی دشواری معلوم ہو رہی تھی، طبیعت کے خلاف کرنا بڑا مشکل معلوم ہو رہا تھا، لیکن جب اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر، اللہ کو راضی کرنے کے لیے چل کھڑے ہوئے، تو پھر وہی راستہ اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے آسان کر دیتے ہیں، مثلاً ایک شخص کو نماز کی عادت نہیں ہے، نماز پڑھنا بھاری معلوم ہوتا ہے، پانچ وقت کی نماز پڑھنا مشکل لگتا ہے، لیکن اس نے نفس کے اس تقاضے کے باوجود نماز پڑھنی شروع کر دی، یہاں تک کہ نماز کا عادی بن گیا، اب عادی بننے کے بعد اسی شخص کی یہ حالت ہو جاتی ہے، کہ نماز پڑھنے میں کوئی مشقت ہی نہیں ہے، بلکہ اس سے اگر کوئی یہ کہے کہ ہزار روپے لے لو اور آج کی نماز چھوڑ دو، بتاؤ کیا وہ شخص نماز چھوڑنے پر راضی ہوگا؟ ہرگز نہیں، جو شخص ایک مرتبہ نماز کا عادی بن جاتا ہے، وہ کبھی ہزاروں روپے لے کر بھی ایک نماز چھوڑنے پر راضی نہیں ہوگا، اس لیے کہ جس کام کو پہلے وہ مشکل سمجھ رہا تھا تھوڑے سے عرصے میں اللہ تبارک تعالیٰ نے اس کو آسان کر دیا۔

## مشکل سمجھ کر مت بیٹھ جاؤ، اللہ کے بھروسے پر قدم بڑھاؤ:

یہی حال پورے دین کا ہے، اگر انسان بیٹھ کر سوچتا رہے، تو اس کو مشکل نظر آئے گا، لیکن جب دین کے راستے پر چلنا شروع کر دے، تو اللہ تبارک تعالیٰ اسے آسان فرما دیتے ہیں، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس کی یہ مثال دیا کرتے تھے کہ ایک لمبی سڑک سیدھی جا رہی ہو اور اس کے دونوں طرف درختوں کی قطاریں ہوں، دائیں طرف بھی اور بائیں طرف بھی، اگر اب کوئی شخص اس سڑک پر کھڑا ہو کر دیکھے، تو اس کو یہ نظر آئے گا کہ درختوں کی دونوں قطاریں آپس میں آگے جا کر مل گئی ہیں اور آگے راستہ بند ہے، اگر کوئی احمق شخص یہ کہے کہ چونکہ آگے چل کر درختوں کی قطاریں آپس میں مل گئی ہیں، اس لیے اس سڑک پر چلنا بے کار

ہے، تو یہ شخص کبھی راستہ قطع نہیں کر سکے گا اور کبھی منزل تک نہیں پہنچ سکے گا، وہی شخص منزل تک پہنچ سکے گا جو راستہ کو بند دیکھنے کے باوجود آگے قدم بڑھائے گا، اس لیے کہ جب وہ آگے قدم بڑھائے گا تو اسے نظر آئے گا کہ حقیقت میں راستہ بند نہیں تھا، بلکہ آنکھیں دھوکہ دے رہی تھیں، جوں جوں وہ آگے بڑھتا جائے گا راستے کھلتے چلے جائیں گے، اس لیے دین کے راستے پر چلنے والوں سے اللہ تبارک تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ دور دور سے مشکل سمجھ کر مت بیٹھ جاؤ، اللہ کے بھروسے پر آگے قدم بڑھانا شروع کردو، جب آگے قدم بڑھاؤ گے، تو اللہ تعالیٰ تمہارے لیے راستہ آسان فرمادیں گے، البتہ ہمت سے کام کرنے کی ضرورت ہمیشہ رہے گی اور طبیعت کے خلاف کام کرنے کا عزم کرنا پڑے گا، اسی کا نام مجاہدہ ہے۔

## نفس کو مباح اور جائز کاموں سے روکنا بھی مجاہدہ ہے:

اصل مجاہدہ تو یہ ہے کہ انسان جو ناجائز اور شریعت کے خلاف کام کر رہا ہے، ان سے اپنے آپ کو بچائے اور اپنے نفس پر زبردستی دباؤ ڈال کر ان سے باز رہے، لیکن چونکہ ہمارا نفس لذتوں کا، خواہشات کا اور راحتوں کا عادی ہو چکا ہے اور اتنا زیادہ عادی بنا ہوا ہے کہ اگر اس کو اللہ کے راستے کی طرف اور شریعت کی طرف موڑنا چاہو، تو آسانی سے نہیں مڑتا، بلکہ دشواری پیدا ہوتی ہے، اس لیے اس نفس کو رام کرنے کے لیے اور اللہ کے بتائے ہوئے احکام کے تابع بنانے کے لیے اس کو بعض مباح اور جائز کاموں سے بھی روکنا پڑتا ہے، اس لیے کہ جب نفس کو جائز کاموں سے روکیں گے، تو پھر اس کو لذتوں کے چھوڑنے کی عادت پڑے گی اور پھر اس کے لیے ناجائز امور سے بچنا بھی آسان ہو جائے گا، صوفیاء کرام کی اصطلاح میں اس کو بھی مجاہدہ کہا جاتا ہے۔ مثلاً خوب پیٹ بھر کر کھانا، کوئی گناہ نہیں، لیکن صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ خوب پیٹ بھر کر مت کھاؤ، اس لیے کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ نفس غافل ہو جائے گا اور لذتوں کا خوگر ہو جائے گا، اس لیے نفس کو عادی بنانے کے لیے کھانے میں تھوڑی سی کمی کردو، یہ بھی مجاہدہ ہے۔

## جائز اور مباح کاموں میں مجاہدہ کیوں؟

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت یہ کیا بات ہے

کہ صوفیاء کرام بعض جائز کاموں سے بھی روک دیتے ہیں اوران کو چھڑا دیتے ہیں حالانکہ اللہ تعالی نے ان کو جائز قرار دیا ہے؟ حضرت والا نے جواب میں فرمایا کہ دیکھو اس کی مثال یہ ہے کہ یہ کتاب کا ورق ہے، اس ورق کو موڑ و موڑ دیا، اچھا اس کو سیدھا کرو، اب ورق سیدھا نہیں ہوتا، بہت کوشش کر لی، لیکن وہ دوبارہ مڑ جاتا ہے، پھر آپ نے فرمایا کہ اس کو سیدھا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس ورق کو مخالف سمت میں موڑ دو، یہ سیدھا ہو جائے گا، پھر فرمایا کہ یہ نفس کا کاغذ بھی گناہوں کی طرف مڑا ہوا ہے، معصیتوں کی طرف مڑا ہوا ہے، اب اگر اس کو سیدھا کرنا چاہو گے، تو یہ سیدھا نہیں ہوگا، اس کو دوسری طرف موڑ دو اور تھوڑے سے مباحات بھی چھڑا دو، جس کے نتیجے میں یہ بالکل سیدھا ہو جائے گا اور راستے پر آ جائے گا، یہ بھی مجاہدہ ہے۔

## اہل تصوف کے چار مشہور مجاہدے:

چنانچہ صوفیاء کرام کے یہاں چار چیزوں کا مجاہدہ کرانا مشہور ہے:

۱)...... تقلیل طعام یعنی کم کھانا۔ ۲)...... تقلیل کلام یعنی کم بولنا۔

۳)...... تقلیل منام یعنی کم سونا۔ ۴)...... تقلیل الاختلاط مع الانام یعنی لوگوں سے کم ملنا

## کم کھانے کا مطلب اور اس کی حد:

تقلیل طعام یعنی کم کھانا۔ پہلے زمانے میں صوفیاء کرام کھانے پر بڑے بڑے مجاہدے کرایا کرتے تھے، یہاں تک کہ فاقہ کشی تک نوبت آ جاتی تھی، لیکن حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب قدس اللہ سرہ نے فرمایا کہ یہ زمانہ اب اس قسم کے مجاہدوں کا نہیں ہے، اب تو لوگ ویسے ہی کمزور ہیں، اگر کھانا کم کر دیں گے، تو اور بیماریاں آ جائیں گی اور اس کے نتیجے میں کہیں ایسا نہ ہو کہ پہلے جو عبادت کرتا تھا، اس سے بھی محروم ہو جائے، اس لیے فرمایا کہ آج کے دور میں انسان ایک بات کی پابندی کر لے، تو پھر تقلیل طعام کا مقصد حاصل ہو جائے گا، وہ یہ کہ جب کھانا کھانے بیٹھو، تو کھانا کھاتے وقت ایک مرحلہ ایسا آئے گا کہ اس وقت دل میں یہ تردد پیدا ہوتا ہے کہ اب مزید کھاؤں یا نہ کھاؤں؟ کچھ اور کھاؤں یا نہ کھاؤں؟ بس جس وقت یہ تردد کا مرحلہ آئے، اس وقت کھانا چھوڑ دو، اس سے تقلیل طعام کا منشا پورا ہو جائے گا۔

اور یہ تردد پیدا ہوتا ہے کہ مزید کھاؤں یا نہ کھاؤں؟ یہ عقل اور طبیعت کے درمیان لڑائی

ہوتی ہے، کیونکہ کھانا کھانے میں مزہ آرہا ہے، تو اب نفس یہ تقاضا کررہا ہے کہ اور کھانا کھا کر مزہ لے لے اور عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ اب مزید کھانا مت کھاؤ، اب مزید کھاؤ گے تو کہیں بیمار نہ پڑ جاؤ، نفس اور عقل کے درمیان یہ لڑائی ہوتی ہے اور اس لڑائی کا نام تردد ہے، لہذا ایسے موقع پر نفس کے تقاضے کو چھوڑ دو اور عقل کے تقاضے پر عمل کرلو۔

## تقلیل طعام اللہ کیلئے کروتو وزن بھی کم، اللہ بھی راضی:

یہ مضمون میں نے حضرت والد ماجد مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ سے اور حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے کئی بار سنا اور مواعظ میں بھی پڑھا، لیکن بعد میں ایک ماہر ڈاکٹر کا مضمون نظر سے گزرا جس میں لکھا تھا کہ "آج کل لوگ اپنے بدن کا وزن کم کرنے کے لیے طرح طرح کے نسخے استعمال کرتے ہیں، کسی نے روٹی چھوڑ دی، کسی نے دوپہر کا کھانا چھوڑ دیا، آج کل کی اصطلاح میں اس کو ڈائیٹنگ کہتے ہیں، یورپ میں اس کا بہت رواج ہے، یہ چیز وہاں وبا کی طرح پھیلی ہوئی ہے، اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جسم کا وزن کم ہو جائے اور خاص طور پر خواتین میں اس کا اتنا رواج ہے کہ گولیاں کھا کھا کر وزن کم کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور بعض اوقات اس میں مر بھی جاتی ہیں"۔

اس کے بعد وہ ڈاکٹر لکھتا ہے کہ میرے نزدیک وزن کم کرنے کا سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ آدمی نہ تو کسی وقت کا کھانا مستقل چھوڑے، نہ روٹی کم کرے، بلکہ ساری عمر اس کا معمول بنالے کہ جتنی بھوک ہے، اس سے تھوڑا سا کم کھا کر کھانا بند کردے، اس کے بعد اس ڈاکٹر نے بعینہ یہ بات لکھی ہے کہ جس وقت کھانا کھاتے ہوئے یہ تردد ہو جائے کہ کھانا کھاؤں یا نہ کھاؤں؟ اس وقت کھانا چھوڑ دے، جو شخص اس پر عمل کرے گا اس کو کبھی بدن بڑھنے کی اور معدے کے خراب ہونے کی شکایت نہیں ہوگی اور نہ اس کو ڈائٹنگ کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔

یہی بات حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کئی سال پہلے لکھ گئے تھے، اب چاہو تو وزن کم کرنے کی خاطر اس پر عمل کرلو، چاہو تو اللہ کو راضی کرنے کے لیے یہ عمل کرو، اگر اللہ کو راضی کرنے کے لئے یہ عمل کرو گے، تو اس کام میں اجر وثواب بھی ملے گا اور وزن بھی کم ہو جائے گا اور اگر صرف وزن کم کرنے کی خاطر کرو گے، تو شاید وزن تو کم ہو جائے گا لیکن اجر

وثواب نہیں ملے گا۔

## دور جدید میں جسمانی علاج کی طرح روحانی علاج بھی بدل سکتا ہے:

حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ نے ہمارے لیے یہ عمل کتنا آسان کر دیا، ورنہ پہلے زمانے میں تو صوفیاء کرام اللہ جانے کیا کیا ریاضتیں کرایا کرتے تھے؟ صوفیاء کرام کے یہاں لنگر ہوا کرتے تھے، اس لنگر کے اندر شوربا بنتا تھا، خانقاہ میں جو مریدین ہوا کرتے تھے، ان کو یہ حکم تھا کہ جس کے پاس ایک پیالہ شوربے کا آئے، تو وہ اس شوربے میں ایک پیالہ پانی ملائے اور پھر کھائے تاکہ نفس کو لذت گیری کی قید سے آزاد کیا جائے، اس کے علاوہ ان کو فاقے بھی کروائے جاتے تھے، لیکن وہ زمانہ اور تھا اور آج کل کا زمانہ اور ہے، جیسے طب کے اندر زمانے کے بدلنے سے علاج کے طریقے بدل جاتے ہیں، اس طرح حکیم الامت قدس اللہ سرہ ہمارے زمانے کے لحاظ سے ہمارے مزاجوں کا لحاظ رکھتے ہوئے نسخے تجویز کر گئے تقلیل طعام کا یہ نسخہ ہمارے لیے تجویز کر گئے، جس سے تقلیل طعام کا منشا حاصل ہو جائے گا۔

## پیٹ بھرا ہونا جسمانی وروحانی بیماریوں کا سبب ہے:

پورا پیٹ بھر کر اس طرح کھانا کہ اس کا کوئی حصہ خالی نہ رہے، اگرچہ فقہی اعتبار سے ناجائز نہیں، حرام نہیں، لیکن یہ انسان کے لیے جسمانی اور روحانی دونوں قسم کی بیماریوں کا سبب اور ذریعہ ہے، اس لیے کہ جتنی معصیتیں اور نافرمانیاں ہیں وہ سب بھرے ہوئے پیٹ پر سوجھتی ہیں، اگر آدمی کا پیٹ بھرا نہ ہو، تو یہ گناہ اور نافرمانیاں نہیں سوجھتیں، اس لیے حکم یہ ہے کہ شبع یعنی پیٹ بھرے ہونے سے اپنے آپ کو بچانا چاہیے، اسی کا نام تقلیل طعام کا مجاہدہ ہے۔

## کم بولنے کا مجاہدہ اور اس کا فائدہ:

دوسری چیز ہے تقلیل کلام یعنی بات کم کرنا، صبح سے شام تک یہ ہماری زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے اور اس پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے، جو منہ میں آ رہا ہے، انسان بول رہا ہے، یہ صورت حال غلط ہے، اس لیے جب تک انسان اس زبان کو لگام نہیں دے گا اور اس کو قابو میں نہیں کرے گا، اس وقت تک یہ گناہ کرتی رہے گی۔

یاد رکھئے ! حدیث شریف میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انسان کو اوندھے منہ جہنم میں ڈالنے والی چیز اس کی زبان ہے، اس لیے کہ جب زبان کو آزاد چھوڑ رکھا ہے، اس پر روک ٹوک نہیں ہے، تو پھر وہ زبان جھوٹ میں مبتلا ہوگی، غیبت میں مبتلا ہوگی ،دل آزاری میں مبتلا ہوگی، ان گناہوں کے سبب وہ جہنم میں جائے گا۔

اس لیے انسان کو تقلیل کلام کا مجاہدہ کرنا پڑتا ہے کہ بات کم کرے، زبان سے فضول بات نہ نکالے، ضرورت کے مطابق بات کرے اور بولنے سے پہلے یہ سوچ کہ یہ بات کرنا میرے لیے مناسب ہے یا نہیں؟ کہیں گناہ کی بات تو نہیں اور بلاوجہ زبان چلانے سے بچے اور پھر آہستہ آہستہ انسان کم بولنے کا عادی بن جاتا ہے، پھر یہ ہوتا ہے کہ بولنے کو دل چاہ رہا ہے، لیکن اس نے اپنی اس خواہش کو دبا دیا، تو اس کے نتیجے میں زبان پر قابو پیدا ہو جاتا ہے اور پھر وہ جھوٹ غیبت اور اس طرح کے دوسرے گناہوں میں مبتلا نہیں ہوتا۔

## جائز تفریح کی اجازت ہے مگر مروجہ گپ شپ سے بچو:

یہ جو فضول قسم کی مجلس آرائی ہوتی ہے، جس کو آجکل کی اصلاح میں گپ شپ کہا جاتا ہے، کوئی دوست مل گیا، تو فوراً اس سے کہا کہ آؤ ذرا بیٹھ کر گپ شپ کریں، یہ گپ شپ لازماً انسان کو گناہ کی طرف لے جاتی ہے، ہاں شریعت نے ہمیں تھوڑی بہت تفریح کی بھی اجازت دی ہے، نہ صرف اجازت دی ہے، بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

رَوِّحُوا الْقُلُوْبَ سَاعَةً فَسَاعَةً ۔ (کنز العمال:۵۴،۵۳)

یعنی دلوں کو تھوڑے تھوڑے وقفے سے آرام بھی دیا کرو، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر قربان جائیے کہ ہمارے مزاج، ہماری نفسیات اور ہماری ضروریات کو ان سے زیادہ پہچاننے والا اور کون ہوگا؟ وہ جانتے ہیں کہ اگر ان سے کہا گیا کہ اللہ کے ذکر کے علاوہ کچھ نہ کرو، ہر وقت ذکر اللہ میں مشغول رہو، تو ایسا نہیں کر سکیں گے، اس لیے کہ یہ فرشتے نہیں ہیں، یہ تو انسان ہیں، ان کو تھوڑے سے آرام کی بھی ضرورت ہے، تھوڑی سی تفریح کی بھی ضرورت ہے، اس لیے تفریح کے لیے کوئی بات کرنا، خوش طبعی کے ساتھ ہنس بول لینا، نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ پسندیدہ ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، لیکن اس میں زیادہ منہمک ہو جانا کہ اسی میں کئی کئی گھنٹہ برباد ہو رہے ہیں، قیمتی اوقات ضائع ہو رہے ہیں

،تو یہ چیز انسان کو لازمی طور پر گناہ کی طرف لے جانے والی ہے، اس لیے فرمایا کہ تم باتیں کم کرنے کی عادت ڈالو، یہ بھی مجاہدہ ہے۔

## مہمان سے ہنس مکھ ہو کر باتیں کرنا مسنون عمل ہے:

میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک صاحب آیا کرتے تھے، وہ باتیں بہت کرتے تھے، جب کبھی آتے، تو بس ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیتے اور رکنے کا نام بھی نہ لیتے، ہمارے سب بزرگوں کا یہ طریقہ رہا ہے کہ اگر کوئی شخص مہمان بن کر ملنے کے لیے آتا، تو اس کا اکرام کرتے، اس کی بات سنتے اور حتی الامکان اس کی تشفی کی کوشش کرتے، یہ کام ایک مصروف آدمی کے لیے بڑا مشکل ہے، جن لوگوں کی زندگی مصروفیات سے بھری ہو، وہ جان سکتے ہیں کہ یہ کتنا مشکل کام ہے، لیکن حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ جب آپ سے کوئی شخص ملنے کے لیے آتا اور آپ سے بات کرنا شروع کرتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی طرف سے کبھی منہ نہ موڑتے تھے، جب تک وہ خود ہی منہ نہ موڑے، اس کی بات سنتے رہتے تھے۔ چنانچہ حدیث کے الفاظ ہیں:

حَتّٰی یَکُوْنَ هُوَ الْمُنْصَرِفَ. (شمائل ترمذی)

حتی کہ وہ خود ہی نہ چلا جائے، یہ کام بڑا مشکل ہے، اس لیے کہ بعض لوگ لمبی بات کرنے کے عادی ہوتے ہیں، ان کی پوری بات پوری توجہ سے سننا، ایک مشکل کام ہے، لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی وجہ سے ہمارے بزرگوں کا یہ طریقہ رہا ہے کہ آنے والے کی بات سنتے اس کی تشفی کرتے۔ لیکن اگر کوئی شخص اصلاح کی غرض سے آتا تو اس پر روک ٹوک ہوتی تھی۔ بہرحال وہ صاحب اگر باتیں شروع کر دیتے اور حضرت والد صاحب مسکینیت سے اس کی باتیں سنتے رہتے، ایک دن ان صاحب نے آ کر حضرت والد صاحب سے بیعت کی درخواست کی، کہ حضرت میں آپ سے اصلاحی تعلق قائم کرنا چاہتا ہوں ،میرے لیے کوئی وظیفہ، کوئی تسبیح دیجیے، حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ تمہارے لیے کوئی تسبیح اور وظیفہ نہیں ہے، تمہارا کام یہ ہے کہ زبان کو قابو میں کرو، اس پر تالا ڈالو، تم جو ہر وقت بولتے رہتے ہو، زبان نہیں رکتی، یہ غلط ہے، آئندہ جب آؤ، تو بالکل خاموشی سے بیٹھے رہو

،زبان سے کوئی لفظ نہ نکالنا، اب اس پابندی کے نتیجے میں ان صاحب پر قیامت گزر گئی، یہ خاموش رہنے کا مجاہدہ ان کے لیے ہزار مجاہدوں سے بھاری تھا، اب یہ ہوتا کہ بار بار ان کے دل میں بولنے کا تقاضا پیدا ہوتا، لیکن پابندی کی وجہ سے نہ بولنے پر مجبور ہیں اور اسی علاج کی وجہ سے اللہ تبارک تعالیٰ نے سارا طریق طے کرادیا، اس لیے کہ حضرت والد صاحب یہ سمجھ گئے تھے کہ ان کی بنیادی بیماری یہ ہے، جب یہ قابو میں آ جائے گی، تو سب کام آسان ہو جائے گا، چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا، ہر ایک کی بیماری الگ الگ ہے، لہذا حالات کو دیکھ کر شیخ تجویز کرتا ہے کہ اس کے لیے کونسا علاج مفید ہوگا، بہرحال یہ ''تقلیل کلام'' کا مجاہدہ ہے۔

## کم سونے کا مجاہدہ اوراس کی حد:

تیسرا مجاہدہ ''تقلیل منام'' یعنی کم سونا، اس میں بھی پہلے تو نہ سونے کا مجاہدہ ہوتا تھا چنانچہ جیسا کہ مشہور ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھا کرتے تھے، لیکن بزرگوں نے فرمایا کہ کم سونے کی حد یہ ہے کہ آدمی کو دن رات میں کم از کم چھ گھنٹے ضرور سونا چاہیے، چھ گھنٹے سے کم نہ کرے، ورنہ بیمار ہو جائے گا اور حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ اگر کسی کو بے وقت سونے کی عادت ہے، تو وہ اس کو ختم کرے، یہ بھی کم سونے کی حد میں داخل ہے اور یہ بھی مجاہدہ ہے۔

## لوگوں سے تعلقات کم رکھنے کا مجاہدہ اوراس کا فائدہ:

چوتھا مجاہدہ ہے ''تقلیل الاختلاط مع الانام'' یعنی لوگوں سے میل جول کم کرنا اور بہت زیادہ میل جول سے پرہیز کرنا، اس لیے کہ انسان کے جتنے زیادہ تعلقات ہوں گے، اتنا ہی گناہوں میں مبتلا ہونے کا اندیشہ رہے گا، تجربہ کرکے دیکھ لو، آج کل تو تعلقات بڑھانا ایک فن اور ہنر بن گیا ہے، جس کو پبلک ریلیشن (Public Relation) کہا جاتا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ تعلقات زیادہ پیدا کرو اور اپنا اثر رسوخ بڑھاؤ اور ان تعلقات کی بنیاد پر اپنا کام نکالو، لیکن ہمارے بزرگوں نے اس سے منع فرمایا ہے کہ بلا ضرورت تعلقات نہ بڑھائے جائیں، بلکہ تعلقات کو کم کیا جائے۔

## انسان کا دل ایک آئینہ ہے جو تعلقات سے خراب ہوتا ہے:

اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے دل کو ایک آئینہ بنایا ہے، جو تصویر انسان کے سامنے سے گزرتی ہے، اس کا عکس دل پر جم جاتا ہے، لہذا جب انسان کے تعلقات زیادہ ہوں گے، تو اس میں پھر اچھے لوگ بھی آئیں گے اور برے بھی آئیں گے اور جب برے کاموں میں مصروف لوگ ملاقات کریں گے، تو ان کے کاموں کا عکس دل پر پڑے گا اور اس سے دل خراب ہوگا، اس لیے فرمایا کہ دوسرے لوگوں سے بلاضرورت زیادہ نہ ملو، دوسرے لوگوں سے تعلقات جتنے کم ہوں گے، اتنا ہی اللہ جل شانہ سے تعلق میں اضافہ ہوگا۔ مولانا رومی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

تعلق حجاب است و بے حاصلی ☆ چوں پیوند ھابگسلی واصلی

یعنی یہ تعلقات اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم کرنے میں حجاب اور پردے بن جاتے ہیں، دنیا کی جتنی محبتیں بڑھیں گی، کہ اس سے بھی محبت ہے، اس سے بھی محبت ہے، اتنا ہی اللہ تبارک وتعالی سے تعلق میں کمی آئے گی، البتہ جو حقوق العباد ہیں، وہ بے شک ادا کرنے ہیں، ان میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے، لیکن بلاوجہ تعلقات نہیں بڑھانا چاہیے، اسی کا نام ''تقلیل الاختلاط مع الانام'' ہے۔



## مجاہدات کا فائدہ اور اس کا طریقہ:

بہر حال یہ مجاہدات اس لیے کرائے جاتے ہیں تاکہ ہمارا یہ نفس قابو میں آجائے اور ناجائز کاموں پر اکسانا چھوڑ دے، اس لیے یہ مجاہدات ہر انسان کو کرنے چاہیں اور بہتر یہ ہے کہ یہ مجاہدات کسی راہنما کی نگرانی میں کرے، خود اپنی مرضی اور اپنے فیصلے سے نہ کرے، اس لیے کہ اگر انسان خود سے یہ فیصلہ کرے گا کہ میں کتنا کھاؤں؟ کتنا نہ کھاؤں؟ کتنا سوؤں؟ کتنا نہ سوؤں؟ کتنے لوگوں سے تعلقات رکھوں؟ کن سے تعلقات نہ رکھوں؟ تو اس میں بے اعتدالی ہوسکتی ہے، لیکن جب کسی رہنما کی رہنمائی میں کام کرے گا، تو انشاء اللہ اس کے فوائد حاصل ہوں گے اور ہر کام اعتدال میں رہ کر ہوتا رہے گا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (اصلاحی خطبات: جلد دوم)

باب اول کا ساتواں بیان:

# بری صفات اور خراب باتوں سے بچنے کی اہمیت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ اَمَّا بَعْدُ

## رزائل کسے کہتے ہیں؟

انسان کے باطن میں جو خراب اور فاسد قسم کی صفتیں ہوتی ہیں ان کو ''رزائل'' کہا جاتا ہے اس عنوان کے تحت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

> ''سالک کو چاہیے کہ رزائل کی اصلاح شیخ سے ایک ایک کی کرائے جب ایک رذیلے کی مقاومت پر پوری قدرت ہو جائے اور مادے کا اضمحلال ہو جائے تو دوسرے رذیلے کا علاج شروع کرے۔ اور اس رذیلے کے ازالہ کلی کا کبھی انتظار نہ کرے کیونکہ یہ ناممکن ہے بلکہ اس مادے کے وجود میں ہزار ہا حکمتیں ہیں۔'' (انفاس عیسیٰ: ۱۳۷)

## سالک کے لغوی اور اصطلاحی معنی:

''سالک'' کے معنی ہوتے ہیں ''چلنے والا''۔ تصوف کی اصطلاح میں ''سالک'' اس کو کہتے ہیں جو کسی شیخ کے پاس اپنی اصلاح کرانے کے لیے جاتا ہے گویا کہ وہ راستے پر چل رہا ہے۔ ''تصوف'' کو کہتے ہیں ''طریق'' اور ''سالک'' اس طریق پر چلنے والا اور ''شیخ'' کی مثال رہنما کی ہے جو اس کو راستہ بتاتا ہے کہ اس طرح چلو اور اس طرح کام کرو۔

## رزائل کی اصلاح کی حد اور اس کا طریقہ کار:

حضرت نے فرمایا کہ ''سالک'' کو چاہیے کہ ایک ایک ''رزائل'' کی اصلاح شیخ سے کرائے، مثلاً اس کے اندر غصہ ہے اور ''غصہ'' ایک رزیلہ ہے، اس کی اصلاح کرانی ہے، غصے کے نتیجے میں مارتا پیٹتا ہے یا ڈانٹ ڈپٹ کرتا رہتا ہے اور غصہ کے اندر آپے سے باہر ہو جاتا ہے، تو اس شیخ کو بتائے کہ میرے اندر غصہ بہت ہے اور اس غصے کے نتیجے میں بہت سی غلط باتیں بھی مجھ سے ہو جاتی ہیں، اب شیخ ان کا علاج کرے گا۔ کیسا علاج کرے گا؟ وہ ایسا علاج نہیں کرے گا کہ اس کے نتیجے میں غصہ آنا بند ہو جائے گا بلکہ علاج کے بعد بھی غصہ تو آئے گا کیونکہ غصہ ایک فطری صفت ہے جو ہر انسان کے اندر ہوتی ہے، لیکن علاج کے نتیجے میں وہ غصہ شریعت کے تابع ہو جائے گا۔

اسی طرح نفس کے اندر جتنے بھی رزائل ہیں، چاہے وہ غصہ ہو یا شہوت ہو یا بخل ہو، یہ سب فطری ہیں اور یہ صفات اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر اس لیے رکھی ہیں تاکہ انسان ان کو صحیح محل پر استعمال کرے، اگر انسان کے اندر غصہ نہ ہو تو وہ اپنی جان کا دفاع کیسے کرے گا؟ مال کا دفاع کیسے کرے گا؟ اپنے بیوی بچوں کا دفاع کیسے کرے گا؟ غصہ نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خواہ کوئی اس پر یا اس کے بیوی بچوں پر حملہ آور ہو مگر اس کو غصہ ہی نہیں آئے گا۔ دوسرے کے اس غلط اقدام کو روکنے کے لیے طبیعت میں کوئی محرک ہی نہ ہوگا۔ نہ اپنے نقصان سے بچنے کا کوئی تقاضا بیدار ہوگا۔

## ضابطہ سے متعلق ایک نواب اور بندر کا واقعہ:

جیسے میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمتہ اللہ علیہ ایک قصہ سنایا کرتے تھے کہ ایک نواب صاحب ہر کام ضابطے میں کیا کرتے تھے، ان کا طرہ امتیاز یہ تھا کہ انہوں نے اپنا ایک ضابطہ بنا رکھا تھا کہ اتنے بجے سے اتنے بجے تک فلاں کام کروں گا، اتنے بجے سے اتنے بجے تک فلاں کام کروں گا، فلاں وقت کھانا کھاؤں گا، فلاں وقت سوؤں گا، فلاں وقت اٹھوں گا اور جس کام کے لیے جو وقت مقرر کر رکھا تھا، اس کے بارے میں ان کا کہنا یہ تھا کہ میں اس وقت ضابطے میں یہ کام کر رہا ہوں، چاہے وہ کام نہ کر رہے ہوں، مثلاً

سونے کا وقت چھ گھنٹے مقرر کیا ہے اور یہ طے کیا ہوا ہے کہ مجھے صبح ۶ بجے اٹھنا ہے، اب اگر پانچ بجے آنکھ بھی کھل جائے گی تب بھی وہ چھ بجے تک لیٹے رہیں گے، اگر چہ اس وقت وہ حقیقت میں تو نہیں سو رہے ہیں، لیکن ضابطے میں سو رہے ہیں۔

ایک دن نواب صاحب کے اٹھنے کا وقت ۶ بجے تھا، مگر ۵ بجے آنکھ کھل گئی، اب ضابطے میں وہ سو رہے تھے، اس وقت گھر میں ایک بندر گھس آیا، وہ بندر نواب صاحب کے کپڑے لے کر بھاگ گیا، پھر دوبارہ آ کر روٹی لے کر بھاگ گیا، پھر کچھ اور سامان لے کر بھاگ گیا، مگر نواب صاحب لیٹے لیٹے بندر کو دیکھ رہے ہیں، جونہی چھ بجے تو فوراً ہڑبڑ کر اٹھے اور کہنے لگے کہ ارے بھائی کوئی دیکھنے والا نہیں ہے، یہ بندر سب چیزیں اٹھا کر لے جا رہا ہے، کیا سب لوگ مر گئے ہیں؟ لوگوں نے ان سے پوچھا کہ جناب آپ نے بندر کو لے جاتے ہوئے خود دیکھا تھا؟ کہنے لگے ہاں ہم نے خود لے جاتے ہوئے دیکھا تھا، تو پھر جناب آپ ہی بندر کو روک دیتے، نواب صاحب نے کہا ارے بھائی ہم اس وقت ضابطے میں سو رہے تھے، اب دیکھئے کہ اس ضابطے کو اس درجہ اپنے اوپر لاگو کر لیا کہ انسان کے جو فطری جذبات ہوتے ہیں کہ انسان اپنے جان اور مال کا دفاع کرے، وہ بھی اس ضابطے کے آگے قربان ہے۔

## غصہ کے صحیح اور غلط استعمال کی وضاحت:

اللہ تعالیٰ نے یہ غصہ اور غیرت اس لیے پیدا کی ہے کہ اگر دوسرا شخص تمہارے مال پر، تمہاری بیوی بچوں پر، تمہارے اعزہ، اقرباء پر زیادتی کرے، تو آدمی اس غیرت اور غصے کو کام میں لا کر اس کا دفاع کرے، مگر اس غصے کا حد سے زیادہ ہونا یہ ہے کہ جہاں غصہ کا محل نہیں تھا آدمی وہاں غصہ کرے، جہاں شریعت نے غصہ استعمال کرنے کو منع کیا تھا، اگر وہاں پر آدمی غصہ کرے، ڈانٹ ڈپٹ کرے، مار پیٹ کرے، یہ اس کا غلط استعمال ہے، یہ جائز نہیں، بہر حال غصے کے کچھ جائز محل ہیں اور کچھ ناجائز محل ہیں، جائز محل میں غصے کا استعمال کوئی بری بات نہیں، بلکہ عین مطلوب ہے، مثلاً کوئی باپ اپنے بیٹے کو اس کی غلط بات پر ڈانٹے یا استاد شاگرد کو ڈانٹے یا شیخ مرید کو ڈانٹے، تاکہ اس کی خراب بات دور ہو جائے تو یہ غصہ عین مطلوب ہے، بلکہ ایسے محل پر غصہ نہ کرنا مرض اور بیماری ہے۔ لیکن اگر وہ غصہ اپنی حد سے متجاوز ہو جائے مثلاً ایک آدمی آپ سے ملنے کے لیے آیا آپ نے اس کو ڈانٹنا شروع

کر دیا ارے بھائی وہ آنے والا تو مہمان تھا اور مہمان کا اکرام کرنا چاہیے تھا، اس کی خاطر کرنی چاہیے تھی، لیکن آپ نے اس کو الٹا ڈانٹنا شروع کر دیا، یہ مذموم ہے اور غلط ہے اور قابل اصلاح ہے۔

بہر حال غصے کو جائز حدود میں استعمال کرنا اور ناجائز حدود سے اس کو بچانا بس یہی شیخ کا کام ہے، لہٰذا جب تمہارے اندر غصہ تو ہے مگر تمہیں یہ پتہ نہیں کہ میں اس کو غلط استعمال کرتا ہوں یا صحیح استعمال کرتا ہوں؟ تو اب اپنے شیخ کو اپنے حالات اور معاملات بتا دو، وہ خود تشخیص کر دیں گے اور صحیح و غلط کا فیصلہ کر دیں گے۔ اور اگر خود ہی کو اپنے غصہ کے بے جا ہونے کا اندازہ ہے، تو ایسے واقعات اور اپنے غصہ کے شدید ہونے کو اپنے شیخ سے بتا دو کہ میرے اندر غصہ شدید ہے پھر شیخ رفتہ رفتہ اس کی تدبیریں بتائے گا کہ تم کس طرح اپنے غصہ کو قابو میں لاؤ اور کس طرح اس غصے کو صحیح استعمال کرو، تم اس کی بتائی ہوئی تدبیروں پر عمل کر لو۔

## روحانی امراض کے علاج کی ضرورت اور اس کا طریقہ:

یا مثلاً طبیعت کے اندر ''حسد'' کی بیماری ہے، اب آدمی اپنے شیخ کو بتائے کہ میرے اندر ''حسد'' ہے، میرا فلاں ساتھی ہے، جب امتحان میں اس کے نمبر زیادہ آتے ہیں اور میرے نمبر کم آتے ہیں، تو اس وقت میرے دل میں ایک کڑھن پیدا ہوتی ہے اور دل یہ چاہتا ہے کہ اس کے نمبر کم ہو جائیں۔ اب شیخ سے پوچھے کہ یہ صورت ''حسد'' ہے یا نہیں؟ اگر حسد ہے، تو اس کا کس طرح علاج کروں؟ کیا طریقہ اختیار کروں؟

یا مثلاً شہوت ہے، اگر یہ شہوت حد اعتدال سے بڑھی ہوئی ہے، تو شیخ کو بتائے کہ میرے اندر یہ بیماری ہے، اس کا کیا علاج کروں؟ یا مثلاً دوسروں کے بتانے سے یا آپ خود ہی اپنے اندر یہ محسوس کر رہے ہیں کہ میرے اندر بڑائی اور تکبر ہے، یہ تکبر ایسی بیماری ہے کہ عموماً خود انسان کو اس کے بارے میں پتہ نہیں چلتا چنانچہ دیکھ لیجئے کہ کبھی کوئی متکبر اپنے آپ کو متکبر نہیں کہے گا، اگر کوئی دوسرا اس سے پوچھے کہ تو تکبر کرتا ہے؟ تو وہ یہی جواب دے گا کہ میں تو تکبر نہیں کرتا لیکن دوسرے شخص کو پتہ لگ جاتا ہے کہ اس کے اندر تکبر ہے، لہٰذا شیخ کو بتلائے کہ دوسرے لوگ یہ کہتے ہیں کہ میرے اندر تکبر ہے، یا فلاں عمل سے مجھے خود اپنے اندر تکبر کا شبہ ہو رہا ہے، اس کا علاج بتائیں کہ کیا علاج کروں؟

لہٰذا شیخ کے پاس جانے کا منشا یہ نہ ہو کہ ان سے وظائف اوراذکار پوچھ لیا کروں گا کہ کتنا ذکر کروں؟ کتنی تسبیح پڑھا کروں؟ کیا کیا معمولات اختیار کروں؟ کیونکہ یہ ذکر واذکار ،وظائف اور تسبیحات تو راستے کے لیے معین (یعنی مددگار) ہیں لیکن خود مقصود اصلی نہیں ،مقصود اصلی کے حصول طریقہ یہ ہے کہ اپنی صبح سے شام تک کی زندگی کا جائزہ لیتا رہے اور یہ دیکھے کہ میں نے جو فلاں کام کیا تھا، اس میں کہیں تکبر تو شامل نہیں ہو گیا؟ فلاں کام کے اندر غصے کا ناجائز استعمال تو نہیں ہوا تھا؟ فلاں کام میں نے طمع اور حرص کی وجہ سے تو نہیں کیا تھا؟ یا میرے اندر حب مال اور حب جاہ تو نہیں ہے؟ ان تمام چیزوں کا جائزہ لیتا رہے، اس پر عمل کرتا رہے اور اگر اس علاج پر عمل درآمد میں کوتاہی یا دشواری ہو تو وہ بھی شیخ کو بتائے۔ غرضیکہ اصلاح حال کے لیے اپنی ہر کیفیت سے اپنے مصلح اور شیخ کو باخبر کرتا رہے۔

## اصلاح حال کے دو طریقے: اطلاع اور اتباع

اسی بات کو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ کسی شیخ سے رجوع کرے تو دو کام ایک ''اطلاع'' دوسرے ''اتباع''۔ ''اطلاع'' کے معنی یہ ہیں کہ اپنے حالات کی شیخ کو اطلاع کرے اور ''اتباع'' کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ شیخ ہدایت دے اس کی اتباع کرے اور اس کی پیروی کرے، اس پر عمل کرے، اسی طریقے سے انسان کی اصلاح ہوتی ہے۔

آج ہم نے ''تصوف اور طریقت'' کو ایک رسم بنا لیا ہے کہ ہم فلاں صاحب سے بیعت ہیں، بس آگے کچھ نہیں، زیادہ سے زیادہ یہ کر لیا کہ شیخ نے جو کچھ معمولات اور کچھ مخصوص تسبیحات بتا دیں کہ فجر کے بعد یا کسی اور وقت کو مقرر کر کے ان کو پڑھ لیا کر و وہ پوری کر لیں، بس، اس سے آگے کچھ نہیں، حالانکہ میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ رذائل کی اصلاح کے بغیر تو یہ اذکار بعض اوقات مضر ہو جاتے ہیں، اس کی مثال یہ ہے کہ جب کوئی آدمی بیمار ہو، اس کو بیماری کی حالت میں مقویات یعنی طاقت کی دوائیں نہیں دی جاتیں مثلاً شدید نزلہ یا بخار ہو رہا ہے تو اطباء کہتے ہیں کہ پہلے اس نزلہ اور بخار کا علاج کراؤ، اس حالت میں کوئی قوت بخش خمیرہ نہیں دیا جائے گا، کیونکہ طب کا اصول یہ ہے کہ جب آدمی کے اندر کوئی ''خلط'' غالب آ جاتی ہے، تو اس حالت میں انسان جو غذا بھی کھائے گا وہ غذا اس ''خلط'' کی طرف مستحیل ہو جاتی ہے، مثلاً اگر ''بلغم'' غالب ہے، تو اس حالت میں جو مقویات اور

غذا کھائے گا وہ سب بلغم کی طرف مستحیل ہو جائے گی، لہٰذا پہلے اس بیماری کا اور اس خلط کا علاج کیا جائے گا، پھر مقویات دی جائیں گی، تو وہ مقویات کارآمد ہوں گی۔

اسی طرح اگر دل میں تو تکبر، انانیت اور تعلّی کا بت بسا ہوا ہے اور اس حالت میں وہ ذکر کر رہا ہے، تو اپنے اس عمل کے نتیجے میں بعض اوقات تکبر کی بیماری اور زیادہ ہو جاتی ہے، چنانچہ وہ اب یہ سمجھے گا کہ دیکھو میں کتنا بڑا اللہ والا ہوں کہ اس طرح ذکر کر رہا ہوں اور جو کام بڑے بڑے صوفیاء کرام نے کیے تھے وہی کام میں کر رہا ہوں۔ لہٰذا اس ذکر سے اسے فائدہ ہونے کے بجائے اس کی تکبر کی بیماری کو اور زیادہ تقویت حاصل ہوگی، اس لیے عام طور پر ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ آدمی پہلے اپنے رذائل دور کرائے۔

## ''رذائل'' کے فطری ہونے پر حضرت تھانوی کی دلیل:

آگے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

> ''رذائل'' کے فطری ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بچوں کو بھی غصہ آتا ہے اور محققین کا قول ہے کہ ''غضب'' ''کبر'' سے پیدا ہوتا ہے پھر غضب سے غیبت پیدا ہوتی ہے جب بچوں میں غصہ ہے تو معلوم ہوا کہ ان میں کبر بھی ہے تو بچوں کے اندر ان امور کے ہونے سے معلوم ہوا کہ یہ امور فطری ہیں۔'' (انفاس عیسیٰ ص ۱۳۷)



بتانا یہ مقصود ہے کہ یہ ''رذائل'' فطری ہیں اور فطری ہونے کی وجہ سے اس فکر میں مت رہنا کہ ''رذائل'' کبھی جا کر ختم ہو جائیں گے، نہیں، یہ ختم نہیں ہوں گے، نہ غصہ ختم ہوگا اور نہ تکبر کی اصل ختم ہوگی، البتہ ان رذائل کو مضمحل کیا جائے گا، ان کو پیٹا جائے گا، کوٹا جائے گا، کچلا جائے گا، یہاں تک کہ ان کے اندر سے وہ زہر نکل جائے گا، جو تمہارے لیے قاتل ہے، اسی کی تشریح آگے خود حضرت والا فرماتے ہیں کہ

## زوالِ رزائل سے مقصود اضمحلال ہے:

> زوالِ رذائل سے مقصود اضمحلال ہے اور ''اضمحلال'' کے معنی یہ ہیں کہ مجاہدہ کے بعد اخلاق رذیلہ کی مقاومت میں پہلی جیسی مشقت نہ رہے۔ (نفاس عیسیٰ: ۱۳۷)

یعنی ''رزائل'' بالکلیہ زائل نہیں ہو سکتے، بلکہ ان کو ضعیف اور کمزور کر دیا جاتا ہے، ایسے کمزور ہو جاتے ہیں کہ ان کا مقابلہ کرنے میں جو مشقت پہلے ہوتی تھی، اب اتنی مشقت نہیں ہوتی، دنیا کے ہر کام میں بھی یہی معاملہ ہے اور دین کے ہر کام میں بھی کہ جو کام مشکل ہوتا ہے، مشق کے نتیجے میں وہ کام آسان ہو جاتا ہے، مثلاً ایک شخص کو جب تک پانچ وقت نماز پڑھنے کی عادت نہیں تھی، تو اس کو نماز کے لیے مسجد کی طرف جانا اور نماز کی پابندی کرنا بہت شاق گزرتا تھا، اس کو بہت تکلیف ہوتی تھی، لیکن رفتہ رفتہ جب نماز پڑھنے کی عادت پڑ گئی، تو اب نماز پڑھنے کی مشقت کم ہو گئی، بالکلیہ مشقت تو ختم نہیں ہو گی، تھوڑی بہت مشقت کرنی پڑتی ہے، نفس کی مخالفت کرنی پڑتی ہے، لیکن عادت پڑنے سے وہ مشقت پہلے کی نسبت کم ہو گئی اور نماز پڑھنے پر جو ثواب ملتا ہے وہ درحقیقت اسی مشقت کا انعام ہے، اگر مشقت بالکل نہ رہے، تو پھر ثواب کس چیز کا؟ اس لیے نماز پڑھنے میں کچھ مشقت اور محنت ہر حالت میں کرنی پڑتی ہے۔

یہی معاملہ اخلاق رذیلہ کا ہے، مثلاً غصہ ہے، پہلے یہ حال تھا کہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا، ذرا سی طبیعت کے خلاف کوئی بات ہوئی بس پارہ آسمان پر چڑھ گیا اور دوسروں کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا، ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ شروع کر دی، پھر جب اپنی اصلاح کرانے کے لیے تصوف اور طریقت کے راستے پر چلا تو پتہ چلا کہ غصہ بری چیز ہے اور غصہ کو بے محل استعمال کرنا گناہ ہے، چنانچہ اس نے اپنے غصہ کو روکا اور غصہ کا کڑوا گھونٹ پیا، دل چاہ رہا ہے کہ اس شخص کو زور سے تھپڑ ماروں، اس کے ٹکڑے کر دوں، لیکن اپنے آپ کو قابو کیا اور اس قابو کرنے میں بہت وقت اور مشقت ہوئی، پھر آہستہ آہستہ غصہ کو دباتے دباتے بالآخر یہ حال ہوا کہ اب غصہ تو آتا ہے، لیکن اس کے روکنے میں پہلی جیسی مشقت نہیں ہوتی۔

## شہوت کو ختم کرنے کا مطلب اور اس کا طریقہ:

یا مثلاً ''شہوت'' ایک رذیلہ ہے، اگر انسان اس کو غلط جگہ پر استعمال کرے، تو اللہ تعالیٰ بچائے یہ بہت خطرناک چیز ہے اور اس طریق میں یہ مہلک ہے، مثلاً شہوت کے تقاضے سے کسی ناجائز جگہ پر نظر ڈالنا، لذت لینے کے لیے نامحرم کو دیکھنا، نفس کو اس کی عادت پڑی ہوئی تھی، جب نفس کی اصلاح کے لیے تصوف اور سلوک میں قدم رکھا، تو معلوم ہوا کہ یہ تو بہت

بڑے گناہ کی بات ہے، اس سے اپنے آپ کو بچانا چاہیے، چنانچہ اس کے بعد جب وہی منظر سامنے آیا، تو دل میں شدید تقاضا ہوا کہ خوب دل کھول کر اہتمام کے ساتھ اس کو دیکھا جائے، جیسا کہ ہمیشہ سے دیکھتے چلے آئے تھے، لیکن یہ بات یاد آ گئی کہ ہم تو اب نفس کی اصلاح کا کام شروع کر چکے ہیں، لہذا ہمیں اپنی نگاہ کو سنبھالنا ہوگا، نگاہ کو پست کرنا ہوگا، جب یہ خیال آیا تو نظر اس جگہ سے ہٹالی، تو اس وقت نفس پر قیامت گزر گئی، دل پر آرے چل گئے، اس لیے کہ اب تک تو غلط جگہ پر نگاہ ڈالنے کی عادت پڑی ہوئی تھی، اب وہاں سے نظر ہٹانے میں نفس کو شدید مشقت ہوئی۔ لیکن ایک مرتبہ یہ تہیہ (پکا ارادہ) کرلیا کہ چاہے دل پر آرے چلیں، قیامت ٹوٹے، کچھ بھی ہو، لیکن یہ کام نہیں کروں گا۔

آرزوئیں خون ہوں یا حسرتیں برباد ہوں
اب تو اس دل کو بنانا ہے تیرے قابل مجھے

یہ سوچ کر نظر وہاں سے ہٹالی، تو جتنی مشقت پہلی مرتبہ ہوئی تھی، دوسری مرتبہ جب یہ واقعہ پیش آئے گا تو پہلی مرتبہ کے مقابلے میں مشقت کچھ کم ہوگی، تیسری مرتبہ جب پیش آئے گا تو اور کم مشقت ہوگی، چوتھی مرتبہ اور کم ہوگی اور اس طرح کم ہوتے ہوتے وہ مشقت گھٹتی جائے گی اور آخر میں جب طبیعت اعتدال پر آ جائے گی، تو اس کے بعد جب نگاہ غلط جگہ پر پڑے گی، تو اس وقت اگرچہ نفس کا ہلکا تقاضا تو پھر بھی رہے گا، لیکن اس تقاضے کے باوجود اس نظر کو وہاں سے ہٹالینا اتنا دشوار نہیں ہوگا، اس لیے کہ بار بار نظر ہٹاتے رہنے سے مادے میں اضمحلال ہوگیا اسی لیے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ زوال رذائل سے مقصود اضمحلال ہے اور اضمحلال کے معنی یہ ہیں کہ مجاہدہ کے بعد اخلاق رذیلہ کی مقاومت (یعنی ان کا مقابلہ کرنے) میں پہلی جیسی مشقت نہ رہے، البتہ تھوڑی سی مشقت پھر بھی رہے گی، کتنا ہی انسان مجاہدے اور ریاضتیں کر کے اپنے آپ کو انتہا تک پہنچا دے، تب بھی شہوت کا مادہ ختم نہیں ہوگا، غضب کا مادہ ختم نہیں ہوگا اور گناہ کے تقاضے بالکلیہ ختم نہیں ہوں گے، گناہ کی جھلکیں پھر بھی آئیں گی، تقاضے پھر بھی پیدا ہوں گے، داعیے پھر بھی آئیں گے، البتہ فرق اتنا ہوگا کہ پہلے داعیہ کا مقابل کرنے میں بہت دقت ہوتی تھی اب دقت کم ہو جائے گی۔

اسی بات کو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ آگے فرماتے ہیں:

ورنہ مجاہدہ سے نہ حریص کی حرص زائل ہوتی ہے، نہ بخیل کا بخل، نہ متکبر کا کبر، ہاں اضمحلال ہو جاتا ہے۔ (انفاس عیسیٰ: )

یعنی طبیعت میں حرص کا جو اصل مادہ ہے، وہ ختم نہیں ہوتا، اگر طبیعت میں بخل کا مادہ ہے، تو وہ ختم نہیں ہوتا، اگر طبیعت میں ''تکبر'' ہے، تو وہ ختم نہیں ہوتا، لیکن ''اضمحلال'' ہو جاتا ہے۔ اضمحلال کا مطلب یہ ہے کہ یہ سارے مادے اور ساری چیزیں اندر موجود تو ہیں لیکن مجاہدے کے نتیجے میں وہ ایسی کمزور ہوگئی ہیں کہ اب وہ غلط کام پر انسان کو آمادہ نہیں کرتیں اور ان کے مقتضی پر انسان عمل نہیں کرتا۔

## حرص کو ختم کرنے کا مطلب اور اس کا طریقہ:

مثلاً مال کی حرص انسان کی طبیعت میں موجود ہے خود قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمادیا:

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِيْنَ﴾ (سورۃ آل عمران)

لیکن اگر یہ ''حرص'' صحیح جگہ پر استعمال ہو تو یہ اتنی بری بھی نہیں۔ مال کی اتنی حرص جس کی انسان کو اپنی زندگی گزارنے کے لیے ضرورت ہے اور اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے اور ان کے حقوق ادا کرنے کے لیے جتنی حرص کی ضرورت ہے اتنی حرص تو ہونی چاہیے لیکن ایک وہ حرص ہے جس کے بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر انسان کو ایک وادی سونے کی مل جائے تو وہ یہ حرص کرے گا کہ دوسری وادی بھی مل جائے ور جب دوسری وادی مل جائے گی تو یہ حرص کرے گا کہ تیسری وادی مل جائے اور آدم کے بیٹے کا پیٹ سوائے مٹی کے اور کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔ یہ حرص حرام ہے کیونکہ جب مال کی یہ حرص انسان پر غالب آجاتی ہے تو یہ انسان کو جائز ناجائز ہر طریقے سے پیسے حاصل کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔

## حرص کے تین درجات:

پھر حرص کے کچھ درجات ہیں:

## حرص کا پہلا درجہ جو انتہائی برا اور حرام ہے:

۱)...... پہلا درجہ یہ ہے کہ وہ حرص انسان کو ایسے طریقوں سے دولت حاصل کرنے پر

آمادہ کرے جو کھلے طور پر ناجائز اور حرام ہیں، مثلاً وہ حرص اس کو چوری کرنے پر آمادہ کرے کہ چوری کرکے دولت حاصل کرو، ڈاکہ پر انسان کو آمادہ کرے کہ ڈاکہ ڈال کر دولت حاصل کرو، یا دھوکہ دینے پر آمادہ کرے کہ دوسروں کو دھوکہ دے کر دولت حاصل کرو۔ اللہ بچائے۔ یہ حرص کا انتہائی درجہ ہے۔

## حرص کا دوسرا درجہ جو حرام ہے:

۲)......حرص کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ وہ حرص اس کو دولت حاصل کرنے کے لیے کھلے حرام طریقے اختیار کرنے پر تو آمادہ نہیں کر رہی، لیکن وہ حرص اس کو تاویل اور توجیہ کر کے مال حاصل کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ حرص کا یہ درجہ عام طور پر مولوی صاحبان کے اندر ہوتا ہے، میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ مولوی کا شیطان بھی مولوی ہوتا ہے، کیونکہ کسی مولوی صاحب کو اگر اس کا نفس یہ کہے کہ تو چوری کرلے یا ڈاکہ ڈال لے یا فلاں کا حق دبالے تو وہ مولوی اس کی بات نہیں مانے گا اور کہے گا یہ تو برا اور ناجائز کام ہے، میں تو نہیں کرتا، لیکن مولوی کا شیطان بھی مولوی ہوتا ہے، وہ شیطان آکر اس کو طرح طرح کی دلیلیں اور تاویلیں سناتا ہے، کہ دیکھو یہ تمہارا حق ہے، اس کو تم وصول کرلو، حالانکہ حقیقت میں وہ اس کا حق نہیں بن رہا تھا، مگر اسی جذبہ ''حرص'' نے تاویل پر آمادہ کیا اور اس تاویل کے نتیجے میں وہ ناجائز پیسے حاصل کر رہا ہے۔ حرص کا یہ درجہ بھی حرام ہے۔

## حرص کا تیسرا درجہ جو مذموم نہیں:

حرص کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ پیسے اچھے لگتے ہیں اور دل میں یہ خواہش ہے کہ پیسے زیادہ سے زیادہ آجائیں، لیکن اس کے نتیجے میں وہ شخص نہ تو کسی صریح حرام کام کا ارتکاب کرتا ہے اور نہ ہی مال حاصل کرنے کے ناجائز ذرائع اختیار کرتا ہے، نہ ہی تاویل اور توجیہ اختیار کرتا ہے، بس اللہ تعالیٰ نے جو کچھ حلال اور جائز طریقہ سے دے دیا اس کو بخوشی لیا ہے اور مزید حاصل کرنے میں لگا ہوا ہے، تو حرص کا یہ درجہ مذموم نہیں، کیونکہ اس حرص نے اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا اور نہ اس حرص کے مقتضی پر کوئی ناجائز عمل کیا۔

## بخل کی بیماری اور اس کی مختلف صورتیں:

یہی حال ''بخل'' کا ہے خود قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ

﴿وَاُحۡضِرَتِ الۡاَنۡفُسُ الشُّحَّ﴾

یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کے نفس میں بخل کا مادہ رکھا ہے، اسی وجہ سے انسان کو پیسوں سے کچھ نہ کچھ محبت ہوتی ہے۔

## بخل کی پہلی صورت جو مذموم نہیں:

لیکن جب تک یہ بخل کسی فریضے کی ادائیگی میں رکاوٹ نہ بنے، اس بخل کے نتیجے میں کوئی ایسا کام نہ ہو جو یا تو حرام ہے یا مکروہ ہے یا خلاف مروت ہے، تو وہ بخل مذموم نہیں ہے۔

## بخل کی دوسری صورت جو مذموم ہے:

ہاں اگر وہ شخص بخل کی وجہ سے زکوۃ نہیں دیتا، یا بخل کی وجہ سے اپنے بیوی بچوں کا جتنا نفقہ واجب ہے وہ نہیں دیتا، یا بخل کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ نہیں کرتا، یا بخل کیوجہ سے وہ فقیروں کی طرح رہتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو دولت دی ہے، پیسے دیئے ہیں، تو اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا یہ حق ہے کہ انسان اس کو اس طرح استعمال کرے کہ دیکھنے والے کو بھی پتہ چلے کہ یہ شخص کوئی بھیک منگا اور فقیر نہیں ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

''اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ اَنْ يَرٰى اَثَرَ نِعۡمَتِهٖ عَلَيۡهِ''

یعنی اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند فرماتے ہیں کہ بندے کو اس نے جو نعمت دی ہے، اس کا اثر بھی اس پر ظاہر ہو، لہذا اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کا اظہار ہونا چاہیے، یہ نہ ہو کہ وہ ہے تو لکھ پتی آدمی، لیکن پھٹے پرانے کپڑے پہنے پھر رہا ہے، کیونکہ یہ بھی ایک طرح سے اللہ تعالیٰ کی ناشکری ہے، جب اللہ تعالیٰ نے نعمت دی ہے تو اس کا استعمال کرنے سے اس کا اظہار بھی ہونا چاہیے، اس دولت کو اس طرح استعمال کرے کہ لوگوں کو پتہ چلے کہ اللہ تعالیٰ کی فلاں نعمت اس کو حاصل ہے۔

## بخل کی تیسری صورت جو مذموم نہیں اور خلاف مروت نہیں:

بخل کی ایک صورت یہ ہے کہ آدمی حقوق واجبہ تو ادا کر رہا ہے لیکن اس طرح ادا کر رہا ہے کہ گھر میں روزانہ دال روٹی پکواتا ہے، حالانکہ اس کے پاس اتنی وسعت ہے کہ اپنے گھر والوں کے لیے اچھے اور عمدہ کھانے کا انتظام کر سکے، یہ بھی بخل کے اندر داخل ہے، البتہ یہ بخل خلاف مروت ہے۔

## بخل کی پہلی صورت میں کوئی قباحت نہیں:

لیکن اگر بخل کے نتیجے میں کوئی حق واجب نہیں چھوٹ رہا، بلکہ اطمینان اور فراغت کے ساتھ اپنے بیوی بچوں کے حقوق ادا کر رہا ہے، مگر پیسہ خرچ کرتے ہوئے طبیعت پر تھوڑی سی گرانی ہوتی ہے اور دل کو تکلیف ہوتی ہے، تو اس میں کوئی قباحت نہیں، حالانکہ یہ بھی بخل کی ایک صورت ہے، لیکن بخل کے تقاضے پر عمل نہیں ہوا اور اس بخل نے کسی غلط کام پر آمادہ نہیں کیا، اس لیے یہ بخل کچھ مضر نہیں، لہذا ''مجاہدہ'' کے نتیجے میں یہ بخل زائل نہیں ہوتا، نہ حرص زائل ہوتی ہے، لیکن ان کا نقصان ختم ہو جاتا ہے، کیونکہ پھر ان کے تقاضوں پر عمل نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو رزائل سے بچنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔

آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

روح کی بیماریاں اور ان کا علاج

# باب......(۲)

## بدنظری اور اس کا علاج

# بدنظری اور اس کا علاج

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ اَمَّا بَعْدُ

ایک صاحب نے اپنا حال لکھا کہ

| "شہوانی خیالات کا ہر وقت دل پر استیلاء رہتا ہے نامحرموں کو بری نظر سے دیکھنے میں ذرا بھی باک نہیں۔" (انفاس عیسیٰ ص ۱۴۳) |
|---|

## روحانی طبیب سے کوئی بات مخفی نہ رکھو!

یہ ایک صاحب نے اپنا حال حضرت والا کو لکھ کر بھیجا اور اصول یہ ہے کہ جب کسی شیخ سے تعلق ہو، تو اس کو اپنی ہر بات لکھنی ضروری ہے، اگر وہ اس کو چھپائے اور شرمائے، تو علاج کیسے ہو؟ جیسے ڈاکٹر اور طبیب سے اپنی بیماری نہیں چھپائی جاتی، اگر بیماری کو چھپائے گا، تو علاج کیسے ہوگا؟ اسی طرح جب کسی شیخ سے اصلاحی تعلق ہو، تو چاہے کتنی ہی شرمناک بات ہو، وہ شیخ پر ظاہر کرے، تاکہ اس کا علاج ہو سکے اور یہ خیال نہ کرے، کہ شیخ کو یہ بات لکھوں گا، تو اس کی نظر سے میری قدر کم ہو جائے گی یا اس کے دل میں میرے بارے میں برائی پیدا ہوگی اور شیخ کے دل میں برائی پیدا ہونا مرید کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے۔

یاد رکھئے! جب اللہ تعالیٰ کسی سے اصلاح کا کام لیتے ہیں، تو اس کو اپنی مخلوق پر رحمت اور شفقت عطا فرماتے ہیں، اگر کوئی شخص بری سے بری بات بھی شیخ کو لکھتا ہے، تو شیخ کے دل میں اس کی طرف سے برائی پیدا نہیں ہوتی، بلکہ شیخ کے دل میں رحم، ترس اور شفقت پیدا ہو جاتی ہے، جیسے ماں باپ کو دیکھا ہوگا کہ اگر ان کی اولاد میں کوئی بچہ بیمار یا معذور ہو، تو ماں باپ کو تندرست بچے پر اتنی شفقت اور محبت نہیں ہوتی جتنی معذور اور اپاہج بچے پر ہوتی ہے، ساری دنیا اس بچے سے گھن کر رہی ہے، لیکن ماں باپ اس پر فدا ہیں، اس کی خدمت میں

لگے ہوئے ہیں، اس کا پیشاب پاخانہ صاف کرر ہے ہیں، اسی طرح شیخ کو بری بات لکھنے سے یہ مت سوچو کہ شیخ بدظن ہوگا اور شیخ کا بدظن ہونا میرے حق میں نقصان دہ ہوگا، بلکہ ایسے مرید سے اور زیادہ محبت اور شفقت پیدا ہوتی ہے، اس کی طرف اور زیادہ توجہ ہوتی ہے۔

## حدیث میں اظہار گناہ کی ممانعت ہے تو شیخ کو اطلاع کیوں کریں؟

بعض اوقات اہل علم کو ایک اشکال ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ حدیث شریف میں ہے کہ کوئی شخص اپنا عیب اور اپنا گناہ دوسرے پر ظاہر نہ کرے، کہ میں نے فلاں وقت فلاں گناہ کیا تھا یا میں فلاں گناہ میں مبتلا ہوں یا فلاں باطنی بیماری میں مبتلا ہوں، اس کا اظہار دوسرے سے نہیں کرنا چاہیے، ہاں اللہ تعالیٰ سے کرنا چاہیے کہ یا اللہ میں اس گناہ میں مبتلا ہوں مجھے اس گناہ سے نکال دیجئے۔

حضرت حکیم الامت رحمتہ اللہ علیہ نے اس حدیث کی تشریح میں فرمایا کہ یہ حکم غیر مربی کے لیے ہے، یعنی اپنا گناہ اور اپنی باطنی بیماریوں کا اظہار ہر کس و ناکس پر نہ کرے، البتہ وہ شخص جس مربی کی تربیت میں ہے، اس پر ضرور اس کا اظہار کرے، وہ اظہار اس حدیث کی نہی میں داخل نہیں، جیسے کسی انسان کے سامنے کشف عورت جائز نہیں، لیکن طبیب کے سامنے ضرورتاً کشف عورت جائز ہے اور اگر آپ کسی طبیب کے پاس علاج کے لیے گئے اور بیماری جسم کے اس حصے میں ہے جس کو چھپانا واجب ہے یا بیماری تو کسی اور حصے میں ہے لیکن طبیب کے لیے علاج کی ضرورت کے لیے اس حصے کا دیکھنا ضروری ہے، تو اس طبیب کے سامنے ستر کھولنا جائز ہے، اس لیے کہ علاج اس پر موقوف ہے۔

اسی طرح اپنے گناہ کا اظہار کسی دوسرے پر کرنا جائز نہیں، کہ میں نے فلاں گناہ کیا تھا، بلکہ اس گناہ کو چھپاؤ، اس لیے کہ وہ گناہ گندگی ہے، اس پر پردہ ڈال دو اور اللہ تعالیٰ سے توبہ استغفار کرو، خواہ مخواہ اس کا اظہار اور افشاء نہ کرو، لیکن مربی اور شیخ کے سامنے اس کا اظہار ضروری ہے، تاکہ اس بیماری کا علاج اور اس کا ازالہ ہو سکے، لہذا جس کسی سے تربیت کا تعلق ہو، چاہے وہ ضابطے کا شیخ ہو یا ضابطے کا شیخ تو نہ ہو بلکہ استاد ہو اور اس کو اپنا مربی بنا رکھا ہو یا باپ ہو اور وہ باپ بیٹے کی تربیت کر رہا ہو، تو اس کے سامنے اپنی اس بیماری کا اظہار اس حدیث کی ممانعت میں داخل نہیں، اس اصول کے تحت ایک صاحب نے حضرت والا کو لکھا

کہ ''شہوانی خیالات کا ہر وقت دل پر استیلاء رہتا ہے نامحرموں کو بری نظر سے دیکھنے میں ذرا بھی باک نہیں۔'' مطلب یہ تھا کہ بدنظری میں مبتلا ہوں، کیا علاج کروں؟ چونکہ اس گناہ میں بکثرت ابتلاء ہوتا ہے، اس لیے حضرت والا کا یہ جواب بڑا جامع اور سب کے لیے مفید ہے۔

## نظر بچانے کے لیے ہمت کی ضرورت:

چنانچہ جواب میں ارشاد فرمایا کہ

> ''یہ شر ایسا ہے کہ اپنے اثر سے تمام طاعات کے انوار کو تاریک کر دیتا ہے اس لیے اس کا علاج اہتمام سے کرنا چاہیے اور ظاہر ہے کہ یہ مادہ خلقی ہے پس وہ شر نہیں بلکہ اس میں بہت سی مصالح ہیں البتہ اس مادے کے اقتضاء پر عمل کرنا شر ہے۔ اور وہ اختیاری ہے اور اختیاری کی ضد بھی اختیاری ہے پس فعل سے رکنا اختیاری ٹھہرا اور اس میں کوئی معذوری نہیں پس ہمت کیجئے یہی اس کا جواب ہے چندے تکلف ہوگا پھر عادت ہوجائے گی پھر لذت اور فرحت ہوگی۔'' (انفاس عیسیٰ ص ۱۴۳)

## علاج کیلئے بیماری کی کیفیت کا ادراک ضروری ہے:

جب آدمی کسی بیماری میں مبتلا ہو، تو پہلے اس بیماری کی کیفیت، اس کی شدت اور اس کے اثرات کا ادراک اور احساس کرے، پھر اس بیماری کے علاج کی فکر ہوگی، لیکن اگر بیماری کے بارے میں معلوم ہی نہیں، کہ یہ بیماری کیسی شدید ہے؟ تو پھر اس کا علاج کیا کرے گا، اس لیے پہلے جملے میں حضرت والا نے بدنظری کی بیماری اور نگاہ کو غلط استعمال کرنے کی بیماری، نامحرموں پر لذت کی نظر سے دیکھنے کی بیماری کی شدت اور خطرناکی کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ''یہ شر ایسا ہے کہ اپنے اثر سے تمام طاعات کے انوار کو تاریک کر دیتا ہے۔''

## بدنظری کے اثرِ بد سے تمام طاعات کا نور زائل ہوجاتا ہے:

اس سے آپ اس گناہ کی شدت کا اندازہ لگائیں، آپ نے نمازیں بھی پڑھیں، تہجد پڑھے، تراویح بھی پڑھی، ذکر بھی کیا، تسبیحات بھی پڑھیں، ان طاعات اور عبادات سے جو نور اور برکات حاصل ہوئی تھیں، وہ سب اس ایک شر کی وجہ سے تاریک ہوجاتی ہیں اور ان

تمام طاعات کا نور، حلاوت اور فائدہ رخصت ہو جاتا ہے۔ اللہ بچائے

طاعت کا فائدہ یہ ہے کہ انسان ایک طاعت کے بعد دوسری طاعت کی طرف بڑھتا ہے اور دوسری طاعت کے بعد تیسری طاعت کی طرف، اور آدمی ترقی کرتا چلا جاتا ہے۔ لیکن جب طاعت کا نور نہیں ہوتا، تو وہ طاعت بے حلاوت ہو جاتی ہے اور اس کے فوائد میں کمی ہو جاتی ہے۔

ہم لوگ تو طاعت کے نور اور اس کی حلاوت سے بھی واقف نہیں، تو اس کے سلب ہونے کا کہاں احساس ہوگا؟ جس کو پہلے نور اور حلاوت حاصل ہو، تو اس کو پھر اس کے سلب ہونے کے بارے میں پتہ چلے گا کہ وہ نور اب سلب ہو چکا ہے، ہمارے مزاجوں کے خراب ہونے کی وجہ سے ہمیں طاعت کے نور کا مطلب بھی معلوم نہیں، جو اللہ والے ہوتے ہیں، ان کو نور کا ادراک ہوتا ہے، چنانچہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک روز وہ کسی دعوت میں چلے گئے اور وہاں کھانا کھالیا، یہ معلوم نہیں تھا کہ جن کے یہاں دعوت ہے، ان کی آمدنی حرام ہے، بس ایک مسلمان نے دعوت دی، چلے گئے، بعد میں پتہ چلا کہ ان کی آمدنی کچھ مشکوک ہے، فرمایا کرتے تھے کہ اس دعوت کا یہ اثر تھا کہ کافی عرصہ تک اس کھانے کی ظلمت قلب میں محسوس ہوتی رہی، وہ اس طرح کہ دل میں کافی عرصے تک فاسد خیالات آتے رہے اور ناجائز کاموں کی طرف طبیعت کا میلان ہوتا رہا، بہرحال جن اللہ والوں کے قلوب مجلی اور مصفی ہوتے ہیں، ان کے قلوب پر ذرا سا دھبہ بھی لگ جائے، تو ان کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ قیامت آگئی۔

بہ دل سالک ہزاراں غم بود
گر ز باغ دل خلالے کم بود

چونکہ ہم لوگوں کے ذوق اور مزاج خراب ہو گئے ہیں، اس لیے نہ طاعت کے نور اور لذت کا ہم کو ادراک ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے سلب ہونے کا ادراک ہوتا ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ جس دن کوئی شخص بدنظری کے گناہ میں مبتلا ہوگا، اس دن اس کی طاعات میں نور نہیں ہوگا اور اس طاعت کے فوائد اس کو حاصل نہیں ہوں گے، اس لیے حضرت نے آگے فرمایا کہ اس کا علاج اہتمام سے کرنا چاہیے۔

## شہوانی ونفسانی خواہشات کا مادہ فی نفسہ شر نہیں:

پھر علاج کے بارے میں فرمایا کہ ''ظاہر ہے کہ یہ مادہ خلقی ہے، پس وہ شر نہیں'' یعنی یہ شہوت اور نفسانی خواہشات کا دل میں پیدا ہونا، یہ بذات خود شر نہیں، کیونکہ یہ خلقی اور فطری ہے، کوئی انسان اس مادے سے خالی نہیں، بلکہ اس مادے سے انسان کا خالی ہونا عیب ہے، لہٰذا اپنی ذات میں یہ شر نہیں، بلکہ اس میں بہت سی مصالح ہیں، کیونکہ اس کی بنیاد پر توالد اور تناسل قائم ہے، عالم کا نظام اس پر قائم ہے، اگر یہ مادہ نہ ہو تو عالم کا نظام فنا ہو جائے گا، البتہ اس مادہ کے ناجائز اقتضا پر عمل کرنا شر ہے، یعنی مادہ خود شر نہیں اور خود طبیعت میں میلان اور خواہش پیدا ہونا شر نہیں، لیکن اس کے ناجائز تقاضے پر عمل کرنا شر ہے اور اس کے جائز تقاضے پر عمل کرنا شر نہیں بلکہ خیر محض ہے۔

## شہوانی ونفسانی خواہشات کے مادہ کے جائز استعمال پر ثواب:

حدیث شریف میں ہے کہ ایک شخص اپنے گھر میں داخل ہوا اور اپنی بیوی کو محبت کی نگاہ سے دیکھا اور بیوی نے شوہر کو محبت کی نگاہ سے دیکھا، تو اللہ تعالیٰ دونوں کو رحمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس پر اجر و ثواب عطا فرماتے ہیں، لہٰذا اس مادے کے جائز استعمال پر تو ثواب ملتا ہے، اس لیے نہ مادہ بذات خود شر ہے، نہ اس مادے کو صحیح جگہ پر استعمال کرنا شر ہے، بلکہ خیر ہے، لیکن صرف اس مادے کا غلط جگہ پر استعمال کرنا اور اس مادے کے غلط تقاضے پر عمل کرنا شر ہے، اور وہ عمل کرنا اختیاری ہے اور اختیاری کی ضد بھی اختیاری ہے پس فعل سے رکنا اختیاری ٹھہرا اور اس میں کوئی معذوری نہیں، پس ہمت کیجئے، یہی اس کا جواب ہے، چندے تکلف ہوگا، پھر عادت ہو جائے گی، پھر لذت اور فرحت ہوگی۔

## بدنظری کا علاج کوئی وظیفہ نہیں بلکہ ہمت ہے:

اشارہ اس طرف فرمادیا کہ اس کے علاج کے لیے کوئی ایسا نسخہ نہیں ہے، کہ وہ نسخہ گھول کر پلا دیا جائے اور اس کے بعد دل میں گناہ کا کوئی تقاضہ ہی پیدا نہ ہو اور نہ کوئی ایسا وظیفہ ہے جو پڑھ کر پھونک دیا جائے اور پھر شہوت کا کوئی تقاضا دل میں پیدا نہ ہو، ایسا نہیں ہوگا، پہلے بتا

دیا کہ یہ مادہ بذات خود شر نہیں اور اس کے جائز تقاضے پر عمل کرنا بھی شر نہیں، ہاں اس کے غلط تقاضے کے دل میں پیدا ہونے کے بعد اس کے اوپر عمل کرنا شر ہے اور وہ اختیاری ہے اور جب عمل اختیاری ہے تو اس سے بچنا بھی اختیاری ہے اور جو بھی کام اختیاری ہو، اس کے لیے ہمت کی ضرورت ہے، آدمی ہمت سے کام لے اور ہمت کو استعمال کرے۔ بعض اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر میں نے یہ کام چھوڑا، تو جان پر بن جائے گی، اس لیے میں یہ کام نہیں چھوڑ سکتا، یعنی یہ کام عقلی اعتبار سے تو بے شک اختیاری ہے، لیکن عملی زندگی میں آکر دیکھو، تو یہ معاملہ غیر اختیاری معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ اس کام کو چھوڑنے سے مجھ پر قیامت آجاتی ہے، پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے، لہٰذا یہ کیسے کہہ دیا جائے کہ یہ کام اختیاری ہے؟

## چھوٹتی نہیں منہ سے یہ کافر لگی ہوئی:

بات دراصل یہ ہے کہ جتنے بھی افعال اختیاری ہوتے ہیں، ان کا شدید تقاضہ ہونا اور ان کے چھوڑنے پر شدید تکلیف کا مرتب ہونا، یہ سب چیزیں اضافی ہیں، حقیقی نہیں ہیں، لہٰذا ایک شخص کی نسبت سے کم ہوگی اور دوسرے شخص کی نسبت سے زیادہ ہوگی، ایک شخص کو ایک کام کے چھوڑنے میں بڑی تکلیف ہو رہی ہے اور دوسرے شخص کو کم تکلیف ہو رہی ہے، تیسرے کو اور کم ہو رہی ہے، چوتھے کو اور کم ہو رہی ہے، لہٰذا کسی فعل کا اختیاری اور غیر اختیاری ہونا یہ حقیقی ہے اور اس اختیاری فعل کے چھوڑنے پر تکلیف کا شدید ہونا اضافی ہے، جو افراد کے اختلاف سے مختلف ہوتا رہتا ہے، اس لئے کہ ایک آدمی خود اس فعل کے چھوڑنے کو اپنے حق میں شدید بنا لیتا ہے اور دوسرا آدمی اس فعل کو اپنے حق میں خفیف بنا لیتا ہے، اگر ایک کام کو بار بار کر کے تم اپنے آپ کو اس کا عادی بنا لوگے، تو عادی بنانے کے نتیجے میں اس کا چھوڑنا بہت دشوار ہو جائے گا، لہٰذا فی نفسہ چھوڑنا دشوار نہیں تھا، لیکن اپنے اختیاری عمل سے عادت ڈال کر اس کو اپنے حق میں مشکل بنا دیا اور جب اس کام کو چھوڑنا مشکل بنا دیا، تو اب یہ کہہ دیا کہ اس کا چھوڑنا غیر اختیاری ہے، ارے بھائی جس طرح تم نے اسے عادت بنا کر مشکل بنایا تھا اسی طرح عادت ڈال کر چھوڑ بھی سکتے ہو۔

دیکھئے! پان، بیڑی، سگریٹ، تمباکو وغیرہ اگر یہ چیزیں کسی شخص کو پہلی مرتبہ کھلاؤ گے، تو اس کو چکر آئیں گے، الٹی ہو جائے گی، اگر اس سے کہا جائے کہ آئندہ یہ مت

کھانا، وہ کہے گا کہ میں توبہ کرتا ہوں، آئندہ نہیں کھاؤں گا، اسی دن چھوڑنے کو تیار ہو جائے گا، بلکہ کھانے کے مقابلے میں چھوڑنا زیادہ آسان ہوگا، لیکن دوسرے دن آپ نے اس کو وہ چیز کھلا دی تو پہلے دن کھانے سے جو تکلیف ہوئی تھی، اب دوسرے دن اس سے کم تکلیف ہوگی، تیسرے دن پھر کھلایا تو اب تکلیف اور کم ہوگی، ہوتے ہوتے اب اس کی عادت بن گئی، اب نہیں چھوٹتی۔

چھوٹتی نہیں منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

اب اتنی عادت ہوگئی کہ اب اگر اس کو چھوڑے تو قیامت گزر جائے، اب آپ بتائیں کہ کیا تمباکو زندگی کے لیے ایسا ناگریز تھا کہ اس کو چھورنا بڑا مشکل تھا، ایسا نہیں تھا بلکہ تم نے اپنے عمل سے اس کی عادت ڈال لی اور اتنی عادت ڈالی کہ وہ تمہاری زندگی کا ایک حصہ بن گیا اور اب اس کو چھوڑنا تمہیں مشکل نظر آنے لگا، اس سے معلوم ہوا کہ فی نفسہ اس کو چھورنا مشکل نہیں تھا، لیکن تم نے خود اپنے اختیاری عمل سے اس کو مشکل بنا دیا اور جب تم نے اپنے اختیاری عمل سے اس کو مشکل بنا دیا، تو اب تم اپنے اختیاری عمل سے اس کو آسان بھی بنا سکتے ہو، لہذا اس کو اسی طریقے سے، اختیاری عمل کے ذریعہ چھوڑنا چاہو گے، تو چھوٹ بھی جائے گا۔

## عادت بن جانے کے بعد عربوں کے قہوہ کی کڑواہٹ ختم:

عربوں کے یہاں قہوہ کا بڑا رواج ہے، جب میں چھوٹا تھا اور دارالعلوم نانک واڑہ میں قدوری، کافیہ وغیرہ پڑھتا تھا، اس زمانے میں قطر کے ایک شیخ کراچی آگئے، ان سے ملاقات کے لیے طلبہ کا ایک وفد جارہا تھا، میں بھی ان کے ساتھ چلا گیا، جب ہم وہاں پہنچے تو سب سے پہلے انہوں نے قہوہ کے ذریعہ ہماری خاطر تواضع کی، اس سے پہلے قہوہ نہ کبھی پیا تھا، نہ چکھا تھا، چنانچہ چھوٹے چھوٹے فنجانوں میں ذرا ذرا سا قہوہ سب کے سامنے لاکر رکھا گیا، ہم اپنے دل میں سوچ بیٹھے تھے کہ یہ قہوہ بڑا میٹھا اور لذیذ ہوگا، لیکن جب اس کو منہ سے لگایا، تو وہ اتنا کڑوا تھا کہ اس کو حلق سے اتارنا مشکل ہوگیا، مجھے یاد ہے کہ اس وقت میرے سر میں درد ہوگیا اور یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس ایک گھونٹ کو کس طرح اگلیں یا کس طرح اس کو نگلیں؟ میں سوچنے لگا کہ یا اللہ یہ عرب لوگ تو یہ قہوہ ہر وقت پیتے رہتے ہیں اور

ہمارے تو حلق سے بھی نہیں اتر رہا ہے، بہر حال پہلی مرتبہ اس وقت قہوہ پیا پھر رفتہ رفتہ عربوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا شروع ہوا، تو وہاں یہ قہوہ ہر وقت چلتا ہی تھا، ہم نے اس کو تھوڑا تھوڑا کر کے پینا شروع کیا، یہاں تک کہ اب وہ اتنا لذیذ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی ساری کرواہٹ اور تلخی جاتی رہی اور اس کے پینے میں مزہ آنے لگا۔

## عادت بن جانے کے بعد زیتون کی کڑواہٹ ختم:

۱۹۶۳ء میں جب ہوش کے عالم میں پہلی بار سعودی عرب گیا، جدہ میں ایک بازار میں جانا ہوا، وہاں دیکھا کہ ایک دکان میں تھال کے اندر زیتون رکھے ہوئے ہیں اور ان زیتون سے تیل بھی رس رہا تھا، زیتون کا نام قرآن کریم میں پڑھا تھا، لیکن کبھی زیتون کو نہ دیکھا تھا، نہ کھایا تھا، نہ چکھا تھا، البتہ اس کی تعریف سنی تھی کہ زیتون بڑا لذیذ ہوتا ہے، اب دماغ میں یہ بات تھی کہ یہ زیتون میٹھا ہوگا اور دیکھنے میں بھی ایسا لگتا تھا کہ یہ زیتون میٹھا ہوگا، چنانچہ زیتون خریدا اور میٹھا سمجھ کر منہ میں رکھا، لیکن جیسے ہی منہ میں رکھا تو کڑوا ہونے کی وجہ سے اس کو نگلنا مشکل ہوگیا، لیکن پھر رفتہ رفتہ اس کو کھاتے کھاتے عادت ہوگئی اور اب وہ اتنا لذیذ معلوم ہونے لگا کہ کوئی حدوحساب نہیں۔

بہر حال یہ کہنا کہ فلاں عادت کو چھوڑنا منطقی اعتبار سے تو اختیاری ہے، لیکن حقیقت میں وہ ہمارے اختیار سے باہر ہے، دراصل وہ ہمارے اختیار سے اس لیے باہر ہو رہی ہے کہ ہم نے خود اپنے عمل سے اس کی عادت ڈال لی اور اب اس عادت پڑنے کے نتیجے میں ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس کا چھوڑنا بہت مشکل ہے، لیکن جب تم ایک مرتبہ چھوڑنے کا ارادہ کرلو گے اور عزم اور ہمت کرلو گے، تو وہ عادت اس طرح چھوٹ جائے گی کہ پھر یاد بھی نہیں آئے گی۔

## کسی کام کو چھوڑنا بندے کے اختیار میں ہے:

اس لیے حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ مت سمجھو کہ اس کام کو چھوڑنا غیر اختیاری ہے، بلکہ اختیاری ہے، البتہ صرف ہمت کی ضرورت ہے، ہمت کو استعمال کر کے پختہ ارادہ کرلو، کہ مجھے یہ چیز چھوڑنی ہے، چاہے اس کے نتیجے میں میرے دل پر آرے

چل جائیں، چاہے میرے اوپر پہاڑ ٹوٹ جائیں، لیکن میں اس کام کو چھوڑوں گا، اس طرح کرنے سے چند روز تکلیف ہوگی، دقت ہوگی، پھر رفتہ رفتہ عادت ختم ہوجائے گی، اس کے بعد پھر کبھی اس کام کا دل میں تقاضہ بھی ہوگا تو اس وقت بچنا دشوار نہیں ہوگا، بلکہ پھر اس کام سے بچنے میں ایسی لذت اور فرحت حاصل ہوگی کہ اس کے مقابلے میں اس کام کے کرنے کی لذت اور فرحت ہیچ ہوگی۔

## صحت کی لذت کے سامنے کھجانے کی لذت ہیچ ہے:

حضرت والا نے اس کی ایک خوبصورت مثال دی ہے، جیسے ایک آدمی کے جسم پر خارش ہورہی ہو، تو اس کو کھجانے میں بڑا مزا آتا ہے، چنانچہ یہ مقولہ مشہور ہے کہ

''دنیا میں دو کاموں کا مزہ ہے۔ ایک کھاج میں ایک راج میں''

یعنی ایک کھجانے میں اور دوسرا حکومت کرنے میں بڑا مزہ ہے، بہرحال کھجلانے میں بڑا مزاہ آتا ہے، لیکن اس کھجلانے کا انجام یہ ہے کہ جتنا کھجائے گا، اتنا ہی وہ زخمی ہوگا اور خارش اور زیادہ بڑھے گی، اتنی ہی بیماری بڑھے گی، اب ڈاکٹر اس سے یہ کہہ رہا ہے کہ اپنے جسم کو مت کھجاؤ، اس سے تمہاری بیماری اور زیادہ ہوگی، وہ کہتا ہے کہ روکنا میرے اختیار سے باہر ہے، ڈاکٹر کہتا ہے کہ دیکھو تمہاری صحت اس پر موقوف ہے کہ کھجال مت کرو، اب وہ بیمار ڈاکٹر کے کہنے پر کھجال کو روکتا ہے، لیکن روکنے میں اس کو بڑی تکلیف مشقت اور دقت ہورہی ہے، کھجلی اٹھ رہی ہے، طبیعت کھجلی کرنے کو چاہ رہی ہے، مگر اس نے زبردستی اپنے آپ کو روک لیا، اب شروع میں اس کو بڑی تکلیف ہوئی، لیکن جب وہ مسلسل رکتا رہا، تو رفتہ رفتہ اس کو عادت ہوگئی، اب خارش سے رکنے میں دقت اور پریشانی نہیں ہورہی ہے، یہاں تک کہ جب نہ کھجانے کے نتیجے میں بیماری دور ہوگئی اور خارش ہی ختم ہوگئی، تو اب صحت حاصل ہوگئی۔ اور صحت کی لذت اس خارش کرنے کی لذت کے سامنے ہیچ ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں، کیونکہ کھجانے میں جو لذت آرہی تھی وہ جھوٹی لذت اور جھوٹا مزہ تھا، اب صحت کی جو لذت اور فرحت حاصل ہورہی ہے، یہ حقیقی لذت اور مزہ ہے۔

## تقوی کی لذت کے سامنے بدنظری کی لذت ہیچ ہے:

اسی طرح بدنگاہی کے نتیجے میں جو لذت حاصل ہو رہی ہے، وہ خارش والی لذت ہے، اس کو چھوڑنے سے تکلیف ضرور ہوگی، لیکن ایک مرتبہ تکلیف اٹھانے کے بعد جب انسان چھوڑنے کا عادی ہو جائے گا اور اس کی نگاہ پاکیزہ ہو جائے گی اور اس کو عفت اور عصمت حاصل ہو جائے گی اور تقویٰ کی لذت حاصل ہوگی ،تو اس کے آگے گناہوں کی لذتیں ہیچ ہیں ،ان کی کوئی حقیقت نہیں، کیونکہ گناہ سے بچنے میں ایک طرف صحت کی لذت ہے اور دوسری طرف گناہ سے بچنے میں، اس تصور کی لذت ہے کہ میں نے ایک اپنی بڑی خواہش کو اپنے محبوب حقیقی کے لیے قربان کر دیا ہے، جب کسی سے حقیقی محبت ہوتی ہے،تو اس کے آگے اپنی خواہشات کو کچلنے میں بڑی لذت حاصل ہوتی ہے، کیونکہ اس وقت یہ تصور کرتا ہے کہ

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی ☆ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

## بدنظری کا علاج:

ایک اور جگہ پر حضرت والا فرماتے ہیں کہ ایسے موقع پر انسان دو کام کرے ایک یہ کہ اپنی ہمت کو استعمال کر کے چل کھڑا ہو، اور دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ سے اس ہمت کے اندر قوت عطا ہونے کی دعا کرے، کہ یا اللہ میری ہمت کمزور ہے، میں اپنی طرف سے یہ ارادہ کرتا ہوں کہ اب یہ نگاہ غلط جگہ نہیں اٹھے گی لیکن یا اللہ! میں کیا اور میرا ارادہ کیا؟ میری ہمت کیا اور میرا عزم کیا؟ اے اللہ ہمت بھی آپ کے قبضہ قدرت میں ہے اور ارادے بھی آپ کے قبضہ قدرت میں ہیں، اے اللہ اپنی رحمت سے میری ہمت میں قوت عطا فرما دیجئے اور اس عزم پر مجھے ثبات عطا فرما دیجئے ۔اے اللہ مجھ سے اس شر کو دور فرما دیجئے اور یہ دعا کرے کہ

﴿اَنْ لَا تَصْرِفْ عَنِّیْ کَیْدَھُنَّ اَصْبُ اِلَیْھِنَّ وَاَکُنْ مِنَ الْجَاھِلِیْنَ﴾
(سورۃ یوسف)

جب انسان یہ دعا کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ ہمت اور قوت عطا فرما دیتے ہیں اور انسان کو اس گناہ سے نجات مل جاتی ہے حدیث شریف میں ہے کہ:مَنِ اسْتَعَفَّ یُعِفَّهُ اللّٰهُ جو عفت حاصل کرنا چاہے، تو اللہ تعالیٰ اس کو عفیف بنا ہی دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا وعدہ

ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو گناہوں سے بچنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔ آمین

## ہمت میں قوت پیدا کرنے کا طریقہ:

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا کہ

> ''حضور کی تنبیہ سے معلوم ہوا کہ بدنظری فعل اختیاری ہے اور علاج ''استعمال اختیار'' ہے مگر باوجود اس کے پر بھی اختیار کے استعمال کی ہمت نہیں ہوتی اور گناہ ہو جاتا ہے ہمت میں قوت نہیں'' (انفاس عیسیٰ ص ۱۴۴)

یہ وہی بات ہے، جس میں کسی نہ کسی گناہ کے سلسلے میں آج ننانوے فیصد افراد مبتلا ہیں، معلوم ہے کہ یہ چیز اختیار میں ہے، اس کے باوجود اس کو چھوڑنے کی ہمت نہیں ہوتی اور ہمت میں قوت نہیں، جیسا کہ غالب شاعر کہتا ہے کہ۔

جانتا ہوں ثواب طاعت وزھد ☆ پر طبیعت ادھر نہیں آتی

مطلب یہ ہے کہ علمی اور عقلی طور سے معلوم ہے کہ یہ راستہ اچھا ہے اور یہ راستہ برا ہے، اعتقاد بھی ہے، لیکن طبیعت اس طرف راغب نہیں ہوتی، اس کا کیا علاج؟

جواب میں حضرت والا فرماتے ہیں کہ

''قوت بھی استعمال ہی سے پیدا ہوگی۔''

یہ نہیں ہے، کہ پہلے سے فرض کر لیا گیا کہ ہمت کمزور ہے، لہٰذا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے، بلکہ ہمت کو استعمال کرو اور اس کو جتنا استعمال کرو گے، اس میں اتنی ہی قوت آئے گی۔

دنیا کی اکثر چیزیں ایسی ہیں کہ ان کو جتنا استعمال کرو گے، تو استعمال کے نتیجے میں آہستہ آہستہ کمزور پڑتی جاتی ہیں، مثلاً گاڑی ہے، اس کو جتنا استعمال کرو گے، وہ کمزور ہوتی چلی جائے گی، آخر میں جا کر ٹھپ ہو جائے گی، مکان کو استعمال کرو گے، آہستہ آہستہ بوسیدہ ہوتا چلا جائے گا، کپڑا استعمال کرنے کے نتیجے میں پرانا ہوتا جائے گا، لیکن بعض چیزیں اللہ تعالیٰ نے ایسی بنائی ہیں کہ ان کو جتنا استعمال کرو گے، ان میں اور زیادہ طاقت آئے گی، جیسے حافظہ، اس حافظہ کو جتنا استعمال کیا جائے گا، اتنی ہی قوت آئے گی، کوئی یہ نہ سوچے کہ اگر میں نے قرآن حفظ کر لیا، تو پھر دوسری چیزیں یاد کرنے کی گنجائش نہیں رہے گی، ایسا نہیں ہے، بلکہ اس کے اندر قوت پیدا ہوگی، اسی طرح ہمت بھی ایسی چیز ہے کہ اس کو انسان جتنا استعمال

کرے گا، اتنی قوت پیدا ہوگی، اللہ تعالیٰ اس میں مزید طاقت پیدا فرمادیں گے۔

## حسن پسندی کا علاج:

ایک صاحب نے حضرت والا کو لکھا کہ

مجھ میں اس قدر حسن پسندی ہے کہ معمولی اشیاء کو بھی نہایت قرینہ اور خوش ترتیبی سے رکھتا ہوں اور حسن صورت کی طرف بھی بے حد کشش ہے۔ (انفاس عیسیٰ ص ۱۴۵)

حضرت والا نے اس کا جواب عربی میں لکھا، اس سے پتہ چلا کہ وہ صاحب عالم ہوں گے، چنانچہ لکھا کہ

بَعْضُهُ خَيْرٌ، فَاشْكُرُوْا عَلَيْهَا، وَبَعْضُهُ شَرٌّ، فَاصْبِرُوْا عَنْهَا، اَیْ غَضُّ الْبَصَرِ حَيْثُ اَمَرَ الشَّارِعُ بِالْغَضِّ وَلَوْ بِتَكَلُّفٍ شَدِيْدٍ يَحْتَمِلُ زُهُوْقَ الرُّوْحِ فَاِنَّ اللّٰهَ غَيُوْرٌ يَشْتَدُّ غَيْرَتُهُ عَنِ النَّظْرِ اِلٰى مَا نَهٰى اللّٰهُ اَنْ يُنْظَرَ اِلَيْهِ فَالْحَذْرُ اَلْحَذْرُ اَنْ يَغِيْظَ الْمَحْبُوْبُ الْاَكْبَرُ. (انفاس عیسیٰ ص ۱۴۵)

یعنی جو حالت آپ نے لکھی ہے، اس کا کچھ حصہ تو خیر ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اچھی چیز کی طرف رغبت عطا فرمائی اور اس کا حق ادا کرنے کی توفیق ہوتی ہے، تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اور کچھ حصہ شر ہے، وہ ہے حسن صورت کی طرف میلان، جس کا دیکھنا جائز نہیں، تو اس پر صبر کرو اور اپنی نگاہ کو نیچی رکھو، اگرچہ اس میں اتنی تکلیف ہو کہ جان نکلتی محسوس ہوتی ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ بھی بڑے غیرت مند ہیں اور اللہ تعالیٰ کو اس بات سے بڑی غیرت آتی ہے، کہ بندہ ایسی چیز کو دیکھے، جس کے دیکھنے کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے، جب تمہارے اندر حسن پسندی ہے اور حسن اچھا لگتا ہے اور حسن سے محبت ہے، تو پھر حسن کا جو کمال ہے، وہ تو اللہ جل شانہ کے پاس ہے اور وہی محبوب اکبر ہیں، پھر ان دنیا کے حسن کی خاطر اس محبوب اکبر کو ناراض کرنا کیسی غیرت کی بات ہے؟ اس سے بچو۔

## وسوسہ، حرام کاری اور اس کا علاج:

ایک صاحب نے حضرت والا کو لکھا کہ

''شیطان یہ سمجھا تا ہے کہ اللہ تعالیٰ اگران مرغوب صورتوں پر جائز شرعی قبضہ دیدے تو اس وقت کیا کرو گے؟ سو جائز قبضہ سمجھ کر حظ کا خیال کرواور حظ حاصل کرو ،حرام کاری کا خیال مت کرو۔'' (انفاس عیسیٰ ص ۱۴۵)

حضرت والا نے جواب دیا کہ

خیال کا علاج بھی خیال ہے (یعنی اس خراب خیال کا علاج بھی ایک دوسرا خیال ہے وہ یہ کہ )اس وقت یہ خیال کرو کہ اگراس عورت کے شوہر کواس خیال کی اطلاع کردوں،تو کتنی رسوائی ہو(اس کو یہ اطلاع کردوں کہ میں جو خیال کررہا ہوں یہ کوئی ناجائز خیال نہیں کررہا ہوں، بلکہ یہ خیال کررہا ہوں کہ تو مرجائے اور تیری بیوی کے ساتھ میرا جائز تعلق قائم ہوجائے،تو اس وقت کتنی رسوائی ہوگی ) تو اللہ تعالیٰ تو بے کہے ہی اس خیال پر مطلع ہیں، کتنی شرم کی بات ہے کہ وہ اس ارادے کو دیکھ رہے ہیں، نیز اس سلسلے میں عقوبت جہنم کو متحضر کرکے اس میں لگ جائے ،یا نفس سے یہ کہے کہ جس طرح تو مجھے دوسری عورتوں سے حظ حاصل کرنے کو کہتا ہے،اسی طرح اگر کوئی شخص میری بیوی سے حظ حاصل کرے اور مجھ کو اس کا علم ہوجائے،تو میں کیا کروں گا؟ ظاہر ہے کہ مرنے مارنے پر تیار ہوجاؤں گا، اسی طرح کیا دوسروں کی غیرت نہ ہوگی؟ کہ اگران کو خبر ہوجائے تو وہ مجھے مار ڈالیں اور ہر طرح کے ضرر پہنچانے پر آمادہ ہوجائیں، پھر جہنم کا نقشہ پیش نظر کرلے، علاوہ اس کے شیطان کی وہ تاویل ایسی ہے کہ کوئی شخص سچ مچ کسی عورت سے زنا کرنے لگے اور یہ سوچ لے کہ اگر اس پر جائز قدرت ہو تو اس طرح مقاربت کروں اوراس کے حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں یہی حکم ہے زنا بالقلب کا۔''

(انفاس عیسیٰ ص ۱۴۵)

حضرت والا نے جواب میں یہ جو فرمایا کہ آدمی یہ سوچے کہ میری بیوی اور میری بہن اور میری بیٹی کے بارے میں اگر دوسرا شخص اس طرح بات سوچے،تو مجھے غیرت آئے گی یا نہیں؟اور میں مرنے مارنے کے لیے تیار ہوجاؤں گا یا نہیں؟

## حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زنا کی اجازت طلب کرنے کا واقعہ:

یہ بات حدیث سے ماخوذ ہے،''مجمع الزوائد'' میں یہ حدیث ہے، کہ ایک صاحب حضور

اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئے اور آکر عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں آپ کے ہر حکم پر عمل کرنے کو تیار ہوں، لیکن ایک اجازت مانگتا ہوں، وہ یہ کہ مجھے زنا سے صبر نہیں ہوتا، آپ مجھے زنا کی اجازت دے دیں؟ اب آپ اندازہ لگائیں کہ وہ شخص کس چیز کی اجازت طلب کررہا ہے اور کس سے طلب کر رہا ہے؟ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو قریب بلایا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا

اور فرمایا کہ یہ بتاؤ یہ زنا تم جس عورت کے ساتھ کرنا چاہتے ہو، وہ عورت کسی کی ماں ہوگی، کسی کی بہن ہوگی، کسی کی بیٹی ہوگی، کسی کی خالہ ہوگی۔

اگر دوسرا کوئی شخص یہی عمل تمہاری بہن کے ساتھ کرنا چاہے، تو کیا تم پسند کرو گے؟ اس نے جواب دیا، نہیں یارسول اللہ!

کوئی تمہاری بیٹی کے ساتھ یہ عمل کرنا چاہے، تو تم پسند کرو گے؟ اس نے جواب دیا، نہیں یارسول اللہ!

کوئی تمہاری بیوی کے ساتھ یہ عمل کرنا چاہیے تو تم پسند کرو گے؟ نہیں یارسول اللہ!

کوئی تمہاری خالہ کے ساتھ یہ عمل کرنا چاہے تو کیا تم پسند کرو گے؟ اس نے کہا نہیں یارسول اللہ!

پھر فرمایا کہ جب دوسروں کے اس عمل کو تم گوارا نہیں کر سکتے اور اس کے عمل کے نتیجے میں تمہیں تکلیف پہنچتی ہے، تو پھر وہی کام تم دوسروں کی خواتین کے ساتھ کرنا چاہتے ہو، کیا ان کو تکلیف نہیں ہوگی؟ کیا وہ لوگ اس کو گوارہ کرلیں گے؟ وہ صاحب کہتے ہیں کہ جب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آیا تھا، اس وقت میں یہ سوچ رہا تھا کہ مسلمان ہونے میں سب سے بڑی رکاوٹ میرے لیے زنا کو چھوڑنا ہے، لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باتیں سن کر میرے دل میں اس عمل کی ایسی نفرت ہوگئی کہ پھر اس عمل کی طرف رجحان نہیں ہوا۔

## عورت کو دیکھنا کب گناہ ہے اور کب نہیں؟

ایک صاحب نے یہ پوچھا کہ بعض مقامات ایسے ہوتے ہیں، جہاں مردوں کو عورتوں

سے واسطہ پڑتا ہے، مثلاً زنانہ اشیاء کی فروخت کرنے والے دکاندار، زیورات کے تاجر، ہسپتال کے ڈاکٹر اور ملازم وغیرہ، ایسے مواقع پر بدنگاہی سے بچنے کے طریقے پر روشنی ڈالیں تو بڑی عنایت ہوگی۔

یہ حضرات واقعۃً سب سے زیادہ مشکل میں گھرے ہوئے رہتے تھے، کیونکہ ہر وقت خواتین سے سابقہ رہتا ہے، جس کی وجہ سے بچنا آسان نہیں ہوتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے انسان کو کوئی ایسا حکم نہیں دیا، جس پر عمل کرنا ناممکن ہو۔

پہلی بات تو یہ سمجھ لیں کہ عورت کو دیکھنا اور اس کے چہرے پر نظر ڈالنا بذات خود گناہ نہیں، بلکہ یہ اس وقت گناہ ہوتا ہے، جب لذت لینے کی نیت سے نظر ڈالے یا اس وقت عملاً التذاذ ہو رہا ہو، اس وقت نظر ڈالنا حرام ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر کسی عمل کے دوران، کسی عورت سے بات چیت کرنے کی ضرورت پیش آ گئی اور اس بات چیت کے دوران نہ لذت لینے کا قصد ہے اور نہ عملاً التذاذ ہوا، تو اس حد تک عورت کو دیکھنا حرام نہیں، لیکن چونکہ اس کا معلوم کرنا مشکل ہے کہ کہاں لذت کا قصد ہے؟ اور کہاں لذت کا قصد نہیں؟ یا کہاں عملاً التذاذ ہو رہا ہے؟ اور کہاں نہیں ہو رہا ہے؟ اس لیے یہ کہہ دیا گیا کہ عورت کو دیکھو ہی مت، اسی وجہ سے قرآن کریم نے بھی غض بصر کا حکم دیا ہے، اس لیے کہ تم کہاں کہاں یہ امتیاز کرتے رہو گے کہ التذاذ ہو رہا ہے یا نہیں ہو رہا ہے؟ اور کہاں قصد لذت ہے اور کہاں نہیں ہے؟ لہٰذا آسان راستہ یہی ہے کہ نظر ہی مت ڈالو۔



## کام کے دوران عورتوں سے واسطہ پڑے تو کیا کیا جائے؟

اب جن مردوں کو بکثرت خواتین سے سابقہ پڑتا ہے، ان کے لیے سب سے پہلا حکم یہ ہے کہ غض بصر سے کام لیں، اس لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ خواتین سے معاملہ کرتے وقت ان کی طرف نظر بھی اٹھائے، بہت سے لوگوں کو میں نے خود دیکھا ہے کہ وہ ایسے مواقع پر کام کرتے ہیں، مگر ان کی نگاہ نہیں اٹھتی، بلکہ نگاہ نیچی رہتی ہے اور کام کرتے رہتے ہیں اور اگر بالفرض کہیں نظر اٹھانے کی ضرورت پیش آ ہی جائے، تو اس نظر کو التذاذ سے محفوظ رکھے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ یا اللہ میری حفاظت فرمائیے اور اگر نظر پڑتے وقت کچھ قصد لذت ہو جائے تو فوراً استغفار کرے اور توبہ کرے۔

## نگاہ نیچی رکھنے پر حضرت ڈاکٹر عبدالحئی عارفیؒ کا مجاہدہ:

ہمارے ڈاکٹر عبدالحئی صاحب قدس اللہ سرہ ہومیو پیتھک ڈاکٹر تھے اور مطب چلاتے تھے اور حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کو بتا کر یہ مطب شروع کیا تھا، پہلے وکالت کرتے تھے، جب مطب شروع کیا تو وہاں پر مرد بھی آنے لگے اور عورتیں بھی آنے لگیں، حضرت فرماتے تھے کہ ابتداء میں بعض اوقات علاج کے لیے گھر پر بھی چلا جاتا تھا، ایک مرتبہ مجھے ایک گھر میں علاج کے لیے بلایا گیا، وہاں ایک خاتون بیمار تھیں، جب میں وہاں پہنچا، تو دیکھا کہ اس خاتون کا لباس بھی پوری طرح ساتر نہیں تھا، میں بڑا پریشان ہوا کہ یا اللہ! میں کس مصیبت میں پھنس گیا، پتہ نہیں کیا ہوگا؟ بہرحال اللہ تعالیٰ نے حفاظت فرمائی۔

بعد میں میں نے حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کو خط لکھا کہ حضرت میں پہلے وکالت کرتا تھا، اس میں دوسرے قسم کا فتنہ تھا اور اس ڈاکٹری میں اور قسم کا فتنہ ہے، خواتین سے ہر وقت واسطہ پڑتا ہے، میں کیا کروں؟ جواب میں حضرت والا نے دو جملے لکھے لکھا کہ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کر کے اپنی نگاہ اور دل کی حفاظت کیجیے، میں بھی دعا کرتا ہوں۔ حضرت فرماتے ہیں کہ جب یہ خط آیا، تو میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور پھر مطب میں بیٹھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے، میرا دل اس معاملہ میں پتھر ہو گیا۔

حضرت والا فرماتے ہیں کہ میں نے نگاہ کی حفاظت اس طرح کی کہ میں نے سوچا کہ یہ غض بصر کرنا اور جب عورت سامنے آ جائے تو نگاہ نیچی کرنا، یہ بڑا مشکل کام ہے، اس لیے میں نے سوچا کہ اس کی عادت کیوں نہ ڈال لی جائے کہ سامنے چاہے مرد ہو یا عورت نگاہ نیچی ہی کر کے بات کی جائے، چنانچہ میں نے اس کی مہینوں مشق کی کہ سامنے مرد ہو یا عورت، نگاہ اٹھا کر دیکھا ہی نہیں، جب بھی کسی سے بات کی، نگاہ نیچی کر کے بات کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب مجھے پتہ ہی نہیں چلتا کہ سامنے مرد ہے یا عورت، بوڑھا ہے یا جوان، ہمارا تو ایک ہی طریقہ ہے کہ نگاہ نیچی رہے۔

## اللہ کی مدد ہمت پر آتی ہے:

بات دراصل یہ ہے کہ جب آدمی ان چیزوں میں مبتلا ہوتا ہے، تو اس کو بچنا بڑا مشکل

معلوم ہوتا ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ انسان کو ایسے حالات میں مبتلا فرماتے ہیں، تو پھر آسانی بھی پیدا فرماتے ہیں، یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ بندے کو بے یار و مددگار چھوڑ دیں۔

اگر انسان بچنے کا قصد اور ارادہ کرے اور اللہ تعالیٰ سے مدد چاہے اور اپنی طرف سے تھوڑی بہت ہمت کا استعمال کرے، تو میرا تو اس پر ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ

لیکن اگر انسان بچنے کا قصد ہی نہ کرے، ارادہ ہی نہ کرے، فکر ہی نہ کرے، بلکہ غفلت میں پڑا رہے، یہ بہانہ بنائے رکھے کہ میں تو ایسی جگہ میں مبتلا ہوں، کہ بچ ہی نہیں سکتا، ہر وقت عورتوں سے واسطہ ہے، عورتیں ہر وقت سامنے آتی ہیں، میں کیا کروں؟ یہ سب بے فکری کے بہانے ہیں، ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد کا کوئی وعدہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی مدد فرمائے اور اس گناہ سے بچنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

روح کی بیماریاں اور ان کا علاج

# باب......(۳)



- غیبت اور اس کا علاج
- غیبت سے بچنے کا طریقہ
- غیبت کی معافی کا طریقہ
- غیبت مباح کی صورت

باب سوم کا پہلا بیان:

# غیبت اور اس کا علاج

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ وَعَلٰى آلِهِ وَاَصْحَابِهِ اَجْمَعِيْنَ اَمَّا بَعْدُ

## غیبت سے متعلق آیت قرآنی کا مفہوم:

ابتک ''بدنظری'' سے متعلق بیان چل رہا تھا اور اس سے بچنے کی تدبیریں بتائی گئی تھیں، آگے ایک اور باطنی بیماری کا تذکرہ ہے، وہ ہے ''غیبت''، یہ بیماری ایسی ہے کہ شاید ہی کوئی اللہ کا بندہ اللہ کی توفیق سے بچا ہوا ہو، ورنہ سب لوگ کسی نہ کسی درجے میں اس بیماری میں مبتلا ہیں اور یہ بیماری اتنی سنگین ہے کہ قرآن کریم نے اس کے لیے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں کہ کسی اور بیماری کے لیے ایسے الفاظ استعمال نہیں کئے، چنانچہ فرمایا

﴿ وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا، اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا، فَكَرِهْتُمُوْهُ ﴾ (سورہ حجرات)

یعنی تجسس نہ کرو اور تم میں سے بعض لوگ دوسرے بعض کی غیبت نہ کریں، کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مردار بھائی کا گوشت کھائے، پس تم اس کو ناپسند کرتے ہو

اس آیت میں غیبت کو مردار بھائی کا گوشت کھانے سے تعبیر کیا، ایک تو انسان کا گوشت اور انسان بھی بھائی اور بھائی بھی مردہ، کوئی بھی انسان جس کے اندر انسانیت کا ذرہ بھی موجود ہوگا، وہ اس کام کا نہ تو ارتکاب کرسکتا ہے اور نہ ہی اس کے بارے میں سوچ سکتا ہے، لیکن قران کریم کہتا ہے کہ غیبت کرنا بھی ایسا ہے جیسے مردار بھائی کا گوشت کھانا۔ اور یہ ''غیبت'' گناہ کبیرہ ہے، معمولی گناہ نہیں ہے۔

## غیبت کے گناہ کی شدت:

یہ غیبت کرنا ایسا ہی گناہ ہے، جیسے شراب پینا گناہ ہے، جیسے خنزیر کھانا گناہ ہے، جیسے چوری کرنا اور ڈاکہ ڈالنا گناہ ہے، بلکہ غیبت کرنا ان گناہوں سے زیادہ سنگین ہے، کیونکہ شراب پینے اور خنزیر کھانے کا تعلق خالصتاً حقوق اللہ سے ہے، اگر کوئی شخص شراب نوشی کرتا ہے یا خنزیر کھاتا ہے، تو وہ اپنی ذات کا گناہ کرتا ہے، اس کا حقوق العباد سے کوئی تعلق نہیں، لہٰذا اگر کبھی اللہ تعالیٰ توبہ کی توفیق عطا فرمادیں گے، تو شراب کا گناہ بھی معاف ہو جائے گا اور خنزیر کھانے کا گناہ بھی معاف ہو جائے گا، لیکن غیبت کا گناہ ایسا ہے کہ اس کا تعلق حقوق العباد سے ہے اور حقوق العباد کا اصول یہ ہے کہ یہ اس وقت تک معاف نہیں ہوتے، جب تک صاحب حق معاف نہ کردے، ہزار توبہ استغفار کرتے رہو، نماز روزے کرتے رہو، لیکن یہ معاف نہیں ہوں گے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اپنا حق تو معاف کردوں گا، لیکن اگر تم نے کسی بندے کی جان کو نقصان پہنچایا، مال کو نقصان پہنچایا یا اس کی آبرو کو نقصان پہنچایا، یا تم نے اس کی کوئی حق تلفی کی، تو جب تک وہ معاف نہیں کرے گا، جب تک اس کا حق ادا نہیں کردو گے، میں معاف نہیں کروں گا، حقوق العباد کا معاملہ اتنا خطرناک ہے، لیکن ہم نے اس کو اتنا معمولی سمجھ رکھا ہے، جیسے ناک پر مکھی آ بیٹھی اور اس کو اڑا دیا۔ اور ''غیبت'' بھی حقوق العباد میں سے ہے۔

## غیبت کی تعریف اور ایک غلط فہمی کا ازالہ:

''غیبت'' کسے کہتے ہیں؟ غیبت یہ ہے کہ کسی مسلمان کا تذکرہ اس کی پیٹھ پیچھے اور اس کی غیر موجودگی میں اس انداز سے کیا جائے، کہ اگر اس کو پتہ چلے کہ میرا تذکرہ اس انداز سے کیا گیا ہے، تو اس کو ناگوار گزرے، تو یہ غیبت ہے اور گناہ ہے۔

اب ہم اپنا جائزہ لے کر دیکھیں کہ ہم لوگ صبح سے شام تک آپس میں جو گفتگو کرتے ہیں، اس میں غیبت ہوتی ہے یا نہیں؟

بعض لوگ کہتے ہیں کہ میں اس کے بارے میں یہ بات جو کہہ رہا ہوں، میں اس کے منہ پر کہہ دوں اور ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ غیبت تو اس وقت ہوگی جب منہ پر نہ کہہ سکیں، میں تو

اس کے منہ پر کہنے کو تیار ہوں، ارے بھائی تم اس کے منہ پر کہنے کو تیار ہو یا نہ ہو، اگر وہ بات اس کی ناگواری کا سبب ہے، تو بس غیبت کی تعریف اس پر صادق آ گئی اور وہ گناہ ہو گیا اور تم نے مردار بھائی کا گوشت کھا لیا۔ العیاذ باللہ۔

## غیبت اور بہتان میں فرق:

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ میں جس شخص کی غیبت کر رہا ہوں، اس میں وہ بات واقعی موجود ہو، تو جو میں کہہ رہا ہوں، کیا پھر بھی گناہ ہے؟

تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو بات تم اس کے بارے میں کہہ رہے ہو، وہ بات اس کے اندر موجود ہے اور تم اس کی سچی برائی بیان کر رہے ہو، تو یہ غیبت ہے اور اگر تم جھوٹی بات بیان کر رہے ہو اور وہ بات اس کے اندر موجود نہیں ہے، تو پھر غیبت کے ساتھ بہتان لگانے کا گناہ بھی ہوگا۔

ایک شخص کے اندر ایک برائی موجود ہے، تم نے ایک مجلس کے اندر اس کی وہ خرابی بیان کر دی، مثلاً تم نے یہ کہہ دیا کہ فلاں آدمی تو بڑا جھوٹا ہے اور حقیقت میں بھی وہ جھوٹا ہے، تو تمہارا اس کے پیٹھ پیچھے اس کے جھوٹا ہونے کا تذکرہ کرنا، غیبت ہے اور گناہ ہے بشرطیکہ اس کو اس کو اپنا جھوٹا کہلوانا ناگوار ہو۔

اور اگر وہ جھوٹا نہیں ہے، پھر بھی تم نے اس کو جھوٹا کہہ دیا، تو اس صورت میں تم نے دو گناہ کئے، ایک غیبت کرنے کا گناہ کیا اور ایک بہتان لگانے کا گناہ کیا۔ لہٰذا غیبت بڑا سنگین گناہ ہے، آدمی اپنی زبان کو سنبھال کر رکھے اور اللہ تعالیٰ سے حفاظت کی توفیق مانگتا رہے، تب تو اس گناہ سے بچ سکتا ہے، ورنہ اس گناہ کے اندر مبتلا ہو جائے گا۔

## ایک پروفیسر کا غیبت پر تبصرہ:

میں نے ایک مرتبہ غیبت کے بارے میں ایک مضمون لکھا، ایک یونیورسٹی کے پروفیسر صاحب نے وہ مضمون پڑھ کر مجھے ایک خط لکھا، آپ نے اس مضمون میں غیبت کی بہت برائی بیان کی کہ یہ غیبت گناہ کبیرہ ہے، حرام اور ناجائز ہے، اس کو چھوڑنا چاہیے، میں نے اس

غیبت پر بہت غور کیا، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر ''غیبت'' کو زندگی سے نکال دیں، تو یہ زندگی پھیکی ہے، اس میں پھر کوئی مزہ ہی نہیں ہے، اس لیے کہ جب ہم دو چار آدمی مل کر بیٹھتے ہیں اور کوئی بات چیت چلتی ہے، تو اس بات چیت میں غیبت شامل نہ ہو، تو ہم پھر کس موضوع پر بات چیت کریں؟ بس پھر تو اللہ اللہ ہی کریں اور کوئی ہنسی مذاق کی بات، کوئی تفریح کی بات، کوئی دل لگی کی گفتگو ہو ہی نہیں سکتی، آپ نے اتنا لمبا چوڑا مضمون لکھا اور اس کی اتنی برائیاں بیان کی، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ یہ چاہتے ہیں کہ سب لوگ اپنی تفریح وغیرہ سے دست بردار ہو جائیں اور زندگی کا لطف ہی ختم کر دیں، چونکہ وہ پروفیسر صاحب تھے، اس لیے اپنی ذہنی سوچ کے مطابق آخر میں یہ کہا کہ میں نہیں سمجھتا کہ اسلام ایسی چیز کو منع کرے گا، جس کو انسان ہر وقت کرتا ہی ہے اور اگر نہ کرے، تو مزہ ہی نہ رہے، یہ خط لکھ کر بھیجا۔

میں نے اس خط کے جواب میں لکھا کہ جو آپ فرما رہے ہیں اگر ''غیبت'' کو زندگی سے نکال دیا جائے، تو زندگی کا مزہ ہی ختم ہو جائے گا، تو آپ کی زندگی کا مزہ تو ''غیبت'' نہ کرنے کی وجہ سے ختم ہو جائے گا، لیکن جب دوسرا شخص آپ کی غیبت کر رہا ہو، اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ جب آپ کو پتہ چلے کہ پروفیسر صاحب کے بارے میں فلاں شخص نے فلاں مجلس میں یہ بات کہی، فلاں شخص نے فلاں مجلس میں یہ بات کہی، تو اس وقت آپ کو زندگی کا لطف آئے گا یا کیا حال ہو گا؟

## تمام مسائل کے حل کا نسخہ کیمیا:

بات دراصل یہ ہے کہ ہر انسان اپنے لطف اور مزہ کو تو دیکھتا ہے، لیکن یہ نہیں دیکھتا کہ جو کام میں دوسرے کے ساتھ کر رہا ہوں، اگر دوسرا میرے ساتھ کرے، تو مجھ پر کیا گزرے گی؟ مجھ پر کیا بیتے گی؟ حدیث شریف میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسا کیمیا نسخہ بیان فرما دیا کہ ایک پیغمبر ہی ایسا نسخہ بیان کر سکتا ہے، کسی اور کے بس کا کام نہیں، اگر اس نسخے پر عمل کر لیا جائے، تو معاشرے کے سارے مسائل حل ہو جائیں اور معاشرے کے سارے جھگڑے ختم ہو جائیں، ساری خرابی اس نسخے کے فراموش کرنے کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہے، وہ نسخہ یہ ہے کہ

اَحِبَّ لِاَخِیْکَ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِکَ، وَاکْرَہْ لِغَیْرِکَ مَا تَکْرَہُ

لِنَفْسِکَ. (مسند احمد ج ۴ ص ۷۰)

یعنی اپنے بھائی کے لیے وہی پسند کرو، جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو اور دوسروں کے لیے وہی بات ناگوار سمجھو، جس کو تم اپنے لیے ناگوار سمجھتے ہو، یہ جو ہم نے دو ہرے پیمانے بنا رکھے ہیں، کہ اپنے لیے پیمانہ کچھ اور ہے اور دوسرے کے لیے کچھ اور ہے، اپنے لیے ترازو اور ہے اور دوسرے کے لیے اور ہے، اس کی وجہ سے معاشرے میں ساری خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں، لہذا ہر معاملے میں یہ دیکھو کہ میں جو معاملہ دوسرے کے ساتھ کر رہا ہوں، اگر میں اس جگہ پر ہوتا اور کبھی بھی اس سے دوسرے کے حق تلفی نہ ہو اور ناانصافی نہ ہو اور دوسرے کا حق پامال نہ ہو۔

لہذا غیبت کرتے وقت ذرا یہ سوچو کہ اگر اس جگہ میں ہوتا، مجلس کے اندر میرا اس انداز سے ذکر ہو رہا ہوتا اور میرے بارے میں یہ باتیں کہی جا رہی ہوتیں، جو میں دوسروں کے بارے میں کہہ رہا ہوں، تو مجھے یہ چیز پسند ہوتی یا نہیں؟ اگر پسند نہیں ہوتی، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ "غیبت" ہے اور اس سے بچنا ہے۔

لوگ یہ کہتے ہیں کہ غیبت سے بچا نہیں جاتا، میں کہتا ہوں کہ غیبت اختیار سے ہوتی ہے، غیر اختیاری نہیں ہوتی اور جب غیبت کرنا اختیار میں ہے، تو بچنا بھی اختیار میں ہے لہذا اس سے بچنا ضروری ہے۔

## غیبت کے جائز ہونے کے مواقع:

البتہ جس موقع پر کسی مسلمان کو نقصان سے بچانا مقصود ہو، تو اس وقت غیبت جائز ہو جاتی ہے، مثلاً ایک شخص آپ کے پاس آیا اور کہا کہ فلاں شخص نے میری بیٹی کے لیے رشتہ بھیجا ہے، آپ کی نظر میں یہ آدمی کیسا ہے؟ اب اگر آپ کی نظر میں اس شخص کی ایسی برائی ہے، جو شادی بیاہ کے معاملے میں قابل غور ہوا کرتی ہے، تو اس صورت میں اگر وہ برائی اس کو بتا دیں تا کہ وہ اور اس کی بیٹی نقصان سے بچ جائے تو یہ غیبت میں داخل نہیں ہوتا۔

یا مثلاً ایک شخص دھوکہ باز ہے اور دھوکہ دے کر لوگوں سے پیسے حاصل کر لیتا ہے، اگر آپ کسی کو یہ بتا دیں کہ اس شخص سے ذرا سوچ سمجھ کر معاملہ کرنا، یہ آدمی معاملے کا ٹھیک نہیں ہے، تو یہ غیبت نہیں، اس لیے کہ دوسرے شخص کو نقصان سے بچانا منظور ہے۔

لہٰذا جہاں دوسرے کو تنبیہ کرنے کی ضرورت ہو اور دوسرے کو دنیا یا آخرت کے نقصان سے بچانے کی ضرورت ہو، وہاں کسی کی واقعی برائی بیان کرنا غیبت میں داخل نہیں، یہ جائز ہے۔

## فاسق اور گناہ گار کی غیبت کرنا بھی جائز نہیں:

عام طور پر لوگوں میں مشہور ہے کہ جو فاسق و فاجر ہو، اس کی غیبت جائز ہے، مطلقاً اس طرح سے یہ بات درست نہیں، بلکہ جس طرح ایک نیک آدمی کی غیبت جائز نہیں، اسی طرح سے فاسق و فاجر کی غیبت بھی جائز نہیں، ہاں اگر کوئی شخص کسی گناہ کو اس طرح اعلانیہ کرتا ہے کہ اس گناہ کی اپنی طرف سے نسبت سے نہیں شرماتا، اور یہ اس کو برا نہیں سمجھتا ہے کہ یہ گناہ اس کی طرف منسوب ہو، تو اگر اس گناہ کا ذکر اس کی غیر موجودگی میں کر کے اس کی طرف منسوب کریں، تو یہ جائز ہے، مثلاً ایک آدمی علانیہ شراب پیتا ہے اور سب کو بتا کر پیتا ہے، اب اگر آپ اس کے پیٹھ پیچھے یہ ذکر کریں کہ فلاں شخص شراب پیتا ہے، ظاہر ہے کہ آپ کے اس ذکر کرنے سے اس کو کوئی تکلیف اس لیے نہیں ہوگی کہ وہ تو دوسروں کو بتاتا ہے کہ میں شراب پیتا ہوں، لہٰذا یہ غیبت ناجائز نہیں ہے۔

لیکن جس گناہ کو وہ چھپانا چاہتا ہے اور اس گناہ کا اپنی طرف منسوب ہونے کو برا سمجھتا ہے اور اس کے ذکر سے اس کو تکلیف پہنچتی ہے، تو اس کے پیٹھ پیچھے اس گناہ کا تذکرہ کرنا ناجائز ہے، چاہے وہ سچی بات ہو، وہ غیبت ہے اور حرام ہے، لہٰذا اگر زبان پر لگام نہ ڈالی جائے، تو انسان کو گناہ میں مبتلا کر دیتی ہے اور غیبت جس طرح کرنا جائز نہیں، اسی طرح سننا بھی جائز نہیں۔

## غیبت سے بچنے کیلئے حضرت تھانوی کا بیان کردہ نسخہ:

اسی لیے حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ احتیاط اس میں ہے کہ دوسروں کا تذکرہ ہی مت کرو، نہ اچھائی سے اور نہ برائی سے، کیونکہ جب دوسرے کا ذکر اچھائی سے بھی کرو گے، تو شیطان آخر میں برائی کے تذکرے میں مبتلا کر دے گا، کہ بھائی فلاں آدمی تو بڑا اچھا ہے لیکن اس میں ذرا یہ برائی بھی ہے، اس لیے بہتر یہ ہے کہ انسان

دوسرے کا ذکر ہی نہ کرے۔

## تجھ کو پرائی کیا پڑی، اپنی نبیڑ تو:

پھر دوسرے کا ذکر کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے، بس اپنی فکر کرو۔ بقول کسی کے

"تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو"

جس کو اپنے عیوب کی فکر ہو، وہ دوسروں کے عیوب کہاں تلاش کرے گا؟ جو خود بیمار ہو، اس کے پیٹ میں درد ہو رہا ہو، وہ دوسروں کی بیماریوں کی کہاں فکر کرے گا؟ جب انسان اپنی فکر میں پڑ جاتا ہے کہ میں کس عیب کے اندر مبتلا ہوں؟ میرے اندر کیا خرابی ہے؟ اس کی کس طرح اصلاح کروں؟ اور کس طرح اس کا تدارک کروں؟ تو پھر اس سے دوسرے کی غیبت نہیں ہوتی، بہادر شاہ ظفر نے بڑے اچھے اشعار کہے:

تھے جو اپنی برائی سے بے خبر رہے     ڈھونڈتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائی پر جو نظر     تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

جب اپنی برائی پر نظر پڑی، تو پتہ چلا کہ کوئی برا نہیں ہے، سب سے برا میں ہی ہوں، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اپنے نفس کے عیوب پر نگاہ ڈالنے کی اور ان کے ادراک کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

## غیبت کا عملی علاج اور اس سے بچنے کا طریقہ:

بہر حال غیبت کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشادات کی تشریح عرض کرتا ہوں، حضرت والا نے فرمایا کہ

> "سالک کے سامنے کوئی غیبت یا لایعنی کام کرے اور اس کو منع کرنے پر قدرت نہ ہو تو خود اٹھ جانا چاہیے اور اس کی دل شکنی کا خیال نہ کرے، کیونکہ دوسرے کی دل شکنی سے اپنی دین شکنی زیادہ قابل احتراز ہے، یوں اگر نہ اٹھ سکے، تو کسی بہانہ سے اٹھ جائے یا قصداً فی الفور کوئی مباح تذکرہ شروع کر دیا جائے، تاکہ وہ قطع ہو جائے۔" (انفاس عیسیٰ ص ۱۴۹)

جیسا کہ ابھی بتایا کہ غیبت جس طرح کرنا ناجائز ہے، اسی طرح سننا بھی ناجائز ہے، لہذا

اگر مجلس میں غیبت شروع ہوگئی، تو اب کیا کیا جائے؟

حضرت فرماتے ہیں کہ اگر منع کرنے پر قدرت ہے تو روک دے، روکنے کے دو طریقے ہیں، ایک طریقہ تو یہ ہے کہ صاف صاف کہہ دے کہ دیکھو اس طرح تذکرنے سے غیبت ہو جائے گی، چھوڑو اس تذکرے کو اور اگر اس طرح نہیں کہہ سکتے تو دوسرا طریقہ ہے کہ خود موضوع کلام بدل دے اور کوئی اور بات چھیڑ دے، تاکہ وہ قصہ ختم ہو جائے اور اگر ان دونوں طریقوں پر قدرت نہ ہو، تو پھر وہاں سے اٹھ جائے، اس مجلس میں نہ بیٹھے۔

## دل شکنی سے بچنا زیادہ اہم یا دین شکنی سے بچنا زیادہ اہم؟

آگے ایک اصول بیان فرمادیا کہ اس کی دل شکنی کا خیال نہ کرے، کیونکہ دوسرے کی دل شکنی سے اپنی دین شکنی زیادہ قابل احتراز ہے، ہمارے ہاں افراط اور تفریط حد درجے کی ہے، ایک طرف تو یہ عالم ہے کہ حقوق العباد کی پرواہ نہیں، جس کا جو حق چاہا مار لیا، چاہے وہ جانی حق ہو، یا مالی حق ہو اور دوسری طرف یہ ہے کہ اگر کسی کو حقوق العباد کا خیال ہے، تو وہ اس درجہ اس کے اندر آگے بڑھ جاتا ہے، کہ اس کے نتیجے میں اپنے فرائض شرعیہ کے اندر کوتاہی کرنا شروع کر دیتا ہے۔

## افراط تفریط دین سے جہالت کا نتیجہ ہے:

چنانچہ ایک ڈاکٹر صاحب تھے، ان کی بیوی نے مجھ کو بتایا کہ میرے شوہر ویسے تو بہت اچھے ہیں، لیکن مطب کے اوقات میں نماز نہیں پڑھتے، میں ان سے کہتی ہوں کہ مطب کے اوقات کے دوران جب نماز کا وقت آئے، تو نماز پڑھ لیا کرو، تو وہ جواب دیتے ہیں کہ میں تو لوگوں کی خدمت کر رہا ہوں اور یہ حقوق العباد میں سے ہے، مطب میں مریض بیٹھے ہوں اور میں اپنی نماز شروع کر دوں؟ چنانچہ وہ مطب بند کر کے رات کو جب گھر آتے ہیں تو عصر، مغرب اور عشاء تینوں نمازیں اکٹھی پڑھ لیتے ہیں، کہتے ہیں کہ میں تو خدمت خلق کرتا ہوں اور خدمت خلق کے دوران نمازیں قضا ہو جائیں، تو اس میں کچھ حرج نہیں۔

بھائی خدمت خلق تم پر اس طرح فرض عین نہیں، جس طرح نماز فرض عین ہے، دوسرے اس خدمت خلق کے ساتھ نماز کا کوئی تعارض بھی نہیں ہے، اگر تم عصر کی چار رکعت پڑھ کر

دوبارہ مریضوں کو دیکھنا شروع کردو، تو اس میں کیا تکلیف ہوگی؟ لہذا نفس نے نمازیں قضا کرنے کا ایک بہانہ تلاش کرلیا کہ خدمت خلق ہو رہی ہے، یہ سب افراط اور تفریط ہے۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ دین کی صحیح فہم اور سمجھ نہیں، اسی لیے حضرت فرماتے ہیں کہ دوسرے کی دل شکنی سے بچنے کی خاطر، اپنے دین کو توڑ دینا ٹھیک نہیں، لہذا یہ خیال کرنا کہ میں اگر اس کو غیبت سے روکوں گا، تو اس کا دل برا ہوگا، یا میں اٹھ کر چلا جاؤں گا، تو اس کا دل برا ہوگا۔

یاد رکھئے! اگر معصیت سے بچنے کے نتیجے میں دوسرے کا دل برا ہوتا ہے، تو ہونے دو، اس کی پرواہ ہی مت کرو، تم اس حد تک مکلف ہو کہ جائز حدود میں رہ کر اس کی دل شکنی سے بچو، لیکن جہاں دل شکنی سے بچنے کے لیے کسی گناہ کا ارتکاب کرنا پڑے، تو پھر دل ٹوٹتا ہے، تو ٹوٹنے دو، اس کی پرواہ نہ کرو۔

## دوسروں کی دنیا بنانے اور اپنی آخرت خراب کرنے والا:

ایک حدیث شریف میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص دوسرے کو دنیا کا فائدہ پہنچانے کے لیے، اپنی آخرت خراب کرے، تو اللہ تعالیٰ اس دوسرے شخص کو دنیا ہی میں اس پر مسلط کردیتے ہیں کہ تو نے اس کی دنیا کی خاطر اپنی آخرت خراب کی تھی، اب یہ تیری دنیا کو بھی خراب کرے گا، جو لوگ بیوی بچوں کو آرام اور راحت پہنچانے کی خاطر حرام آمدنی میں مبتلا ہوتے ہیں، تو تجربہ یہ ہے کہ وہی بچے اس باپ کے سر پر جوتے بجاتے ہیں، اس لیے کہ اس نے بیوی بچوں کو راضی کرنے کی خاطر اللہ تعالیٰ کو ناراض کیا اور ان کی دنیا بنانے کے لیے اپنی آخرت خراب کی، تو پھر دنیا کے اندر ہی ان کو مسلط کردیا جاتا ہے، اس لیے دوسرے کی دل شکنی سے بچنے کے لیے اپنی دین شکنی مت کرو۔

## غیبت سے بچنے کے لیے ہمت درکار ہے:

ایک اور حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا

**لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ**

کسی مخلوق کی ایسی اطاعت نہیں کرنی ہے، جس سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی نوبت آجائے، اللہ تعالیٰ کو ناراض کرکے نہ کسی کی بات ماننے کی ضرورت ہے اور نہ مخلوق کی

دلداری کی اجازت ہے۔

یاد رکھئے! کوئی کام محنت کے بغیر نہیں ہوتا، ہر کام میں کچھ نہ کچھ محنت اور مشقت اٹھانی پڑتی ہے، تب جا کر وہ کام انجام پاتا ہے، لہذا اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ غیبت کرنا برا کام ہے اور گناہ کا کام ہے اور تم یہ سمجھتے کہ اس سے آخرت تباہ ہو رہی ہے، تو پھر محنت اور مشقت اور اپنی ہمت کو استعمال کرنا پڑے گا، جب اپنی ہمت کو استعمال کرو گے، تو اللہ تعالیٰ مدد فرمائیں گے اور پھر اس گناہ سے بچنا آسان ہو جائے گا۔

## بے تکلفی کے معاملات غیبت میں داخل ہیں یا نہیں:

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا کہ

> ''اگر کسی کو بنا بر بے تکلفی ایسی بات کہی جائے، جو بنظر الفاظ ناگواری کی بات ہے، مگر بنظر بے تکلفی یا تعلق یا بطور مزاح ہونے کے ناگواری کا خیال نہیں آیا۔ (تو آیا یہ بھی ناجائز اور غیبت میں داخل ہے یا نہیں؟) (انفاس عیسیٰ ص ۱۴۹)

مطلب ان سوال کرنے والے کا یہ تھا کہ کچھ لوگوں سے بے تکلف تعلقات ہوتے ہیں، دوستی ہے، آپس میں ہنسی مذاق ہے اور دوسرے کو کچھ باتیں ہنسی مذاق میں کہہ دیتے ہیں، اب اگر اس کی غیر موجودگی میں بے تکلفی کے انداز کا اس طرح ذکر کر دیا جائے کہ اس کے الفاظ تو بظاہر ایسے ہیں کہ جب دوسرا سنے، تو اس کو ناگوار ہو کہ میرے بارے میں ایسے الفاظ کہے، لیکن تعلقات کی نوعیت ایسی ہے کہ اس کے ساتھ بے تکلف دوستی ہے، رشتہ داری ہے، تو آیا ایسے الفاظ کہنا جائز ہیں یا نہیں؟ یہ الفاظ غیبت میں داخل ہیں یا نہیں؟ جواب میں حضرت والا نے فرمایا کہ

> ''جب وہ ناگواری ہے، خواہ کسی بھی حیثیت سے ہو، وہ مانعیت کے لیے کافی ہے اور اگر خود ناگواری میں تردد ہے، تب بھی واجب الکف ہے البتہ اگر عدم ناگواری یقینی ہو، تو غیبت کی حد سے خارج ہو گیا۔''

حضرت والا کے اس جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ اس بات کا مکمل سو فیصد یقین ہو کہ جس کے بارے میں میں یہ بات کہہ رہا ہوں، وہ اگر یہ سنے گا، تو اس کو میرا یہ جملہ اور فقرہ اور یہ الفاظ ناگوار نہیں ہوں گے اور ان کو برا نہیں سمجھے گا، کیونکہ تعلق کی نوعیت ایسی ہے، تو اس

صورت میں وہ الفاظ غیبت میں داخل نہیں، مثلاً اپنے کسی دوست سے کہا کہ تو بڑا بے وفا ہے، پھر بعد میں کسی مجلس میں اس دوست کا تذکرہ آیا، تو اس نے کہا اس بے وفا کا کیا اعتبار ہے۔اب لفظ ''بے وفا'' ایسا لفظ ہے کہ کسی اجنبی کو کہیں گے، تو اس کو نا گواری بھی ہو سکتی ہے، لیکن دوستی میں جب یہ لفظ بولا جاتا ہے، تو عموماً نا گوار نہیں ہوتا، لہٰذا اگر اس بات کا یقین ہے کہ جب میرا دوست یہ سنے گا کہ میں نے اس کے بارے میں یہ بات کہی تھی، تو اس کو نا گوار نہیں ہوگا، تو یہ غیبت میں داخل نہیں، لیکن اگر نا گوار ہونے کا شبہ ہو یعنی یہ بھی احتمال ہو کہ نا گوار ہوگا اور یہ بھی احتمال ہو کہ نا گوار نہیں ہوگا، تو اس کو نا جائز ہی سمجھیں گے۔

## نا گواری کی صورت میں ہنسی مذاق بھی جائز نہیں:

اس سے یہ ثابت معلوم ہوئی کہ بعض اوقات دوستوں میں ایسا ہوتا ہے کہ ایک دوست تو بے تکلفی میں دوسرے سے ہنسی مذاق کر رہا ہے اور اس کا مقصد دوسرے کو ستانا اور تکلیف پہنچانا نہیں ہے، لیکن بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں، جو ہنسی مذاق کو پوری طرح برداشت نہیں کر پاتے اور اس پر وہ چڑتے ہیں اور ان کو نا گواری ہوتی ہے، لیکن دوست احباب ایسے شخص کو چڑانے کے لیے اس سے اور زیادہ ہنسی مذاق کرتے ہیں اور اس سے مزہ لیتے ہیں، تو اگر چہ دوست احباب اس کو بے تکلفی میں وہ الفاظ کہہ رہے ہیں، لیکن چونکہ اس کو تمہاری یہ بے تکلفی نا گوار ہو رہی ہے، تو یہ ہنسی مذاق بھی جائز نہیں، کیونکہ کسی مسلمان کو نا گواری پہنچانا جائز نہیں، لہٰذا ایسے آدمی سے اس طرح گفتگو کرنا، جو اس کی دل شکنی کا باعث ہو، یہ کسی صورت میں جائز نہیں ہے۔

لیکن اگر یہ یقین ہے کہ فلاں سے ایسی بے تکلفی کی دوستی ہے کہ وہ برا نہیں مانے گا، اس کو اچھا لگے گا، اس کو اس بے تکلفی سے خوشی ہوگی، تو ایسے مواقع پر اس کے سامنے بھی ایسے الفاظ کہنا جائز ہے اور پیٹھ پیچھے کہنا بھی جائز ہے۔خلاصہ یہ کہ تین صورتیں ہوئیں:

۱)......اگر نا گواری کا یقین ہو تو ایسے الفاظ کہنا نا جائز ہے۔

۲)......اگر نا گواری کا شبہ ہو تو بھی نا جائز ہے۔

۳)......اگر یہ یقین ہو کہ اس کو نا گوار نہیں ہوگا تو جائز ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں غیبت سے بچنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔آمین

باب سوم کا دوسرا بیان:

# غیبت سے بچنے کا طریقہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ. اَمَّا بَعْدُ

## سوچ کر بولنے کا خیال رکھنے کی تاکید:

حضرت والا نے غیبت سے بچنے کے لیے ایک اصول ارشاد فرمایا وہ یہ ہے کہ

"بے سوچے ہرگز کوئی کلام نہ کیا جائے، اگرچہ بعض اوقات یہ بھی نہ یاد رہے گا کہ سوچ کر بولوں، مگر خیال رکھنے سے اکثر اوقات یاد رہے گا، کہ سوچ کر بولوں، پھر انشاء اللہ ذھول نہ ہوگا۔ پس جب سوچ کر بولا جائے، تو ہر کلام سے پہلے یہ سوچ لینا چاہیے، کہ اس کلام سے گناہ تو نہ ہوگا، انشاء اللہ تعالیٰ اس سے بہت کچھ اصلاح ہو جائے گی۔" (انفاس عیسیٰ ص ۱۴۹)

یعنی بے سوچے سمجھے بولنے کی جو عادت پڑی ہوئی ہے، اس کو ختم کرو، بولو تو سوچ کر بولو اور یہ سوچو کہ جو کلمہ میں زبان سے نکالنا چاہتا ہوں، وہ کہیں مجھے گناہ میں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مبتلا نہ کردے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"قُلْ خَیْرًا وَاِلَّا فَاصْمُتْ"

یا تو بھلائی کی بات کہو، ورنہ خاموش رہو، خاموش رہنا ہزار درجہ بہتر ہے، بہ نسبت اس کے کہ آدمی فضول ایسی باتیں کرتا پھرے، جو اس کے لیے عذاب جہنم کا باعث ہوں۔

## زبان کی نعمت کی قدر کرو ورنہ جہنم میں ڈال دیگی:

حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"ھَلْ یُکِبُّ النَّاسَ فِی النَّارِ اِلَّا حَصَائِدُ اَلْسِنَتِھِمْ"

یعنی لوگوں کو جہنم میں اوندھے منہ گرانے والی چیز، ان کی زبان سے نکلے ہوئے کلمات ہوں گے۔ العیاذ باللہ۔ یہ زبان سرکاری مشین ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے عطا فرما دی ہے، جب سے پیدا ہوئے، اس وقت سے یہ مشین چل رہی ہے اور مرتے دم تک چلتی رہے گی، نہ اس میں تیل ڈالنے کی ضرورت، نہ اس کی سروس کرانے کی ضرورت، نہ اس کی مرمت کرانے کی ضرورت، مگر یہ کام کر رہی ہے اور اس طرح کام کر رہی ہے کہ جیسے ہی ذہن میں ایک بات آئی کہ یہ بات زبان سے ادا کروں، بس فوراً وہ بات زبان کے ذریعہ باہر آجاتی ہے گویا کہ آٹو میٹک مشین ہے، اس نعمت کی ہمیں قدر اس لیے نہیں ہے کہ یہ نعمت بچپن سے ہمارے ساتھ ہے اور کام دے رہی ہے اور اس کے حصول کے لیے روپیہ پیسہ خرچ نہیں کرنا پڑا اور کوئی محنت نہیں اٹھانی پڑی، اس لیے اس کی قدر نہیں۔

اس کی قدر ان لوگوں سے پوچھیے، جن کی گویائی کی قوت سلب ہو چکی ہے، کہ وہ کس عذاب کے اندر مبتلا ہیں؟ جن لوگوں کی فالج کی وجہ سے زبان بند ہو جاتی ہے، وہ بات کہنا چاہتے ہیں، اپنی بیوی بچوں سے، اپنے ماں باپ سے، اپنے بھائی سے، اپنے دوست سے کچھ کہنا چاہتے ہیں، لیکن قوت گویائی نہیں ہے، بول نہیں سکتے، بعض اوقات اپنا سر پیٹ لیتے ہیں کہ میں کہنا چاہتا ہوں، میں اپنے دل کی بات اس کو کیسے سمجھاؤں؟ اس وقت پتہ چلتا ہے کہ اس زبان کی گویائی کی کیا قیمت ہے؟ اللہ نہ کرے، اگر ہم میں سے کسی کی گویائی دو منٹ کے لیے بند ہو جائے اور بولنے کی طاقت نہ رہے اور دوسرا شخص یہ کہے کہ تمہارے بولنے کی طاقت تمہیں واپس نہیں مل سکتی، پہلے اس کے لیے تمہیں خرچ کرنا پڑے گا، تو لاکھوں روپیہ خرچ کرنے کے لیے تیار ہو جائے گا، تا کہ مجھے یہ قوت گویائی واپس مل جائے، اب اس وقت یہ گویائی مفت میں ملی ہوئی اور یہ زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے اور انسان اس کو جا بجا استعمال کر رہا ہے اور اس کے ذریعہ حلال اور حرام ایک کر رکھے ہیں، کوئی فکر نہیں۔

## زبان کی حفاظت کا نسخہ کیمیا:

شریعت کا مطالبہ یہ ہے کہ یہ سرکاری مشین تمہیں مفت ملی ہوئی ہے، اور کام دینے والی مفید چیز ہے، تو اس کو فائدے کے کاموں میں استعمال کرو اور حرام کاموں سے اس کو بچاؤ، اگر انسان اس سے فائدہ اٹھانا چاہے تو اس کا فائدہ بھی بڑا عظیم ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ اگر ایک مرتبہ زبان سے ”سبحان اللہ“ کہہ دیا یا ”الحمدللہ“ کہہ دیا تو میزان عمل کا آدھا پلہ بھر جاتا ہے، بخاری شریف کے ختم کے موقع پر آپ یہ حدیث سنتے ہیں کہ

كَلِمَتَانِ حَبِيبَتَانِ اِلَى الرَّحْمٰنِ خَفِيفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ ثَقِيلَتَانِ فِى الْمِيزَانِ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيمِ.“

دو کلمے ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو بڑے محبوب ہیں، جن کا زبان سے ادا کرنا بہت آسان ہے، ایک لمحے میں ادا ہو جاتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی یہاں میزان عمل میں بڑے بھاری ہیں، وہ دو کلمے یہ ہیں:

”سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيمِ.“

لہٰذا اگر انسان اس زبان کو صحیح استعمال کرلے، تو جنت کی نعمتوں کے ڈھیر لگا سکتا ہے، چلتے، پھرتے، اٹھتے، بیٹھتے، انسان اس زبان کو اللہ کے ذکر سے تر رکھے۔

حدیث شریف میں ہے کہ ایک صحابی نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا کہ سب سے افضل عمل کونسا ہے؟ آپ نے جواب میں یہ ارشاد فرمایا کہ سب سے افضل عمل یہ ہے کہ تمہاری زبان اللہ کے ذکر سے تر رہے۔ چلتے، پھرتے، اٹھتے، بیٹھتے اللہ کا ذکر کرتے رہو گے، تو تمہارے نامہ اعمال میں اضافہ ہوتا رہے گا، نیکیوں کے ڈھیر لگتے رہیں گے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر و ثواب کا خزانہ اکٹھا ہوتا رہے گا۔



## جہنم سے نکال کر جنت میں پہنچانے والی چیز:

یہی زبان ہے، جو انسان کو کفر سے نکال کر اسلام میں داخل کر دیتی ہے، ستر برس کے کافر کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کی توفیق دے دی اور اس نے زبان سے

”اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ“

کہہ دیا، تو وہ ستر برس کا کافر جہنم کے ساتویں طبقے سے نکل کر ایک لمحے میں جنت الفردوس کے اعلیٰ مقام پر پہنچ گیا۔ یہ کس کی بدولت ہوا؟ اس زبان کی بدولت ہوا، اللہ تعالیٰ نے اس زبان میں یہ تاثیر رکھی ہے، ایسی مثالیں موجود ہیں کہ ایک شخص کی ساری عمر کفر میں، فسق و فجور میں اور بداعمالیوں میں گزری، آخر میں اللہ تعالیٰ نے ایمان کی توفیق دے دی اور

اس نے کلمہ شہادت پڑھ لیا، کلمہ شہادت پڑھنے کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ اب اگر کلمہ شہادت پڑھنے سے ذرا دیر پہلے انتقال ہو جاتا، تو سیدھا جہنم میں جاتا، لیکن اس کلمہ کے پڑھنے کے بعد انتقال ہوا، تو سیدھا جنت میں چلا گیا، اس کلمہ نے اس کو جہنم کے ساتویں طبقے سے نکال کر جنت الفردوس کے اعلیٰ مقام تک پہنچا دیا۔

## زبان کے نقصان سے نجات کا طریقہ:

لہٰذا اگر چاہو تو اس زبان کے ذریعہ آخرت کا ذخیرہ جمع کرلو، تلاوت کے ذریعہ، ذکر و تسبیح کے ذریعہ، اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے ذریعہ، شکر کے ذریعہ اور کسی مسلمان بھائی کا دل خوش کرنے کے ذریعہ، آخرت کے لیے ذخیرہ جمع کرلو، کیونکہ زبان سے کوئی ایسا کلمہ نکالنا جس سے دوسرے مسلمان بھائی کا دل خوش ہو جائے، یہ بھی صدقہ ہے اور اگر زبان کو غلط استعمال کیا جائے، تو اس کا نقصان بھی ہے، جیسا کہ پہلے یہ حدیث سنائی کہ لوگوں کو جہنم میں اوندھے منہ گرانے والی چیز اس زبان کے کرتوت ہوں گے، کیونکہ جھوٹ یہ بول رہی ہے، غیبت یہ کر رہی ہے، دل کی آزاری یہ کر رہی ہے، فحش کلامی یہ کر رہی ہے اور یہ سب کام انسان کو جہنم کے اندر اوندھے منہ گرانے والے ہیں، لہٰذا جب اس زبان کا فائدہ بھی عظیم ہے اور نقصان بھی عظیم ہے، تو عافیت اور نجات کا راستہ یہی ہے کہ آدمی سوچ سمجھ کر زبان کو استعمال کرے، اسی لیے حضرت والا فرماتے ہیں کہ جب کوئی کلمہ بولو تو بولنے سے پہلے سوچو کہ یہ کلمہ مجھے جنت میں لے جا رہا ہے یا جہنم میں لے جا رہا ہے؟

## امام شافعی کا خاموشی سے متعلق عجیب جواب:

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ جب کوئی آکر ان سے سوال کرتا تو بعض اوقات امام صاحب دیر تک خاموش رہتے، کوئی جواب نہ دیتے، کسی نے ان سے پوچھا کہ حضرت اتنی دیر ہوگئی، کچھ بول نہیں رہے، کوئی جواب نہیں دے رہے ہیں، جواب میں فرمایا:

حَتّٰی اَعْرِفَ اَنَّ الْفَضْلَ فِی السُّکُوْتِ اَوْ فِی الْکَلَامِ

میں اس لیے خاموش ہوں کہ پہلے یہ دیکھ لوں کہ خاموش رہنا زیادہ بہتر ہے یا بولنا

زیادہ بہتر ہے۔

لہذا پہلے تول رہے ہیں کہ اب جو کلمہ بولوں گا یہ میرے لیے فائدہ مند ہو گا یا نقصان دہ ہوگا؟ پہلے تولو پھر بولو، جو کلمہ زبان سے نکالو، تول کر نکالو، کہ یہ کلمہ کیسا ہے اور کتنا ہے؟ اور اس سے مجھے فائدہ پہنچے گا یا نقصان پہنچے گا؟

## زبان کی حفاظت پر جنت کی ضمانت:

اسی لیے حدیث شریف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَنْ يَضْمَنْ لِيْ مَابَيْنَ لِحْيَيْهِ وَمَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ اَضْمَنْ لَهُ الْجَنَّةَ

جو شخص مجھے دو چیزوں کی ضمانت دیدے میں اس کو جنت کی ضمانت دیتا ہوں

کونسی دو چیزیں؟ ایک وہ چیز جو جبڑوں کے درمیان ہے، یعنی زبان، اس کی ضمانت دیدے کہ وہ اس کو غلط استعمال نہیں کرے گا اور ایک چیز جو ٹانگوں کے درمیان ہے، یعنی شرمگاہ کہ اس کو غلط استعمال نہیں کرے گا، میں اس کو جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔

لہذا یہ نہ ہو کہ یہ سرکاری مشین مفت میں مل گئی ہے، تو اب صبح سے شام تک قینچی کی طرح چل رہی ہے اور رکنے کا نام نہیں لیتی، جو منہ میں آرہا ہے بک رہے ہیں، کوئی سوچ وفکر نہیں، یہ حالت ٹھیک نہیں، بلکہ بولنے سے پہلے سوچو، کہ جو بات منہ سے نکالنے والا ہوں وہ فائدہ پہنچائے گی یا نقصان پہنچائے گی؟ اس کے بعد زبان سے بات نکالو۔



## فضول گوئی پر دو طالب علموں کا واقعہ:

دہلی میں حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ بڑے درجے کے اولیاء اللہ میں سے تھے، ان کی نازک مزاجی کے بہت سے واقعات مشہور ہیں، ایک مرتبہ دو طالب علم ان سے بیعت ہونے کے لیے ''بلخ'' سے آئے، بلخ افغانستان کا ایک شہر ہے، وہاں انہوں نے سنا کہ دھلی میں یہ بڑے بزرگ اور اللہ والے ہیں، تو دل میں خیال آیا کہ ان سے بیعت ہونا چاہیے، چنانچہ بلخ سے طویل سفر کر کے دھلی پہنچے، حضرت مرزا مظہر جان جاناں کی مسجد میں پہنچے، نماز کا وقت قریب تھا، اس لیے حوض میں بیٹھ کر دونوں وضو کرنے لگے، وضو کرتے وقت آپس میں باتیں کرنے لگے کہ یہ حوض بڑا ہے یا ہمارے بلخ کی مسجد کا حوض بڑا ہے؟ ایک نے

کہا کہ یہ حوض بڑا ہے، دوسرے نے کہا کہ وہ بڑا ہے اور آپس میں بحث ہونے لگی، حضرت مرزا صاحب نے وہاں سے گزرتے ہوئے ان کی گفتگو سن لی۔ جب نماز سے فارغ ہوئے، تو حضرت مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بتایا کہ ہم بلخ سے آئے ہیں، حضرت والا نے پوچھا کیسے آنا ہوا؟ کہا کہ ہم آپ کے دست مبارک پر بیعت ہونے آئے ہیں، حضرت مرزا صاحب نے فرمایا کہ بیعت ہونے تو آپ آئے ہیں، لیکن اس کا فیصلہ ہوگیا کہ یہ حوض بڑا ہے یا بلخ کا حوض بڑا ہے؟ اب دونوں خاموش، شرمندہ ہو رہے تھے کہ حضرت والا نے ہماری گفتگو سن لی، حضرت والا نے فرمایا کہ ابھی فیصلہ نہیں ہوا، تو ایسا کرو کہ بیعت تو تم بعد میں ہونا، پہلے بلخ جاؤ اور اس حوض کو ناپ کر آؤ اور واپس آ کر پھر اس حوض کو ناپو اور پھر فیصلہ کرو، کہ کونسا حوض بڑا ہے اور کونسا حوض چھوٹا ہے؟ اس کے بعد بیعت ہونا۔

کیونکہ تمہاری بحث اور گفتگو سے پتہ چلا کہ تمہاری گفتگو میں اول تو تحقیق نہیں، احتیاط نہیں، ایک نے ناپے تولے بغیر یہ دعویٰ کر دیا کہ یہ حوض بڑا ہے اور دوسرے نے یہ دعویٰ کر دیا کہ وہ حوض بڑا ہے اور آپس میں بحث شروع کر دی، اس سے معلوم ہوا کہ طبیعت میں احتیاط نہیں، دوسرے یہ کہ بے کار اور بے فائدہ گفتگو کی عادت پڑی ہوئی ہے، اگر یہ پتہ چل جاتا کہ یہ بڑا ہے یا وہ بڑا ہے، تو اس سے دنیا و آخرت کا کیا فائدہ حاصل ہوتا؟ لہٰذا واپس جاؤ اور حوض ناپ کر آؤ، اس کے بغیر بیعت نہیں کروں گا۔

پہلے زمانے میں ایسے ہی علاج ہوا کرتے تھے، اب یہ علاج تو بڑا سخت اور کڑوا ہوا، لیکن ساری زندگی کے لیے یہ علاج کافی ہوگیا ہوگا، پھر اس کے بعد ساری عمر بلا تحقیق اور بے فائدہ بات زبان سے نہیں نکلی ہوگی، بہر حال اس طرح کے علاج ہوتے تھے، یہ نہیں کہ ذکر و تسبیحات بتادیں اور اب بیٹھے ہوئے تسبیح گھونٹ رہے ہیں، بس وظیفہ گھونٹنے سے ہی کامل بن گئے، بلکہ اس طرح رگڑے دیئے جاتے ہیں، تب جا کر اصلاح ہوتی تھی۔

## علاج سخت ہونے پر اشکال اور جواب

یہ واقعہ سنا کر حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ ان طلبہ نے زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ ایک غلط کام کیا، اگر غلط کام نہ کر رہے ہوتے ،تو پھر آنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ یہ طلبہ اس لیے تو آئے تھے کہ اپنی اصلاح کرائیں، اگر

پہلے سے کامل ہوتے اور زبان قابو میں ہوتی، خیالات قابو میں ہوتے، تو شیخ کے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی؟ لہذا اس غلطی پر شیخ نے بیعت کرنے سے کیوں انکار کر دیا؟ پہلے بیعت کر لیتے اور پھر علاج کرتے۔

پھر خود ہی حضرت نے اس اشکال کا جواب دیا کہ یہاں دو باتیں ہیں:

۱)...... پہلی بات یہ ہے کہ اس انکار سے یہ بتلانا منظور ہے کہ کچھ چیزیں ایسی ہیں کہ طالب، سالک اور مرید کو پہلے ان کا دھیان اور ان کی فکر ہونی چاہیے، شیخ سے فائدہ اسی وقت ہوتا ہے کہ جب مرید نے پہلے سے بڑے بڑے امور کا دھیان اور خیال کیا ہوا ہے، البتہ جو دقائق اور باریک باتیں ہیں ان کی اصلاح شیخ سے کرانی ہے، اس وجہ سے شیخ بیعت کرنے سے انکار کر دیتا ہے کہ تمہیں ابھی بیعت نہیں کرنا ہے۔

۲)...... دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی شیخ کے قلب پر وارد فرماتے ہیں کہ اس شخص کے ساتھ اس وقت کیا معاملہ کرنا ہے؟ ہر آدمی کا علاج الگ ہوتا ہے، کسی کا علاج تھپڑ مارنے سے ہو جاتا ہے، کسی کا علاج ڈانٹ دینے سے ہو جاتا ہے، کسی کا علاج پیار کرنے سے ہوتا ہے، کسی کا علاج چمکارنے سے ہو جاتا ہے اور کسی کا علاج صرف ایک نظر دیکھ لینے سے ہو جاتا ہے، اب اللہ جل جلالہ شیخ کے دل پر یہ وارد فرماتے ہیں کہ اس شخص کے لیے اس وقت کیا چیز فائدہ مند ہے؟ دوسرا آدمی دیکھ کر یہ محسوس کرتا ہے کہ شیخ صاحب نے کچھ زیادتی کر دی، لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی اصلاح اسی میں رکھی ہے۔



## مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا طرز عمل:

ہم نے اپنے والد ماجد رحمتہ اللہ علیہ کے طرز عمل میں یہ چیز بارہا مشاہدہ کی، حالانکہ وہ انتہائی نرم خو آدمی تھے، غصہ تو نہ ہونے کے برابر تھا، ہر ایک کے ساتھ نرمی اور تحمل سے پیش آتے تھے، تواضع اور انکساری کے ساتھ ملتے، لیکن کبھی کبھار ایسا ہوتا کہ اچانک کسی شخص پر چھوٹی سی بات پر شدید غصہ ہو جاتے، اب ظاہر بین کو دیکھ کر شبہ ہوتا کہ انہوں نے اس شخص پر زیادتی کی ہے، مگر اللہ تعالیٰ نیک بندوں کے قلب پر وارد فرماتے ہیں کہ کسی شخص کے ساتھ کس وقت کیا معاملہ کرنا ہے؟۔

## ایک صاحب کو ڈانٹنے کا اور ڈانٹ سے کایا پلٹنے کا واقعہ

چنانچہ ان کا ایک واقعہ یاد آیا کہ ایک مرتبہ ایک بڑے صاحب حیثیت، پڑھے، لکھے، مشہور آدمی والد صاحب سے ملاقات کے لیے آگئے اور بات کرنی شروع کی، ابھی دو تین جملے ہی کہے تھے کہ والد صاحب نے ان کو شدید ڈانٹنا شروع کر دیا، میں بھی حیران ہوگیا کہ آج تک کبھی کسی کو اس طرح نہیں ڈانٹا، یہاں تک کہ ان سے یہ کہہ دیا کہ یہاں سے نکل جاؤ، چنانچہ ان کو دفتر سے نکال دیا، آج تک میں نے ایسا منظر نہیں دیکھا تھا، میں نے سوچا کہ یا اللہ یہ شخص تو کام سے گیا، اس لیے کہ نو تعلیم یافتہ آدمی ہے، کوٹ پتلون پہنے ہوئے ہے، ڈاڑھی بھی برائے نام ہے اور حضرت والد صاحب نے اس کو ڈانٹ دیا، اب ہمیشہ کے لیے یہ شخص متنفر ہو کر جائے گا، اسی آدمی نے بعد میں خود اپنی زبان سے مجھے کہا کہ مفتی صاحب کی اس دن کی ڈانٹ نے میری زندگی کی کایا پلٹ دی اور میرے اوپر اس ڈانٹ نے ایسا اثر کیا کہ میرا مرکز توجہ ہی بدل گیا۔

بہر حال اللہ تعالیٰ ہی اپنے نیک بندوں کے دلوں پر یہ القاء فرماتے ہیں کہ کس کے ساتھ، کس وقت، کیا معاملہ کرنا چاہیے؟ کسی اللہ والے کے طرز عمل پر شبہ مت کرو، کہ کسی شخص کو ڈانٹ رہے ہیں، کسی کو پھٹکار رہے ہیں اور کسی سے محبت سے پیش آرہے ہیں، کیونکہ معطی حقیقی اور مبدا فیاض تو اللہ تعالیٰ ہیں، شیخ تو ایک واسطہ ہوتا ہے، وہی شیخ کے دل میں ڈالتے ہیں کہ اس کی اصلاح کا کیا طریقہ مناسب ہوگا؟ ہر ایک کو ایک ہی نسخہ نہیں پلایا جاتا، اس لیے کبھی ان اللہ والوں پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔

لہذا حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ نے ان دو طالب علموں کو یہ سزا دی کہ واپس بلخ جاؤ اور وہاں کا حوض ناپ کر آؤ، اللہ تعالیٰ نے ہی ان کے دل میں یہ بات ڈالی تھی کہ ان کا علاج یہی ہے، ایک مرتبہ جب چوٹ لگ جائے گی، تو ساری عمر کے لیے کار آمد ہو جائے گی، چنانچہ کار آمد ہوگئی اور اس سے حضرت مرزا صاحب نے ان کو یہ سبق دیا کہ تم زبان کو احتیاط سے استعمال نہیں کرتے اور احتیاط ضروری ہے۔

## غیبت، جھوٹ اور دل آزاری سب سے بچنے کا واحد راستہ:

اور اس احتیاط کرنے کا طریقہ حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ نے یہ بتا دیا کہ پہلے سوچو کہ جو بات میں کہنا چاہتا ہوں، یہ صحیح ہے یا نہیں؟ اور اس میں حدود سے تجاوز تو نہیں ہے؟ اس میں جھوٹ تو شامل نہیں ہے؟ اس میں مبالغہ تو نہیں ہے؟ بے احتیاطی تو نہیں ہے؟

آج بہت سے فسادات اور جھگڑے صرف اسی وجہ سے ہوتے ہیں، کہ ایک شخص نے بے سوچے سمجھے ادھر کی بات ادھر کہہ دی، تحقیق کی نہیں اور صحیح طور پر یاد رکھا نہیں، بس اس ایک بات کی وجہ سے خاندان میں فسادات کھڑے ہو گئے، لہذا پہلے سوچو کہ کیا بات ہو گئی ہے؟ کتنی مقدار میں کہی گئی ہے؟ اگر آگے نقل کرنی ہے تو بس اتنی ہی نقل کرو، اپنی طرف سے اس میں اضافہ نہ کرو۔

حضرت فرماتے ہیں کہ چونکہ زبان کو تو ہر وقت چلنے کی عادت پڑی ہوئی ہے، وہ رکنے کا تو نام نہیں لیتی، تو اب کس وقت کس طرح سوچے؟ حضرت فرماتے ہیں کہ ہر کام مشق کرنے سے ہوتا ہے، لہذا مشق کرو اور شروع میں تو سوچنے کا خیال ہی نہیں آئے گا، لیکن سوچنے کا تھوڑا سا اہتمام کرو، تو رفتہ رفتہ عادت پڑ جائے گی، اگر شروع میں سوچنا بھول جاؤ، تو جب یاد آئے اس وقت سوچو، پھر یاد آئے پھر سوچو، اس طرح کرتے کرتے سوچنے کی عادت پڑ جائے گی، پھر بے تکلف سوچنا آئے گا اور سوچنے کے لیے کسی خاص اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی، بلکہ پھر جو بات نکالو گے، بالکل درست نکلے گی، غیبت، جھوٹ اور دل آزاری سب سے بچنے کا واحد راستہ یہی ہے۔

## غیبت کو جائز کرنے کے لیے نفس کی ایک تاویل:

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کو خط لکھا کہ

> ''میرا نفس مجھے یہ تاویل سکھاتا ہے کہ تیری بھی تو لوگ غیبت کرتے ہیں، قیامت میں جب پکڑ ہوگی، تو اپنے مغتابین (غیبت کرنے والوں) سے جو اجر ملے گا، وہ اجر، جن کی تو نے غیبت کی، ان کو دے دیا جائے گا۔ (انفاس عیسیٰ ص ۱۵۰)

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو آدمی کسی کی غیبت کرے، تو اس کا اجر اس کو دے دیا

جاتا ہے، اس لیے میرے دماغ میں یہ بات آتی ہے کہ میری بھی لوگ غیبت کرتے ہیں اور میں بھی کرتا ہوں جو لوگ میری غیبت کرتے ہیں، ان کا اجر مجھے ملتا ہے، میں دوسروں کی غیبت کرتا ہوں تو، میرا اجر ان کو مل جاتا ہے، لہٰذا معاملہ برابر سر برابر ہو گیا۔ اس لیے زیادہ پرواہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

## حضرت تھانویؒ کی طرف سے اس تاویل کا جواب:

جواب میں حضرت والا نے فرمایا:

اول تو یہ کسی دلیل سے ثابت نہیں کہ وہ اجر جو دوسروں سے ملا ہوا ہے، اس کے تدارک کے لیے کافی ہے، ممکن ہے کہ یہ دوسروں سے ملا ہوا اجر تمہارے ہی پاس رہے اور خاص تمہارے اعمال کا اجر اہل حقوق کو ملے اور نجات کے لیے دوسروں کا اجر کافی نہ ہو۔
دوسرے اس سے قطع نظر کر کے مساوات کی کوئی دلیل نہیں، ممکن ہے کہ تم کو کم ملے اور تم سے زیادہ لے لیا جائے گا، تو تدارک کے لیے کیسے کافی ہو جائے گا؟ (ایضاً)

یعنی تمہارے پاس اس کی کیا دلیل ہے کہ جو اجر مغتابین سے حاصل ہوا ہے، وہی دوسروں کے پاس جائے گا، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمہاری نمازیں، تمہارے روزے، تمہاری تلاوت، تمہارا ذکر وغیرہ، وہ سب تمہاری غیبت کی بدولت دوسروں کے پاس چلے جائیں اور دوسروں کا اجر تمہارے پاس آ جائے، دوسرے تمہارے پاس مساوات کی بھی کوئی دلیل نہیں کہ جتنا اجر تمہیں ملا ہے، اتنا ہی اجر دوسروں کے پاس جائے گا، کہ تمہیں کم اجر ملے اور تم سے زیادہ لے لیا جائے۔

## یہ سب شیطانی تاویلات ہیں:

یہ سب شیطان کی تاویلیں ہیں، جو انسان کو غلط کاموں میں مبتلا کرنے کے لیے دل میں ڈالتا ہے کہ ایسا کر لو اور اس طرح معاملہ سیدھا ہو جائے گا۔ اللہ بچائے

جب آخرت میں اجر و ثواب کا معاملہ ہوگا اور اپنا اجر و ثواب دوسروں کے پاس جائے گا، تو اس وقت پتہ چلے گا کہ یہ کتنی زبردست دھوکے کی تاویل تھی، اچھے خاصے نیک اعمال کیے، نمازیں پڑھیں، روزے اور تلاوت کے ساتھ رمضان المبارک گزارا، اعتکاف کرنے

کی توفیق ہوئی، رات بھر جاگ جاگ کر عبادات اور نوافل ادا کرتے رہے، وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ سارے اعمال دوسروں کے قبضے میں جارہے ہیں اور جو کچھ کیا کرایا تھا، وہ سب دوسروں کے پاس چلا گیا، اس وقت جو حسرت اور تکلیف ہوگی اس کا کوئی علاج نہیں، لہذا یہ سوچ کر آخرت میں حساب برابر جائے گا، یہ خیال اور سوچ درست نہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین

## غیبت کا علاج ہمت اور استحضار ہے:

آگے حضرت والا نے فرمایا

> ''غیبت'' ایک اختیاری امر ہے، اس کا طریق علاج ہمت واستحضار ہے اور معین طریق یہ ہے کہ جب ایک بار ایسا ہو جائے ایک وقت فاقہ کرے۔ (انفاس عیسیٰ ص ۱۵۰)

سب سے پہلے یہ فرمایا کہ غیبت اپنے اختیار سے ہوتی ہے، کبھی بے اختیار نہیں ہوتی، اگر غیبت بے اختیار ہوتی، تو حرام نہ ہوتی، اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسا کام حرام نہیں کیا، جس سے بچنا انسان کے اختیار میں نہ ہو۔ ﴿لا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا﴾

لہذا غیبت سے بچنا اختیار میں تو ہے، البتہ اس سے بچنے کے لیے ہمت اور استحضار کی ضرورت ہے، یہ ہمت کرلے کہ میں یہ گناہ نہیں کروں گا، زبان سے غلط بات نہیں نکالوں گا اور اس بات کا استحضار کرے کہ یہ کتنا بڑا جرم ہے، کتنا بڑا گناہ ہے اور اس کے نتیجے میں اچھے اعمال دوسروں کے قبضے میں چلے جاتے ہیں، ان چیزوں کا استحضار کرے۔

## غیبت پر نفس کو سزا دینا ترک غیبت میں معاون ہوگا:

آگے فرمایا کہ اس سے بچنے میں یہ چیز معاون ہو جاتی ہے کہ آدمی یہ طے کرلے کہ اگر آئندہ غیبت ہوگی، تو اپنے آپ کو یہ سزا دوں گا، حضرت فرماتے تھے کہ وہ سزا نہ تو اتنی معمولی ہو کہ آدمی کو اس کی پرواہ ہی نہ ہو، جیسے میرے والد صاحب یہ واقعہ سنایا کرتے تھے کہ جب ''علی گڑھ کالج'' قائم ہوا تو اسوقت یہ قانون تھا کہ تمام طلبہ کو نماز پڑھنا لازم ہے اور نماز چھوڑنے پر جرمانہ مقرر تھا کہ جو طالب علم نماز چھوڑے فی نماز دو آنہ ادا کرے، اب ہوتا تو یہ تھا کہ بہت سے طالب علم ایسے تھے کہ جو مہینہ بھر کا جرمانہ اکٹھا شروع میں جمع کرادیا کرتے

تھے، چونکہ جرمانہ ایسا تھا کہ اس کو ادا کرنے میں کوئی خاص مشقت نہیں تھی، اس لیے اس جرمانہ لگانے سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا، جرمانہ ایسا ہونا چاہیے جس سے کچھ مشقت ہو اور وہ جرمانہ اتنا بھی سخت نہ ہو کہ آدمی اس کو برداشت نہ کر پائے اور پھر آدمی اصل عمل سے بھی جائے اور جرمانہ سے بھی جائے، لہٰذا جرمانہ درمیانہ درجے کا ہونا چاہیے۔

لہٰذا کسی کے حق میں مالی جرمانہ فائدہ مند ہوتا ہے کہ جب کبھی مجھ سے یہ فعل سرزد ہوگا تو میں اتنے پیسے صدقہ کروں گا، یہ ان لوگوں کے لیے ہے، جن پر صدقہ کرنا بڑا شاق ہوتا ہے، کیونکہ اس سے بھی انسان کے نفس کو سزا ملتی ہے اور جن لوگوں کو پیسوں کی پرواہ نہیں ہوتی، انہیں چاہیے کہ وہ اپنے اوپر ایسا جرمانہ عائد کریں، جس سے ان پر تھوڑی مشقت ہو، چنانچہ حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ نے یہاں یہ جرمانہ بیان فرمایا کہ آدمی یہ طے کرلے کہ اگر مجھ سے غیبت ہوگی، تو ایک وقت کا فاقہ کروں گا، کھانا نہیں کھاؤں گا، بلکہ بھوک ہڑتال کروں گا، آج کل لوگوں نے بھوک ہڑتال کا الٹا طریقہ نکالا ہے کہ جب دوسرے پر دباؤ ڈالنا مقصود ہوتا ہے، تو لوگ بھوک ہڑتال کرتے ہیں اگر دوسرا شخص دباؤ قبول نہ کرے، تو بھوک کی وجہ سے مر جاتے ہیں، یہ طریقہ تو درست نہیں، حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ نے جو طریقہ بیان فرمایا ہے وہ انسان کے اپنے اوپر دباؤ ڈالنے کے لیے بیان فرمایا کہ میں اس لیے فاقہ کر رہا ہوں تاکہ مجھ سے آئندہ غیبت سرزد نہ ہو اور جب بھی غیبت ہوگی، تو اپنے نفس کو فاقے کی سزا دوں گا اور یہ فاقہ ایسی چیز ہے کہ اگر انسان اس پر عمل کرے، تو چند دن میں علاج ہو جائے گا اور غیبت چھوٹ جائے گی۔



## اصلاح کیلئے جائز غیبت بھی چھوڑنی پڑے گی:

ایک صاحب نے حضرت والا سے سوال کیا کہ

> ”بعض لوگ جو گناہ کبیرہ میں مبتلا ہیں ان کے عیوب اور گناہ کو ظاہر کرنا غیبت ہے یا نہیں؟ نفس اس تاویل پر ہمیشہ آمادہ رہتا ہے کہ ایسوں کے عیوب اگر لوگوں پر ظاہر نہ کیے جائیں تو لوگوں کو دھوکہ ہوگا اور مسلمانوں کو دھوکہ سے بچانا ضروری ہے۔“ (انفاس عیسیٰ ص ۱۵۰)

یعنی دوسروں کے بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ فلاں فلاں عیب میں مبتلا ہیں، اس عیب کی خبر لوگوں کی ہونی چاہیے، تاکہ وہ اس سے دھوکہ نہ کھائیں، تو آیا ایسے آدمی کی غیبت کریں یا نہ کریں؟ جن صاحب نے یہ سوال کیا تھا، وہ ابھی نئے نئے اس طریق میں داخل ہوئے تھے اور اپنی اصلاح کے لیے حاضر ہوئے تھے اور ابتداء ہی تھی کہ انہوں نے یہ سوال کرلیا، چنانچہ حضرت نے جواب تحریر فرمایا کہ

''یہ سوال منتہی کے قابل ہے، مبتدی کو جائز غیبت بھی نہ کرنی چاہیے۔'' (ایضاً)

یعنی جو مبتدی ابھی اپنی اصلاح کرانے کے لیے چلا ہے اور ابھی اس نے اصلاح کے لیے قدم بڑھایا ہے، ابھی تو اس کے نفس کی تہذیب ہونی ہے، اس کو چاہیے کہ وہ جائز غیبت بھی نہ کرے، یہ وہی بات ہے کہ جس کو حضرت مولانا یعقوب نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ نے ایک مثال سے سمجھایا تھا کہ جیسے ایک کاغذ کو ایک طرف موڑ دیا جائے، پھر اس کو اگر سیدھا کرنا چاہو گے، تو یہ سیدھا نہیں ہوگا، اس کے سیدھا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو الٹی طرف طرف موڑو، جب الٹی طرف موڑو گے، تو یہ سیدھا ہو جائے گا، اسی طرح انسان کا نفس بھی الٹی طرف مڑا ہوا ہے، اس کو ناجائز غیبت کرنے کی عادت پڑی ہوئی ہے، اس عادت کو چھڑانے کے لیے ضروری ہے کہ وہ شروع میں جائز غیبت بھی چھوڑے، پھر یہ نفس سیدھا ہو جائے گا اور آئندہ صرف جائز غیبت ہی سرزد ہوگی، ناجائز غیبت سرزد نہ ہوگی۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے ۔

آمین

وآخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمين

باب سوم کا تیسرا بیان:

# غیبت کی معافی کا طریقہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ۔ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ. اَمَّا بَعْدُ

## غیبت کی معافی کا طریقہ:



حضرت والا نے فرمایا کہ:

''اگر کسی کی غیبت ہوگئی، تو استغفار کے ساتھ مغتاب سے بھی معافی مانگنے کی ضرورت ہے، لیکن تفصیل غیبت کی اس کو بتلانا اس کو ایذا دینا ہے، اس لیے اجمالاً یوں کہنا کہ ''میرا کہا سنا معاف کردو''۔ (انفاس عیسیٰ ص ۱۵۱)

حضرت والا نے اس ملفوظ میں غیبت کی معافی کا طریقہ بیان فرمایا ہے، کہ اگر کسی کی غیبت ہو جائے، تو اس کی معافی کا کیا طریقہ ہے؟ غیبت کا تعلق حقوق العباد سے ہے، کیونکہ غیبت میں دوسرے مسلمان بھائی کا حق پامال ہوتا ہے اور حقوق العباد کی معافی اس وقت تک نہیں ہوتی، جب تک صاحب حق معاف نہ کرے، لہذا اگر آپ نے کسی کو جسمانی یا ذہنی یا کسی اور قسم کی تکلیف پہنچائی ہے، تو محض توبہ استغفار کر لینے سے، اس کی معافی نہیں ہوگی، بلکہ صاحب حق کا معاف کرنا ضروری ہے۔

## حقوق العباد میں صاحب حق سے معافی ضروری ہے:

جو گناہ حقوق اللہ سے تعلق رکھتے ہیں، جیسے شراب نوشی ہے، زنا کاری ہے وغیرہ، ان کی معافی کا راستہ یہ ہے کہ اگر انسان ایک مرتبہ بیٹھ کر صدق دل سے یہ عزم کر لے کہ آئندہ یہ گناہ نہیں کروں گا اور پچھلے گناہ پر نادم اور شرمندہ ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑا کر

توبہ کرلے، تو انشاء اللہ یہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔

لیکن حقوق العباد اس وقت تک معاف نہیں ہوتے، جب تک وہ شخص معاف نہ کرے، جس کا حق پامال کیا گیا، غیبت بھی اسی میں داخل ہے، لہٰذا اگر خالی بیٹھ کر توبہ کرلی، کہ یا اللہ جو غیبت کرلی ہے، اس سے توبہ استغفار کرتا ہوں، مجھے معاف فرما، صرف اتنا کرلینے سے غیبت کا گناہ معاف نہیں ہوگا، جب تک اس شخص سے معافی نہ مانگی جائے، جس کی غیبت کی گئی ہے اور وہ معاف نہ کردے، اس وقت تک غیبت کا گناہ معاف نہیں ہوگا، اس لیے حضرت والا نے اس ملفوظ میں فرمایا کہ اگر کسی کی غیبت ہوگئی، تو استغفار کے ساتھ ''مغتاب'' (یعنی جس کی غیبت کی گئی تھی) سے بھی معافی مانگنے کی ضرورت ہے۔''

## معافی کے وقت غیبت کی تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں:

پھر فرمایا کہ ''لیکن تفصیل غیبت کی اس کو بتلانا اس کو ایذاء دینا ہے۔'' مثلاً اس سے یہ کہنا کہ میں نے فلاں وقت میں فلاں غیبت کی تھی اور تمہیں یہ یہ کہا تھا اور تمہاری یہ یہ برائی بیان کی تھی، اب تم مجھے معاف کردو'' کیونکہ اندیشہ یہ ہے کہ اس کی تفصیل کے بیان سے اس کو تکلیف پہنچے گی، اس لیے ساری تفصیل بیان کرکے معافی مانگنے کی ضرورت نہیں، بلکہ اجمالاً یوں کہنا کہ میرا کہا سنا معاف کردو، یہ بھی کافی ہے، دیکھئے اللہ تعالیٰ کتنی آسانی کے راستے پیدا فرمادیتے ہیں۔

## ''کہا سنا معاف کردینا'' حکیمانہ جملہ ہے:

یہ جملہ کہ ''کہا سنا معاف کردینا'' یہ ہمارے بزرگوں کا چلایا ہوا کتنا حکیمانہ جملہ ہے، جب سے ہم نے ہوش سنبھالا ہے، اس وقت سے بڑوں سے یہ سنتے چلے آرہے ہیں کہ جب دو چار آدمی کچھ دن ساتھ رہنے کے بعد جدا ہونے لگتے ہیں، تو اس وقت ایک دوسرے سے یہ جملہ کہتے ہیں کہ بھائی ہمارا کہا سنا معاف کردینا، اس لیے کہ جب سفر یا حضر میں دو چار آدمی ساتھ رہتے ہیں، تو کچھ نہ کچھ ایک دوسرے کی حق تلفی ہونے کا احتمال ہوتا ہے، لہٰذا جدا ہونے سے پہلے، ان سے حقوق کو معاف کرالو، اگر یہ معاف نہ کرایا اور بعد میں کچھ عرصہ کے بعد خیال آیا کہ ہم نے تو فلاں کی حق تلفی کی تھی، تو اس وقت کہاں ڈھونڈتے پھروگے؟ بعد

میں معلوم نہیں کہ ملاقات ہو یا نہ ہو، معافی مانگنے کا موقع ملے یا نہ ملے، لہٰذا جدا ہوتے وقت ہی یہ کام کر لینا چاہیے، اس جملہ میں غیبت بھی خود بخود داخل ہو جائے گی اور غیبت سے بھی معافی ہو جائے گی۔

## حضرت تھانویؒ کا طرز عمل اور اپنی اصلاح کی جستجو:

میں نے ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی شخص مجھ سے یہ کہتا ہے کہ میں نے آپ کی غیبت کی ہے، مجھے معاف کر دو، تو میں اس سے کہتا ہوں کہ میں معاف تو ضرور کر دوں گا، لیکن پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ کیا غیبت کی تھی؟ ظاہر ہے کہ صاحب حق کو یہ پوچھنے کا حق ہے، کہ کیا غیبت کی تھی؟ فرماتے تھے کہ اس سوال سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات غیبت سچی ہوتی ہے، اس لیے کہ غیبت کے اندر یہ ضروری نہیں کہ غلط ہی ہو، تو اس کے بتانے سے اپنی غلطی کا پتہ لگ جاتا ہے۔

## کہتی ہے تجھے خلق خدا غائبانہ کیا؟

دوسرے اس کے ذریعہ یہ پتہ چل جاتا ہے کہ تمہارے بارے میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق کا غیر جانب دارانہ تبصرہ کیا ہے۔

کہتی ہے تجھے خلق خدا غائبانہ کیا؟

کیونکہ جو لوگ تمہارے اردگرد رہتے ہیں، وہ تو تمہاری تعریف ہی کریں گے، تمہیں اچھا ہی کہیں گے، لیکن پیٹھ پیچھے تمہیں لوگ کیا کہتے ہیں؟ اور تمہارے بارے میں کیا خیال کرتے ہیں؟ کیا تصور رکھتے ہیں؟ اس کا علم ہو جانا بھی مفید ہوتا ہے، کیونکہ اگر سب لوگ تمہاری تعریف کرتے رہیں، تو اس کے نتیجے میں بعض اوقات آدمی کے دل میں عجب پیدا ہو جاتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ یہ ساری مخلوق جو میری تعریف کر رہی ہے، تو ضرور میرے اندر کمال ہے، جس کی وجہ سے یہ ساری مخلوق میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے، اس طرح دل میں عجب پیدا ہو جاتا ہے۔

اس عجب کا علاج یہ ہے کہ تم یہ دیکھو کہ جو لوگ تمہارے پیچھے رہنے والے ہیں، وہ تمہیں کیا کہتے ہیں؟ اور تمہارے بارے میں ان کی کیا رائے ہے؟ اس کے ذریعہ انسان کے عجب

کا علاج ہوتا ہے، اس لیے حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جب میرے پاس کوئی معافی مانگنے آتا، تو میں اس نے کہتا کہ میں معاف تو کردوں گا، لیکن پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ کیا غیبت کی تھی؟ جب بتاؤ گے، تو میں معاف کردوں گا۔

## جنت اس قدر سستی نہیں:

اب سوال یہ ہے کہ کس کس سے معافی مانگے؟ پہلے تو دھیان اور فکر نہیں تھی، نہ جانے کس کس کی غیبت ہوگئی، تو کیا ان آدمیوں کی پہلے فہرست بنائے اور پھر ان سے معافی مانگے؟ حضرت والد ماجد رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ بھائی اگر جنت لینی ہے، تو جنت اس قدر سستی نہیں ہے، یہ کام تو کرنا پڑے گا، لہذا جو اپنے متعلقین ہیں، اپنے دوست احباب ہیں، ملنے جلنے والے ہیں، عزیز رشتہ دار ہیں، ان کی ایک فہرست بناؤ اور پھر جا کر ان سے معافی مانگو۔

## حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صحابہ سے معافی مانگنا:

ہم اور آپ تو کس شمار و قطار میں ہیں، ہم سب کے سردار جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرامؓ کے مجمع میں کھڑے ہوکر معافی مانگ رہے ہیں، کہ کسی کا مجھ پر کوئی حق رہ گیا ہو، تو وہ یا تو مجھ سے وصول کرلے اور اگر جسمانی حق ہو، تو مجھ سے بدلہ لے لے یا معاف کردے۔ چنانچہ ایک صحابی کھڑے ہوگئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ نے ایک دن میری کمر پر مارا تھا، وہ میرا حق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذمے ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں نے تمہاری کمر پر مارا تھا، تو تمہیں حق ہے کہ تم میری کمر پر آکر مارلو، جب وہ صحابی قریب آئے، تو انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس وقت آپ نے میری کمر پر مارا تھا، اس وقت میری کمر پر کپڑا نہیں تھا، جبکہ آپ کی کمر مبارک پر کپڑا ہے، چنانچہ رحمت اللعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کمر مبارک سے کپڑا اٹھالیا، ان صحابیؓ کا اصل مقصد یہ تھا کہ میں مہر نبوت کو بوسہ دوں، چنانچہ وہ صحابی آگے بڑھے اور مہر نبوت کو بوسہ دیا، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس بات کے لیے تیار تھے کہ کوئی چھوٹا بھی مجھ سے آکر بدلہ لینا چاہے، تو بدلہ لے لے، جب اللہ تعالیٰ کا

خوف دل میں ہواور آخرت کی فکر ہواور اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے کا احساس ہو، تو پھر دنیاوی طور پر لوگوں کے سامنے ذلیل ہونے کے سارے تصورات ہیچ ہو جاتے ہیں، ہمارے نفس و شیطان نے ہمارے دلوں میں ان تصورات کے بت بنا رکھے ہیں کہ معافی مانگنے سے ہماری ذلت ہو جائے گی، ہماری ناک کٹ جائے گی، ہماری بے عزتی ہو جائے گی، ارے ایسی ہزار بے عزتیاں ہو جائیں، اس کے لیے ہم تیار ہیں، بس اللہ تعالیٰ اپنی ناراضگی سے بچالے اور اپنے غضب سے بچالے۔

## میرے والد ماجدؒ کا معافی نامہ شائع کرانا

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمتہ اللہ علیہ کو جب دل کا دورہ پڑا، ہسپتال میں بستر پر لیٹے ہوئے تھے، جب ہوش آیا، تو پہلا کلام جو مجھ سے فرمایا وہ یہ تھا کہ:
''میری طرف سے میرے تمام متعلقین کو ایک تحریر لکھ کر بھیج دو کہ جس کسی کا کوئی حق مجھ سے فوت ہوا ہو یا کسی کی غیبت کی ہو یا برائی کی ہو تو وہ مجھ سے اس کا بدلہ لے یا مجھے معاف کر دے۔''

چنانچہ میں نے وہ تحریر لکھی اور'' کچھ تلافی مافات'' کے نام سے پہلے ''البلاغ'' میں شائع کی اور پھر اس کو ایک پمفلٹ کی صورت میں شائع کر کے حضرت والد ماجد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے جتنے متعلقین تھے، ان سب کے پاس بھیجا۔

بہر حال حقوق العباد کی معافی کے لیے صرف زبانی توبہ کافی نہیں، بلکہ صاحب حق سے معاف کرانا ضروری ہے اور غیبت کرنا حق العبد کو ضائع کرنا ہے، لہٰذا جس کی غیبت کی ہے، اس سے معافی مانگنا ضروری ہے۔

## جس کی غیبت کی، اس کی تعریف کرو:

آگے فرمایا کہ

| اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جن لوگوں کے سامنے غیبت کی تھی، ان کے سامنے ان کی مدح وثنا بھی کرو اور پہلی بات کا غلط ہونا ثابت کر دو۔ (ایضاً) |
|---|

کیونکہ تم نے اس سے تو معافی مانگ لی اور اللہ تعالیٰ سے بھی توبہ استغفار کر کے معاملہ

صاف کرلیا، لیکن مخلوق کے دل میں تم نے اس شخص کی جو برائی پیدا کی ہے، اس کی تلافی بھی ضروری ہے، تلافی کے لیے اب اس کی مدح وثنا اور تعریف کرو اور پہلی بات کا غلط ہونا ثابت کردو اوران سے یہ کہو کہ جو بات میں نے کہی تھی وہ غلط تھی آگے فرمایا

> اور اگر وہ بات غلط نہ ہو، بلکہ سچی ہو، تو یوں کہہ دو کہ بھائی اس بات پر اعتماد کرکے تم فلاں شخص سے بدگمان نہ ہونا، کیونکہ مجھے خود اس پر اعتماد نہیں رہا، یہ توریہ ہو جائے گا، کیونکہ سچی بات پر بھی اعتماد قطعی بدون وحی کے ہو نہیں سکتا۔ (ایضاً)

یعنی اگر تم نے غیبت کے دوران سچی برائی بیان کردی تھی، کیونکہ غیبت سچی بھی ہوتی ہے، تو اب اس کے بارے میں یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ غلط تھی، لہٰذا اب یہ کہہ دو کہ میری اس بات پر اعتماد کرکے تم فلاں شخص سے بدگمان نہ ہونا، کیونکہ مجھے خود اس پر اعتماد نہیں رہا، اس لیے کہ سچی بات پر مکمل بھروسہ وحی کے بغیر نہیں ہوسکتا، مکمل بھروسہ کے لیے یا تو مشاہدہ ہو یا وحی ہو، اس کے علاوہ سو فیصد اعتماد کا کوئی اور راستہ نہیں ہے، لہٰذا یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ اب مجھے اس بات پر اعتماد نہیں، انشاء اللہ اس کے ذریعہ اس غیبت کی تلافی ہو جائے گی، جو آپ نے اس کی برائی بیان کی ہے۔

## جس کی غیبت کی تھی اگر وہ مرچکا ہو تو پھر کیا جائے؟

آگے ارشاد فرمایا کہ

> "اگر وہ شخص مر گیا ہو جس کی غیبت کی ہے، تو اب معاف کرانے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے لیے دعا استغفار کرتے رہو، یہاں تک کہ دل گواہی دیدے کہ اب وہ تم سے راضی ہو گیا ہوگا۔

یعنی جس شخص کی آپ نے غیبت کی تھی، اب اس کا انتقال ہو چکا ہے، تو اب اس سے کیسے معافی مانگی جائے؟ تو اس سے معاف کرانے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے لیے دعاء و استغفار کرتے رہو، یہاں تک کہ تمہارا دل یہ گواہی دیدے کہ اب وہ شخص تم سے راضی ہو گیا ہوگا۔

لہٰذا حقوق العباد کا معاملہ اگرچہ بڑا سنگین ہے، کہ جب تک صاحب حق معاف نہ کرے، اس وقت تک معاف نہیں ہوگا اور اگر صاحب حق کا انتقال ہو گیا، تو اور زیادہ مشکل، لیکن کسی

صورت میں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، کسی بھی حالت میں اللہ تعالیٰ نے مایوسی کا راستہ نہیں رکھا کہ اب تیرے لیے معافی کا راستہ بند ہے۔

## ننانوے قتل کرنے والے کی معافی کا راستہ:

بخاری شریف میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک شخص نے ننانوے قتل کر دیئے، پھر اس کو توبہ اور استغفار کا خیال آیا، تو وہ ایک راحب کے پاس گیا اور اس سے جا کر کہا کہ میں نے ننانوے قتل کیے ہیں، کیا میرے لیے توبہ اور معافی کا کوئی راستہ ہے؟ اس راہب نے کہا کہ تیری معافی کا کوئی راستہ نہیں، تو سیدھا جہنم میں جائے گا، اس لیے کہ تو نے ننانوے آدمیوں کو قتل کر دیا ہے اور صرف توبہ کرنے سے یہ گناہ معاف نہیں ہوگا، جب تک تو ان مقتولین کے ورثاء سے معافی نہ مانگ لے اور ان سب کے ورثاء سے کیسے تو معافی مانگے گا؟ اس لیے تیری معافی کا کوئی راستہ نہیں تو جہنمی ہے، اس نے کہا اچھا میری معافی کا کوئی راستہ نہیں، تو ننانوے قتل ہو گئے، سوواں ایک اور سہی اور یہ کہہ کر اس نے راہب کو بھی قتل کر دیا، اس طرح اس نے سو کی تعداد پوری کر لی۔

اس کے بعد پھر ایک اور راہب کے پاس گیا، اس سے جا کر اس نے سارا واقعہ بتایا کہ ننانوے تو پہلے قتل کر دیئے تھے، ایک اور قتل ہو گیا، اب بتایئے کہ میرے لیے توبہ اور استغفار کا کوئی راستہ ہے؟ اس راہب نے کہا، ہاں، تیرے لیے توبہ کا راستہ ہے، وہ یہ کہ پہلے توبہ اور استغفار کر اور پھر فلاں مقام پر ایک بستی ہے، وہاں نیک لوگ رہتے ہیں، وہاں جا کر ان کی صحبت اختیار کر، اس راہب نے نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنے کا مشورہ اس لیے دیا تھا کہ جب برے لوگوں کی صحبت سے نکل کر نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرے گا، تو اس گناہ سے بچنا اس کے لیے آسان ہو جائے گا، چنانچہ یہ قاتل توبہ اور استغفار کر کے یہ ارادہ کر کے اپنی بستی سے چل پڑا کہ میں اب اپنی زندگی میں انقلاب لاؤں گا اور آئندہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کروں گا، کوئی نافرمانی نہیں کروں گا، نیک لوگوں کی صحبت اختیار کروں گا، جو میرے ذمے فرائض وواجبات ہیں، ان کو ادا کروں گا، یہ سب ارادے لے کر چلا۔

ابھی وہ راستے میں تھا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم آ گیا کہ اس کی روح قبض کر لو، چنانچہ اس کی روح قبض کر لی گئی اور اسکا انتقال ہو گیا، اب انتقال کے بعد ملائکہ کا آپس میں جھگڑا ہو گیا

ملائکہ رحمت نے کہا کہ یہ شخص توبہ کرکے پاک وصاف ہوکر دوسری بستی کی طرف جارہا تھا اور نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنے جارہا تھا، لہذا ہم اس کو لے کر جائیں گے، جو ملائکہ عذاب تھے انہوں نے کہا کہ اس شخص کی ساری زندگی گناہوں کے اندر گزری، اس نے سو آدمیوں کو قتل کیا ہے، لہذا ہم اس کو عذاب کے لیے لے جائیں گے، یہ جھگڑا ہوگیا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ اچھا یہ دیکھو کہ جس بستی سے یہ نکلا تھا اور جس بستی کی طرف یہ جارہا تھا، انتقال کے وقت یہ کس بستی کے زیادہ قریب تھا؟ جب ناپا گیا تو جس بستی کی طرف جارہا تھا وہ اس سے چند گز قریب تھا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب یہ شخص توبہ کرکے نیک لوگوں کی بستی کی طرف چل پڑا تھا اور اس سے زیادہ قریب ہوگیا تھا تو اب ہم بھی اس کے ساتھ مغفرت کا معاملہ کرتے ہیں۔

## کسی حال میں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں:

بہر حال مایوسی کا کوئی راستہ نہیں، چونکہ ہم سے حقوق العباد ضائع ہوگئے ہیں اور جن کے حقوق ضائع کیے گئے ہیں، ان کا انتقال ہوگیا ہے، لہذا اب ہماری مغفرت نہیں ہوسکتی، ایسا نہیں ہے، ابتداء میں تو حقوق العباد کا بہت اہتمام کرو اور ان کے ضائع ہونے کو سنگین سمجھو اور کسی اللہ کے بندے کے حق کو پامال نہ کرو، لیکن اگر کسی کا کوئی حق ضائع ہوجائے، تو فوراً معاف کرالو اور اگر معاف کرانے کا کوئی راستہ نہ ہو، تو مایوس نہ ہو، بلکہ اس کیلئے استغفار کرتے رہو اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہو کہ یا اللہ اپنے فضل وکرم سے مجھ سے ان بندوں کو راضی کردیجئے، جن کے حقوق میں نے پامال کیے اور یہ دعا کرتے رہو کہ یا اللہ ان کے درجات بلند فرمایئے، ان کی مغفرت فرمایئے ان کو رضاء کاملہ عطا فرمایئے، یہ دعا کرتے رہو، یہاں تک کہ یہ گمان غالب ہوجائے کہ وہ راضی ہوگئے ہوں گے۔

ہمارے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات میں مایوسی کا کوئی راستہ نہیں، ساری تعلیم یہ ہے کہ

سوئے نا امیدی مرو امید ہا است
سوئے تاریکی مرو خورشید ہا است

حضرت والا ناامیدی اور تاریکی کی طرف جانے ہی نہیں دیتے، بلکہ راستہ بتا دیتے ہیں

کہ اب اس طرح کرلو، اب اس طرح کرلو، اللہ تعالیٰ نے ہر صورت حال کا علاج رکھا ہے۔

## کفر و شرک سے توبہ:

دیکھئے! کفر و شرک سے زیادہ خراب چیز دنیا میں کوئی اور نہیں کفر اور شرک کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کو معاف نہیں کروں گا اس کے علاوہ ہر چیز معاف کردوں گا، لیکن اس کفر و شرک سے بھی توبہ کرنے کا راستہ کھول دیا، اگر ستر برس کا کافر بھی کفر و شرک سے توبہ کرلے، تو اللہ تعالیٰ قبول کرلیتے ہیں اور اس کو معاف فرمادیتے ہیں۔

## شیطان کے بہکاوے میں مت آیئے!

لہٰذا حقوق العباد کا معاملہ اگرچہ مشکل ہے، لیکن ایسا نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے آدمی ناامید ہو کر بیٹھ جائے، اسی لیے شیطان انسان کے اندر مایوسی پیدا کرکے بہکاتا ہے اور وہ انسان سے یہ کہتا ہے کہ اس گناہ کے نتیجے میں تو مردود ہوگیا، اب تیرا ٹھکانہ جہنم ہے، تیری معافی کا کوئی راستہ نہیں، لہٰذا جو تیری مرضی میں آئے وہ کام کر، اس لیے کہ جب جہنم میں جانا ہی ٹھہرا، تو پھر دنیا میں خوب مزے اڑا اور خوب گناہ کرکے جا، یہ شیطان اس طرح دھوکہ دیتا ہے اور زیادہ گناہوں کے اندر مبتلا کردیتا ہے۔ جب کہ حقیقت حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامیدی مومن کا کام نہیں، کتنے ہی بڑے سے بڑے گناہ کرلیے ہوں، پھر بھی وہ گناہ اللہ کی رحمت سے زیادہ نہیں ہوسکتے۔

## ''ابونواس'' کی مغفرت کا واقعہ:

عرب کا ایک شاعر گزرا ہے، جس کی کنیت ''ابونواس'' تھی، یہ آزاد منش قسم کا شاعر تھا، ان شعراء میں اس کا شمار تھا جو ہر قسم کے گناہوں میں مبتلا رہتے ہیں، چنانچہ ساری عمر گناہوں میں اور پینے پلانے میں گزری، ایک شخص نے مرنے کے بعد ان کو خواب میں دیکھا، اس سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ فرمایا؟ اس نے کہا کہ میں کیا بتاؤں؟ جب میں مر رہا تھا، اس وقت میں بہت ڈر رہا تھا کہ جب اللہ میاں کے سامنے جاؤں گا، تو وہاں میری ایسی پٹائی ہوگی کہ ساری زندگی کے مزے دھرے رہ جائیں گے، اس لیے مجھے بہت فکر اور

تشویش تھی کہ کیا ہوگا؟ اسی فکر اور تشویش کے عالم میں میں نے تین شعر کہے، بس اللہ تعالیٰ نے ان شعروں کی وجہ سے مجھے بخش دیا، اب خواب میں اس نے دو شعر سنائے کہ وہ شعر یہ تھے، وہ شعر بھی بڑے عجیب تھے، جب اللہ تعالیٰ شاعر کو توفیق دیدے تو شعر کے اندر اچھی بات بھی خوب بیان کرتا ہے، وہ شعر یہ ہیں:

يَا رَبِّ اِنَّ عَظْمَةَ ذُنُوْبِيْ كَثِيْرَةٌ
فَلَقَدْ عَلِمْتُ بِاَنَّ عَفْوَكَ اَعْظَمُ
اِنْ كَانَ لَا يَرْجُوْكَ اِلَّا مُحْسِنٌ
فَبِمَنْ يَلُوْذُ وَيَسْتَجِيْرُ الْمُجْرِمُ

اے پروردگار اگرچہ میرے گناہ بہت زیادہ ہیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ کی مغفرت اور آپ کی معاف کرنے کی صفت میرے گناہوں سے کہیں زیادہ عظیم ہے، اگر آپ کی رحمت کی امید صرف نیک لوگ ہی کر سکتے ہیں، تو یہ مجرم بے چارہ کہاں جائے گا؟ یہ کس کی پناہ حاصل کرے گا؟ یہ کس کا دروازہ کھٹکھٹائے گا؟

وَمَدَدْتُ يَدِيْ اِلَيْكَ تَضَرُّعًا
فَلَئِنْ رَدَدْتَ يَدِيْ فَمَنْ ذَا يَرْحَمُ

میں آج آپ کے سامنے عاجزی کے ساتھ ہاتھ پھیلا رہا ہوں، اگر آپ نے یہ ہاتھ واپس کر دیئے، تو پھر کون ہے جو ان پر رحم کرے؟

جاتے جاتے یہ شعر کہے، پتہ نہیں کس دل سے یہ اشعار کہے تھے، کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے فرمایا کہ جا میں تیری ان شعروں پر بخشش کرتا ہوں اور یہ وہ اشعار ہیں جو ''ابونواس'' کے بیاض میں موجود نہ تھے، اس لیے کہ بالکل آخر وقت میں دنیا سے جاتے جاتے کہے تھے، اس لیے بیاض میں لکھنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی، اس لیے خواب ہی میں خواب دیکھنے والے کو بتایا کہ میں نے یہ شعر کہے تھے، جس شخص نے خواب دیکھا تھا، اس نے خواب ہی کے حوالے سے یہ اشعار ابونواس کے دیوان میں تحریر کر دیئے۔

## ظاہری حالت پر جنتی یا جہنمی ہونے کا حکم مت لگاؤ:

اسی لیے بزرگ فرماتے ہیں کہ کسی شخص کی ظاہری حالت دیکھ کر اس کے بارے میں کبھی

جنتی یا جہنمی ہونے کا فیصلہ نہ کرو، کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی کونسی ادا پسند آ جائے؟ کیا پتہ آخر میں اس کا خاتمہ کیسے عمل پر ہو؟ اور اللہ تعالیٰ اس کو نواز دے اور کہاں سے کہاں پہنچ جائے۔ اس لیے حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

''میں ہر مسلمان کو اپنے آپ سے حالاً اور ہر کافر کو احتمالاً افضل سمجھتا ہوں۔''

''احتمالاً'' کا مطلب یہ ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ اس کو ایمان کی توفیق دیدے اور مجھ سے آگے نکل جائے، اس لیے ظاہری حالت میں کوئی شخص ایسا بھی ہو، تم اس کے فعل سے نفرت کرو کہ یہ شراب پینا بری بات ہے، لیکن اس کی ذات سے نفرت مت کرو، کیا پتہ اللہ تعالیٰ اس کی توبہ کی توفیق دیدے اور کہاں سے کہاں پہنچ جائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین پر صحیح طور پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

باب سوم کا چوتھا بیان:

# غیبت مباح کی صورت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ . وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ الْکَرِیْمِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ . اَمَّا بَعْدُ

## غیبت مباح کی صورت:

آگے حضرت والا نے فرمایا کہ

> اگر دینی ضرورت ہو تو پھر غیبت بھی مباح ہے، جیسے محدثین نے رواۃ حدیث پر جرح کی ہے۔ اگر دینی ضرورت نہیں، بلکہ محض نفسانیت ہے، تو اس صورت میں امر محقق کا بیان کرنا بھی غیبت محرمہ ہے اور بلا تحقیق کوئی بات کہی جائے تو بہتان ہے، کذب کا مدار تحقیق کذب پر نہیں، بلکہ عدم تحقیق صدق پر ہے۔

یعنی دینی ضرورت سے کسی کا عیب یا برائی بیان کرنا جائز ہے، چنانچہ تمام محدثین حضرات کا تو کام ہی لوگوں کے حالات کی تحقیق کرنا تھی، کہ فلاں راوی کیسا ہے؟ اور فلاں راوی کیسا ہے؟ چنانچہ جب کوئی شخص ان سے راوی کے بارے میں سوال کرتا تو وہ بتا دیتے کہ یہ راوی ضعیف ہے اور یہ راوی جھوٹا ہے، یہ راوی کذاب ہے، یہ راوی شتام ہے، لیکن یہ بیان کرنا ان کے ذمے واجب تھا، اگر بیان نہ کرتے تو گناہ گار ہوتے، کیونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کی حفاظت کا یہی طریقہ تھا کہ یہ معلوم کیا جائے کہ کونسا راوی کیسا ہے؟ لہٰذا یہ غیبت چونکہ دینی ضرورت کے لیے تھی، اس لیے یہ جائز تھی۔

## امام علی بن مدینیؒ کا اپنے والد کی جرح کا واقعہ:

حضرت علی بن مدینی رحمۃ اللہ علیہ بڑے اونچے درجے کے محدثین میں سے ہیں اور جرح

وتعدیل کے امام ہیں، البتہ ان کے والد حدیث کے معاملے میں پوری طرح قابل اعتماد نہیں تھے، کسی نے ان سے پوچھا کہ اپنے والد کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ وہ حدیث میں قوی ہیں یا ضعیف؟ پہلے تو فرمایا کہ میرے والد کے بارے میں یہ بات دوسرے محدثین سے پوچھ لو، سوال کرنے والے نے کہا، ان کے بارے میں مجھے آپ کی رائے معلوم کرنی ہے، جب سوال کرنے والے نے اصرار کیا، تو آپ نے سر جھکایا اور فرمایا'' ھو الدین ،انہ ضعیف'' یہ دین کی بات ہے، اس لیے یہ بتارہا ہوں کہ میرے والد حدیث کے معاملے میں ضعیف ہیں، چونکہ دین کی بات کو چھپانا نہیں ہے، چاہے وہ باپ کے خلاف ہو، یا بیٹے کے خلاف ہو، وہ دین کی ضرورت کے تحت کہنی ہوگی۔

## امام ابوداؤد کا اپنے بیٹے کی جرح کا واقعہ:

امام ابوداؤد بجستانی رحمۃ اللہ علیہ جو''سنن ابوداؤد'' کے مصنف ہیں، اتنے بڑے جلیل القدر محدث اور اتنے بڑے امام ہیں، ان کا بیٹا 'ابن ابی داؤد' حدیث کے بارے میں ضعیف تھا، امام ابوداؤدؒ سے کسی نے پوچھا کہ اپنے بیٹے کے باے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ انہوں نے جواب میں فرمایا۔

لَا تَحِلُّ عَنْهُ الرِّوَايَةُ۔ اس سے روایت کرنا حلال نہیں۔

دیکھئے! حضرات محدثین نے عیب کا اظہار کرنے میں نہ باپ کی پرواہ کی، نہ بیٹے کی پرواہ کی اور نہ عزیز واقارب کی پرواہ کی، اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کا معاملہ تھا اور راوی کی خامی کا اظہار کرنا دینی ضرورت تھی، اللہ تعالیٰ نے محدثین کا گروہ پیدا ہی اسی مقصد کے لیے کیا تھا، کہ ان کے ذریعہ احادیث کی حفاظت کا کام کرایا جائے، اس لیے حضرت والا فرماتے ہیں کہ جہاں دین کی ضرورت ہو وہاں نہ صرف یہ کہ غیبت کرنا جائز ہے، بلکہ بعض اوقات غیبت کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔

## امر محقق کو بیان کرنا بھی حرام اور غیبت ہے:

> ''لیکن اگر دینی ضرورت نہیں بلکہ محض نفسانیت ہی نفسانیت ہے تو اس صورت میں امر محقق کا بیان کرنا بھی غیبت محرمہ ہے''۔

اب یہ فرق کرنا ہے کہ جو بات کہہ رہا ہوں، یہ واقعی دینی ضرورت سے کہہ رہا ہوں یا اپنے نفس کی لذت لینے کے لیے نفسایت کے طور پر کہہ رہا ہوں، جائزہ لینے پر پتہ چلے گا کہ غیبت کے شوق میں اب نفس نے یہ حیلہ تراش لیا کہ جو بات تم کہہ رہے ہو، یہ دینی ضرورت کے تحت کہہ رہے ہو، لیکن جب اپنے باطن کے اندر کرید کر دیکھو گے، تو پتہ چلے گا کہ حقیقت میں دینی ضرورت نہیں تھی، بلکہ نفسانیت تھی، لہٰذا وہ غیبت محرمہ ہے، چاہے وہ ایسی بات ہو، جو حقیقت میں صحیح اور درست ہو اور تحقیق سے ثابت ہو چکی ہو، تب بھی وہ حرام اور ناجائز ہے۔

## امر غیر محقق کو بیان کرنا بہتان ہے:

> ''اور بلا تحقیق کوئی بات کہی جائے تو بہتان ہے، کذب کا مدار تحقیق کذب پر نہیں بلکہ عدم تحقیق صدق پر ہے۔''

یعنی جھوٹ کا مدار صرف اس بات پر نہیں کہ جب کسی چیز کا جھوٹا ہونا ثابت ہو جائے، تب جھوٹ ہوگا، بلکہ اگر کسی چیز کا سچا ہونا ثابت نہیں ہوا، پھر بھی تم اس کو بیان کر رہے، تو تمہارے حق میں وہ کذب ہے، کیونکہ حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صاف صاف ارشاد فرما دیا

كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ

(ابو داؤد ' کتاب الادب باب فی التشدید فی الکذب)

انسان کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ ہر سنی سنائی بات کو آگے بیان کر دے۔

لہٰذا جب ہم دوسرے کی غیبت کرتے ہیں، تو شیطان آ کر یہ سبق پڑھاتا ہے، کہ تم جو برائی بیان کر رہے ہو، یہ کوئی گناہ کا کام نہیں ہے، کیونکہ یہ دینی ضرورت ہے، حالانکہ حقیقت میں وہاں کوئی دینی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ اپنی نفسانیت ہوتی ہے، دونوں میں فرق کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے، ایک محقق اور شیخ ہی اس کا فرق بتاتا ہے کہ جو کام کیا ہے، یہ دینی ضرورت سے کیا ہے یا نفسانیت کی وجہ سے کیا ہے، شیطان دینی ضرورت کو آڑ بنا کر غیبت میں مبتلا کرا دیتا ہے، یہ غیبت کھلی ہوئی غیبت سے زیادہ خطرناک ہے، کیونکہ اس کے ذریعہ وہ اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینا چاہتا ہے کہ یا اللہ میں جو غیبت کر رہا ہوں، تیرے دین کی ضرورت سے کر رہا

ہوں، لہٰذا اس غیبت کے گناہ کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینے کا گناہ بھی شامل ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اور اپنے فضل و کرم سے غیبت کے گناہ سے ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین

## غیبت کا مزہ اور انجام:

حضرت والا نے فرمایا کہ

> ''غیبت میں نہ معلوم لوگوں کو کیا مزا آتا ہے، تھوڑی دیر کے لیے اپنا جی خوش کر لیتے ہیں، پھر اگر اس کو خبر ہو گئی، تو اس سے دشمنی پڑ گئی، تو عمر بھر اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے اور اگر ذرا دل میں حس ہو، تو غیبت کرنے کے ساتھ ہی قلب میں ایسی ظلمت پیدا ہوتی ہے، جس سے سخت تکلیف ہوتی ہے، جیسے کسی نے گلا گھونٹ دیا ہو۔ (انفاس عیسیٰ ص ۱۵۲)

چونکہ ہم لوگوں کے مزاج خراب ہو گئے ہیں اور حس جاتی رہی ہے، اس لیے ہم گناہ کرتے رہتے ہیں، لیکن ہمیں گناہوں کی ظلمت کا احساس نہیں ہوتا، جن لوگوں کے قلوب کو اللہ تعالیٰ مجلی اور مصفی فرماتے ہیں، ان کے قلب پر معمولی سے گناہ کی بھی ایسی عظمت ہوتی ہے، جیسے کسی نے ان پر پہاڑ رکھ دیا ہو، مولانا رومی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

بر دل سالک ہزاراں غم بود<br>
گر ز باغ دل خلالے کم بود

اگر دل کے باغ میں ایک تنکا بھی کم ہو جائے، تو سالک کے دل پر ہزاروں غم ٹوٹ پڑتے ہیں۔

## مولانا رشید احمد گنگوہی کا اہتمام تکبیر اولیٰ کا واقعہ:

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب میں پڑھا تھا کہ ایک مرتبہ آپ بہت غمگین بیٹھے ہوئے تھے اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے غم کا پہاڑ ٹوٹ گیا ہو، ایک شاگرد نے حضرت سے جا کر پوچھا کہ حضرت آپ کے چہرے پر غم کے آثار نظر آ رہے ہیں، خیریت تو ہے؟ آپ نے فرمایا

کہ ہاں، کچھ غم ہے، انہوں نے اصرار کیا کہ حضرت کیا غم ہے؟ اس وقت دار العلوم دیوبند میں دستار بندی کا جلسہ ہو رہا تھا، فرمایا کہ جلسہ میں کچھ ایسی مصروفیات ہوگئی کہ آج جب ہم مسجد میں نماز پڑھنے گئے، تو ہماری تکبیر اولی چھوٹ گئی، امام سے نہیں سن سکے، پھر فرمایا کہ ۳۵ سال میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ نماز میں تکبیر اولی چھوٹ گی، اب آپ اندازہ لگائیں، کیونکہ صرف تکبیر اولیٰ چھوٹ جانے کا مطلب یہ ہے کہ قرات سنی رکوع میں شریک ہوئے رکعت مل گئی اور صحیح قول کے مطابق تکبیر اولی میں بھی شرکت ہوگئی لیکن اس کے باجود تکبیر اولی کے چھوٹنے پر اتنے غمگین تھے۔

## نماز کے معاملہ میں لوگوں کی بے حسی:

دوسری طرف ہمارا یہ حال ہے کہ ہماری جماعتیں نکل جاتی ہیں اور اکثر نمازی حضرات مسبوق ہوکر اپنی نمازیں پوری کرتے ہیں، لیکن اس کا احساس نہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ ہمارے اندر بے حسی ہے (العیاذ باللہ) اللہ تعالیٰ اپنی رحمت فرما کر اسے دور فرما دے۔ آمین۔

## مولانا محمد یعقوب صاحب نانا توی کا واقعہ:

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانا توی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک مشکوک لقمہ پیٹ میں چلا گیا، اس لقمہ کے حلال اور حرام ہونے میں شک تھا، فرمایا کہ ایک مہینے تک اس لقمہ کی ظلمت اپنے دل کے اندر محسوس کرتا رہا، ہماری تو حس خراب ہے، مزاج بگڑا ہوا ہے، اس لیے گناہ کی برائی کا احساس ہی نہیں ہوتا، بس ایسا سمجھتے ہیں جیسے ایک مکھی آکر بیٹھی اور اس کو اڑا دیا، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہماری حس کو درست فرمائے، مزاج درست فرمائے۔ آمین۔

## غیبت سے کیا حاصل ہوا؟

بہر حال غیبت کو چھوڑنے کے لیے یہ سوچنا چاہیے کہ اگر تم نے تھوڑا بہت وقت غیبت کے اندر خرچ کر بھی لیا اور غیبت سے تھوڑا مزہ بھی آ گیا، لیکن اس غیبت کا حاصل کیا ہوا؟ کیا

فائدہ حاصل ہوا؟ ظاہر ہے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں، بلکہ اس کے نتیجے میں آخرت کا اتنا بڑا گناہ کمالیا اور دنیا کے اندر یہ صورت حال ہے کہ اگر اس شخص کو خبر ہوگئی، جس کی تم نے غیبت کی ہے کہ فلاں نے میری یہ غیبت کی ہے، تو اس کی طبیعت میں تمہاری طرف سے جو کدورت اور عداوت پیدا ہوگی وہ نہ جانے کیا خمیازہ لے کر آئے گی۔

## ایسا کام نہ کرو جس سے دشمنیاں پیدا ہوں:

اور حقوق العباد کے گناہوں کا قاعدہ یہ ہے کہ جب آدمی ایک گناہ کرتا ہے، تو اس کی بیچ میں اس کو دس غلط کام کرنے پڑتے ہیں، مثلاً جس کی غیبت کی تھی، اس کو پتہ چل گیا، اس نے آکر اس سے پوچھ لیا کہ تم نے یہ غلط بات کی تھی، اب یا تو اعتراف کرے کہ ہاں میں نے یہ بات کہی تھی، اب اگر اعتراف کرے، تو مجرم بنے یا اعتراف نہ کرے تو پھر تاویل کرے گا کہ میں نے تو یوں کہا تھا یا جھوٹ بولے گا کہ میں نے تو یہ بات نہیں کہی، اب اگر اس دوسرے شخص کو پتہ چل گیا کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے، تو اس کے دل میں اس کی طرف سے اور زیادہ کدورت اور دشمنی پیدا ہوگی، لہٰذا انسان ایسا کام کیوں کرے، جس کے نتیجے میں دشمنیاں پیدا ہوں، بغض اور عداوت پیدا ہو، ایسے کام کا کوئی فائدہ نہیں، بلکہ قلب میں ظلمت پیدا ہونے کا نقصان علیحدہ ہے۔

## غیبت کا اصل مجرب علاج ''تواضع'' ہے:

حضرت والا نے فرمایا کہ

> غیبت کا علاج بھی تواضع ہی ہے مگر تواضع ایک دن میں پیدا نہیں ہوتی اس لیے جب تک تواضع حاصل نہ ہو غیبت سے بچنے کے لیے فوری علاج یہ کرو کہ بدون سوچے کوئی بات نہ کیا کرو جو بات کرو سوچ کر کرو اس سے غیبت کم ہو جائے گی اور کچھ دنوں کے بعد بالکل نہ ہوگی اور اگر کسی وقت بے سوچے کوئی بات نکل جائے تو اسی وقت دو رکعت نفل ''صلوۃ التوبہ'' کی نیت سے پڑھ لیا کرو۔
>
> (انفاس عیسیٰ ص ۱۵۲)

اس ملفوظ میں پہلی بات یہ ارشاد فرمائی کہ غیبت انسان سے سرزد ہی نہ ہو، اس کا اصل

علاج یہ ہے کہ دل میں تواضع پیدا کرو، ہمیشہ یادرکھو! غیبت تواضع کے فقدان کی وجہ سے ہوتی ہے، جب آدمی اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے اور تکبر میں مبتلا ہوتا ہے، تب دوسرے کی غیبت کرتا ہے، جس شخص کو اپنے عیوب کا دھیان ہو، اس کی اصلاح کی فکر ہو، اس کو دوسروں کے عیوب بیان کرنے کی کہاں فرصت؟ وہ تو اپنے درد میں مبتلا ہے کہ میرے اندر یہ عیب ہے، میرے اندر یہ خرابی ہے، کس طرح ان کو دور کروں، بس اسی ادھیڑ پن میں مبتلا ہے، وہ دوسروں کے عیوب کو کہاں دیکھتا پھرے گا، ہاں اگر دل میں تکبر اور بڑائی ہے اور دوسروں کی تحقیر ہے، اس کو اپنی فکر تو نہیں ہے، اس لیے وہ دوسروں کے عیوب کو دیکھتا پھرتا ہے کہ اس میں فلاں برائی ہے، اس میں فلاں برائی ہے، پھر ان برائیوں کو دوسروں کے سامنے بیان کرتا رہتا ہے، لہذا غیبت کی اصل جڑ عجب اور تکبر ہے، جب یہ تکبر اور عجب ختم ہو جائے گا، تو پھر غیبت کبھی سرزد نہیں ہوگی، اس لیے غیبت کا اصل علاج تکبر کو ختم کرنا اور تواضع پیدا کرنا ہے۔

## اکابر اور بزرگوں کی تواضع کی ایک جھلک:

حضرت ڈاکٹر حفیظ اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ دارالعلوم میں تشریف لائے، ان کی زبانی ایک واقعہ سنا کہ حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ (جامعہ خیر المدارس ملتان کے بانی) نے فرمایا کہ جب میں حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں جاتا، تو بلا مبالغہ مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس مجلس کے اندر جتنے لوگ موجود ہیں ان میں سب سے کمتر اور حقیر اور بدحال میں ہوں اور یہ سب مجھ سے افضل ہیں، بلکہ یہ سب انسان ہیں اور میں بیل ہوں، پھر مجھے خیال پیدا ہوا کہ میری یہ حالت درست ہے یا نہیں؟ چنانچہ میں حضرت مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ (جامعہ اشرفیہ لاہور کے بانی) کی خدمت میں حاضر ہوا اور جا کر عرض کیا کہ میرا یہ معاملہ ہے کہ جب میں حضرت والا کی مجلس میں آتا ہوں کہ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس مجلس میں سب سے کمتر اور حقیر میں ہوں، مجھ سے زیادہ حقیر اور کمتر کوئی اور نہیں ہے۔ حضرت مفتی صاحب فرمانے لگے کہ یہ حالت تو میری بھی ہے کہ مجلس میں جاتا ہوں، تو ایسا لگتا ہے کہ سب حاضرین سے زیادہ کمتر اور بدحال میں ہی ہوں، تو حضرت مولانا خیر محمد صاحب نے فرمایا کہ تم بھی میرے ساتھ اس حال میں شریک ہو گئے، چلیں حضرت والا سے اپنی حالت بیان کرتے ہیں۔

چنانچہ یہ دونوں حضرات حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا کہ جب ہم مجلس میں بیٹھتے ہیں، یہ خیال ہوتا ہے کہ اس مجلس کے اندر جتنے حاضرین ہیں، وہ سب ہم سے افضل ہیں اور ہم سب سے کمتر اور ذلیل اور حقیر ہیں، حضرت والا نے فرمایا کہ کچھ فکر نہ کرو، ارے بھائی! میرا بھی یہی حال ہے، جب میں مجلس میں بیٹھتا ہوں، تو ایسا لگتا ہے کہ میں ان سب کے مقابلے میں کمتر ہوں، سب مجھ سے افضل ہیں۔

## غیبت کو ختم کرنے والی چیز:

تواضع یہ نہیں ہے کہ آدمی صرف اپنی زبان سے یہ کہہ دے کہ احقر نا کارہ ہے، ناچیز ہے ، بلکہ تواضع یہ ہے کہ واقعتاً اپنے عیوب پر اتنی نگاہ ہو کہ اپنے عیوب کے مقابلے میں دوسروں کے عیوب نظر ہی نہ آئیں، جس دن یہ تواضع پیدا ہوگئی، تو پھر انشاء اللہ غیبت پاس ہی نہیں بھٹکے گی، اس لیے کہ جب انسان اپنے کو دوسروں سے کمتر سمجھ رہا ہے اور اس کو اپنے عیوب کا استحضار ہے، تو وہ دوسروں کے عیوب کو کیسے دیکھے گا؟ لہٰذا اگر ''غیبت'' کا جڑ سے بالکلیہ خاتمہ کرنا ہے، تو اپنے اندر تواضع پیدا کرو۔

## تواضع پیدا کرنے کا طریقہ:

اب تواضع کیسے پیدا کریں؟ تواضع پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے عیوب کا استحضار کرو، یہ جو ہر وقت اپنی بڑائی کا خیال دل میں جما رہتا ہے کہ ''ہم چوں ما دیگرے نیست'' (ہم جیسا کوئی دوسرا نہیں) اور یہ جو ہمیں کبھی اپنے علم پر گھمنڈ، کبھی اپنے تقویٰ پر گھمنڈ، کبھی اپنے مال و دولت پر گھمنڈ، کبھی اپنی صحت پر گھمنڈ، کبھی اپنی شکل و صورت پر گھمنڈ رہتا ہے، یہ گھمنڈ ہی انسان کو تباہ کر دیتا ہے۔

## انسان کی اصل حقیقت کا بیان:

ایک بزرگ سے ایک نوجوان نے کہا کہ جانتے نہیں میں کون ہوں؟ ان بزرگ نے فرمایا ہاں میں جانتا ہوں کہ تم کون ہو، کہو، تو بتاؤں؟ چنانچہ ان بزرگ نے فرمایا

أَوَّلُكَ نُطْفَةٌ كَدِرَةٌ. وَآخِرُكَ جِيفَةٌ قَذِرَةٌ فِيمَا بَيْنَ ذٰلِكَ تَحْمِلُ

اَلْعَذِرَۃَ

تیرا آغاز تو یہ ہے کہ تو ایک گندے نطفے سے پیدا ہوا ہے اور تیرا انجام یہ ہے کہ تو بدبودار مردار ہو جائے گا حتیٰ کہ تیرے گھر والے بھی تجھے رکھنے کو تیار نہیں ہوں گے اور ولادت سے وفات تک جو درمیان کا عرصہ ہے، اس میں تو گندگی کے ٹوکرے اٹھائے پھر رہا ہے۔

جو کھال جسم پر ہے، اس کھال کو اللہ تعالیٰ نے ''ساتر العیوب'' بنا رکھا ہے، اگر یہ کھال ذرا سی چھل جائے، تو اندر نجاست ہی نجاست بھری ہوئی ہے، کہیں خون ہے، کہیں پیپ ہے، کہیں پیشاب ہے، کہیں پاخانہ ہے، یہ سب نجاستیں اٹھائے پھر رہا ہے، یہ حقیقت ہے ہماری۔ مگر خود کو بڑا سمجھ رہا ہے اور تکبر کے یہ خیالات پھر انسان کو غیبت پر آمادہ کرتے ہیں۔

لہٰذا ''غیبت'' کا اصل علاج یہ ہے کہ اپنے اندر تواضع پیدا کرے، جب تواضع پیدا ہو جائے گی، تو پھر انشاء اللہ کسی کی غیبت نہیں ہوگی، البتہ جہاں دینی ضرورت ہو ''غیبت'' جائز ہے، مثلاً کسی کو نقصان سے بچانا ہے، آپ اس کو بتادیں کہ فلاں شخص سے ہوشیار رہنا، یہ معاملات کا صاف نہیں، تو یہ غیبت میں داخل ہی نہیں۔



## رگڑے کھائے بغیر ''تواضع'' پیدا نہیں ہوتی:

تجربہ یہ ہے کہ رگڑے کھائے بغیر ''تواضع'' پیدا نہیں ہوتی، دراصل بات یہ ہے کہ انسان کے دماغ میں خناس ہوتا ہے اور وہ خناس یہ ہے کہ انسان اپنی رائے کو بالا سمجھتا ہے، اپنی سوچ کو بالکل صحیح سمجھتا ہے کہ جو میں سوچ رہا ہوں یہ صحیح ہے اور دوسرا جو سوچ رہا ہے، وہ غلط ہے، جب انسان اپنی سوچ اور فکر کو کہیں جا کر اس طرح فنا نہیں کرے گا کہ جو میں سوچتا ہوں، وہ غلط ہے اور جو آپ کہتے ہیں وہ صحیح ہے، چاہے مجھے آپ کی سوچ کتنی ہی غلط اور بری معلوم ہو رہی ہو اور دلیل کے خلاف معلوم ہو رہی ہو، بداہت کے خلاف معلوم ہو رہی ہو، لیکن میں آپ کی بات مانوں گا، جب تک اس طرح اپنی سوچ و فکر کو نہیں مٹائے گا، اس وقت تک تواضع پیدا نہیں ہوگی اور تکبر ختم نہیں ہوگا۔

## حضرت شیخ الحدیث صاحب رحمہ اللہ کی نصیحت

اللہ تعالیٰ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے درجات بلند

فرمائے۔ آمین، جب میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی وفات ہوئی، تو حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ نے بہت مفصل خط مجھے اور بھائی صاحب مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم کو لکھا، اس خط میں بہت ساری نصیحتیں فرمائیں، لیکن ایک نصیحت یہ فرمائی کہ

''میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ یہ صاحبزادگی کا سور بہت دیر سے نکلتا ہے۔''

یعنی کسی بڑے آدمی کے بیٹے ہونے کی وجہ سے دماغ میں ایک خناس پیدا ہو جاتا ہے، اس کو ''سور'' سے تعبیر فرمایا، اس خناس کا مطلب ''تکبر'' ہے اور یہ ''سور'' بہت دیر سے نکلتا ہے، یعنی دوسرے امراض کا علاج تو جلدی ہو جاتا ہے، لیکن اس کا علاج بہت دیر سے ہوتا ہے، بہر حال اس خط کے ذریعہ اس طرف ہمیں متوجہ فرمایا کہ اس کی فکر کرنی چاہیے کہ کسی طرح یہ مرض نکل جائے اور پھر فرمایا کہ

''جب کوئی شخص اپنے آپ کو کسی کے سامنے فنا کر دے اور رگڑے کھائے، جب یہ نکلے، جب تک یہ نہ نکلے اس وقت تک راستہ نہیں کھلتا''۔

## علم کا ''سور'' دیر سے نکلتا ہے:

اسی طرح ''علم کا سور'' ہے، کہ عالم ہیں، یہ عالم ہونے کا جو گھمنڈ ہے، یہ بھی بڑا خطرناک ہے اور یہ بھی دیر سے نکلتا ہے، جب تک اپنے آپ کو دوسرے کے سامنے فنا نہ کر دے، اس وقت تک یہ نہیں نکلتا اور اگر یہ دونوں جمع ہو جائیں کہ علم بھی ہو اور صاحبزادگی بھی ہو اور پھر سور در سور جمع ہو گئے، اس کا علاج آسان نہیں، اس کا علاج صرف یہی ہے کہ کہیں رگڑے کھائے، اپنے آپ کو پامال کرے، مولانا رومی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

قال را بگزار صاحب حال شو
پیش مردے کاملے پامال شو

''پامال'' کے معنی یہ ہیں کہ تمہیں پاؤں سے روندا جائے، پاؤں سے روندے جانے کا مطلب یہ کہ چاہے تمہارے دل و دماغ میں بات نہیں آ رہی ہے، عقل و بداہت کے خلاف وہ بات معلوم ہو رہی ہے، لیکن پھر بھی بڑے کی بات کے سامنے تم اپنے آپ کو اس طرح جھکا دو، جیسے پاؤں میں روندا جا رہا ہے، جب تک اس پر عمل نہیں ہوگا، اس وقت تک یہ سور دماغ

سے نہیں نکلے گا، لہٰذا جب تک تکبر دل میں موجود رہے گا "حسد" بھی رہے گا، غیبت بھی رہے گی، بغض بھی رہے گا، غصہ بھی رہے گا اور جب تکبر چلا جائے گا اور تواضع پیدا ہو جائے گی، اس وقت یہ سارے امراض بھی چلے جائیں گے۔

## غیبت ہونے پر جانی جرمانہ:

لیکن یہ تواضع اور انکساری ایک دو دن میں پیدا نہیں ہوں گی، اس کے لیے محنت اور مشق کی ضرورت ہے اور کسی شیخ کامل کی صحبت کی ضرورت ہے، تب جا کر تواضع پیدا ہو گی اس لیے حضرت والا فرماتے ہیں کہ جب تک یہ بات حاصل نہ ہو، یعنی تواضع نہ ہو، اس وقت تک یہ کرے کہ بے سوچے بات نہ کرے اور اگر کبھی غیبت ہو جائے، تو اپنے اوپر جرمانہ مقرر کرلے، ایک جرمانہ کا بیان پیچھے گزر چکا کہ ایک وقت فاقہ کرے، یہاں ایک دوسرا جرمانہ بیان فرمایا کہ دو رکعت صلوٰۃ التوبہ پڑھ لیا کرو، اس طرح کرنے سے رفتہ رفتہ انشاء اللہ یہ بیماری دور ہو جائے گی۔



## صرف آرزو کرنا کافی نہیں، محنت کی ضرورت ہے:

دیکھئے دنیا میں کوئی کام محنت کے بغیر نہیں ہوتا، تھوڑی بہت محنت ضرور کرنی پڑتی ہے، محض آرزو کر لینے سے اور خواہش کر لینے سے کام نہیں بنتا ہے۔

آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

یعنی صرف آرزو کر لینے سے تقدیر نہیں بدلا کرتی، بلکہ اس کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔

## صرف "انگڑ" رکھنے والے دیہاتی کا قصہ

جیسے ایک دیہاتی کا قصہ حضرت والا نے لکھا ہے کہ دیہاتی بیٹھا ہوا اپنی دیہاتی زبان میں یہ کہہ رہا تھا، یوں جی کرے، ڈھیر سارا دودھ ہو اور ڈھیر سارا گڑ ہو اور میں ڈھیر سارا دودھ میں ڈھیر سارا گڑ ڈال کر انگڑ (انگلی) سے اس کو چلاؤں اور پھر خوب پیوں، یوں جی کرے، کسی نے اس دیہاتی سے کہا کہ تیرا یوں جی تو کرے، لیکن تیرے پاس کچھ ہے بھی؟ اس نے کہا میرے پاس انگڑ (انگلی) ہے، یعنی نہ دودھ ہے، نہ گڑ ہے، بس انگڑ ہے، اب وہ اس انگڑ

کے بل بوتے پر آرزو کر رہا تھا۔

حضرت والا فرماتے ہیں کہ ''جیسے وہ بیوقوف انگڑ کی بنیاد پر یہ آرزو باندھ رہا تھا، حالانکہ صرف آرزو باندھنے سے کچھ نہیں ہوتا، ایسے ہی ہم بھی اصلاح کی محض آرزوئیں باندھا کرتے ہیں، ارے دیکھو! تمہارے پاس کچھ عمل ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے، تو اس کے حصول کے لیے کوشش اور محنت کرو، تب جا کر وہ حاصل ہوگا۔

## عاجز کون ہوتا ہے؟

لہذا کوئی کام محض آرزو کر لینے سے نہیں ہوتا کہ کاش میں ایسا ہو جاؤں، کاش میں نیک ہو جاؤں، کاش میں متقی بن جاؤں، کاش میں غیبت چھوڑ دوں، محض تمنائیں کرنے سے اور آرزوئیں کرنے سے بات نہیں بنتی، حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اَلْعَاجِزُ مَنِ اتَّبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا وَتَمَنّٰى عَلَى اللّٰهِ .

(الترمذی باب صفه القیامة)

عاجز وہ شخص ہے جس نے اپنے آپ کو خواہشات نفسانی کے پیچھے چھوڑ رکھا ہو، خواہشات جس طرح لے جا رہی ہیں، وہ جا رہا ہے، کوئی روک اور لگام نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ پر تمنائیں باندھ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑا غفور و رحیم ہے، معاف کر دے گا، ایسا بندہ عاجز ہے، لہذا محض تمنا اور آرزو کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، بلکہ تمنا کے ساتھ ساتھ قدم آگے بڑھائے، تھوڑی سی محنت کرے، عمل کرے اور پھر اللہ تعالیٰ سے کہے کہ یا اللہ میرے بس میں جتنا تھا، اتنا میں نے کرلیا، اب اس کی تکمیل کرنا آپ کے قبضہ وقدرت میں ہے، آپ اس کی تکمیل فرمادیجئے۔

## ذرا سی توجہ کر کے چلو تو سہی:

کیا اللہ تعالیٰ ہمیں مشقت میں ڈالنا چاہتے ہیں؟ نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ تو یہ چاہتے ہیں کہ میرا یہ بندہ ذرا سا میری طرف چلے، جب وہ چلے گا، تو ہم خود اس کی رہنمائی کریں گے، جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا

﴿ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ﴾ (العنکبوت ٦٩)

جو لوگ ہمارے راستے میں کوشش کریں گے، ہم ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے راستے پر لے چلیں گے، ذرا سی توجہ کی ضرورت ہے۔

## تھوڑا چل کر دکھاؤ...... آگے اللہ رہنمائی کریں گے:

حضرت والا اس کی مثال یہ دیتے ہیں، کہ جیسے ایک بچہ چلنا سیکھتا ہے اور باپ یہ چاہتا ہے کہ میرا بیٹا چلنا سیکھ لے، تو اب باپ ذرا دور کھڑے ہو کر بچے کو بلاتا ہے، کہ بیٹا میرے پاس آؤ اور جب وہ بیٹا ذرا سا قدم بڑھاتا ہے اور گرنے لگتا ہے، تو باپ جلدی سے اس کو گود میں اٹھا لیتا ہے، اسی طرح جب کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کی طرف چلے گا اور قدم بڑھائے گا اور پھر وہ گرنے لگے، تو اللہ تعالیٰ اس کو گرنے نہیں دیں گے، بلکہ آگے بڑھ کر اس کو تھام لیں گے، جب ایک باپ اور ماں اپنی اولاد کے ساتھ یہ معاملہ کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ جو رحمٰن اور الرحیم ہے اور جو ماں اور باپ کا خالق ہے، جس نے ماں باپ کے دل میں شفقت اور محبت ڈالی ہے، کیا وہ اپنے بندوں کو بے یار و مددگار چھوڑ دے گا؟ بس اللہ تعالیٰ دیکھنا چاہتے ہیں کہ میرا بندہ میرے راستے پر چلا ہے، اس نے تھوڑی سی محنت کی ہے، پھر اللہ تعالیٰ خود ہی منزل تک پہنچا دیتے ہیں۔

## غیبت کا ایک عجیب عملی علاج:

پھر حضرت والا نے آگے ایک عجیب عملی علاج بیان فرمایا، یہ علاج کڑوا تو ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اس علاج کی توفیق دے دے، تو چند دن میں غیبت چھوٹ جائے فرمایا کہ

> ”غیبت کا ایک عجیب و غریب عملی علاج یہ ہے کہ جس کی غیبت کرے، اس کو اپنی حرکت کی اطلاع کر دیا کرے، تھوڑے دن اس پر مداومت سے انشاء اللہ یہ مرض بالکل دفع ہو جائے گا۔“ (انفاس عیسیٰ ص ۵۳)

جب کسی کی غیبت ہو جائے، جا کر اس کو بتاؤ کہ آج میں نے تمہاری یہ غیبت کی ہے، جس وقت جا کر یہ بتائے گا، اس وقت دل پر آرے چل جائیں گے، لیکن یہ ”آرا“ ہی اس بیماری کا آپریشن کرے گا، اگر چند مرتبہ یہ عمل کر لیا، تو انشاء اللہ یہ بیماری جڑ سے نکل جائے گی اور

دوسری بات یہ ہے کہ جب آدمی دوسرے سے جا کر کہے گا کہ میں نے تمہاری غیبت کی تھی، اس دوسرے آدمی کے دل میں بھی نرمی پیدا ہوگی کہ جو شخص چونکہ ندامت اور پشیمانی کے ساتھ میرے پاس آیا ہے، چلو اس کو معاف کردو، چنانچہ غیبت کے نتیجے میں جو عداوت اور دشمنی اور اشتعال پیدا ہوتا ہے، وہ اشتعال پیدا نہیں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

روح کی بیماریاں اور ان کا علاج

# باب......(۴)

# تواضع

# رفعت اور بلندی کا ذریعہ

# تواضع

## رفعت اور بلندی کا ذریعہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا. اَمَّا بَعْدُ فَقَدْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَہُ اللّٰہُ. (ترمذی کتاب البر والصلۃ باب ما جاء فی التواضع)

### تمہید:

اس وقت میں نے آپ حضرات کے سامنے تواضع کے بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد پڑھا، جس کے معنی یہ ہیں کہ ”جو شخص اللہ تعالیٰ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو بلندی سے نوازتے ہیں“ اس وقت اسی ارشاد کی تھوڑی سی تشریح کرنی ہے، جس میں تواضع کی اہمیت اور اس کی حقیقت اور اس پر عمل کرنے کا طریقہ بیان کرنا مقصود ہے، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے صحیح بیان کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

### تواضع کی اہمیت اور عدم تواضع کا انجام:

جہاں تک تواضع کی اہمیت کا تعلق ہے، تو یہ تواضع اتنی اہم چیز ہے کہ اگر انسان کے اندر تواضع نہ ہو، تو یہی انسان فرعون اور نمرود بن جاتا ہے، اس لیے کہ جب دل میں تواضع کی صفت نہیں ہوگی، تو پھر تکبر ہوگا، دل میں اپنی بڑائی ہوگی اور یہ تکبر اور بڑائی تمام امراض باطنہ کی جڑ ہے۔

## سب سے پہلی نافرمانی کی بنیاد:

دیکھیے! اس کائنات میں سب سے پہلی نافرمانی ابلیس نے کی، اس نے نافرمان ہونے کا بیج بویا، اس سے پہلے نافرمانی کا کوئی تصور نہیں تھا، جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا اور تمام فرشتوں کو ان کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دیا، تو ابلیس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور کہا:

﴿اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِىْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ﴾ (سورۃ ص:۷۶)

یعنی میں اس آدم سے اچھا ہوں، اس لیے کہ مجھے آپ نے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو آپ نے مٹی سے پیدا کیا ہے اور آگ مٹی سے افضل ہے، اس لیے میں اس سے افضل ہوں، میں اس کو سجدہ کیوں کروں؟ یہ سب سے بڑی نافرمانی تھی، جو اس کائنات میں سرزد ہوئی اور اس نافرمانی کی بنیاد تکبر اور بڑائی تھی کہ میں اس آدم سے افضل ہوں یا اچھا ہوں، میں اس سے بہتر ہوں، اب اس تکبر کے نتیجے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو راندہ درگاہ کر دیا، اس سے معلوم ہوا کہ ساری نافرمانیوں اور برائیوں کی جڑ تکبر ہے، جب دل میں تکبر پیدا ہوگا، تو دوسری برائیاں بھی اس میں جمع ہوں گی۔

## اللہ کے حکم کے آگے عقل چلانے کا انجام:

اس تکبر کی وجہ یہ ہوئی کہ شیطان نے اپنی عقل پر ناز کیا، اس نے سوچا کہ میں ایسی عقلی دلیلیں پیش کر رہا ہوں، جس کا توڑ مشکل ہو، وہ یہ کہ اگر آگ اور مٹی کا تقابل کیا جائے، تو آگ مٹی سے افضل ہے، اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے اپنی عقل چلائی، جس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ بارگاہ خداوندی سے مطرود اور مردود ہوا۔ اقبال مرحوم شعر میں بعض اوقات بڑی حکیمانہ باتیں کہتے ہیں چنانچہ ایک شعر میں انہوں نے اسی واقعہ کی طرف اس طرح اشارہ کیا کہ

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرائیل نے ☆ جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

اس لیے کہ جو عقل کا غلام بن گیا، اس نے اللہ تعالی کی بندگی کا تو انکار کر دیا، اس شیطان نے یہ نہیں سوچا کہ جب معاملہ اللہ تعالی کے ساتھ ہے، اسی نے تجھے پیدا کیا اور اس نے آدم کو پیدا کیا، وہ خالق کائنات بھی ہے، وہ کہہ رہا ہے کہ تو آدم کو سجدہ کر، تو اب تیرا کام یہ تھا کہ

اس کے حکم کے آگے سر جھکا دیتا، مگر تو نے اس کے حکم کی نافرمانی کی اس طرح مردود ہوا۔

## تمام گناہوں کی جڑ تکبر ہے:

بہر حال تکبر سارے گناہوں کی جڑ ہے...... تکبر سے غصہ پیدا ہوتا ہے...... تکبر سے حسد پیدا ہوتا ہے...... تکبر سے بغض پیدا ہوتا ہے...... تکبر کی بنیاد پر دوسروں کی دل آزاری ہوتی ہے...... تکبر سے دوسروں کی غیبت ہوتی ہے...... جب تک دل میں تواضع نہ ہوگی اس وقت تک ان برائیوں سے نجات نہ ہوگی، اس لیے ایک مومن کے لیے تواضع کو حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔

## تواضع کی حقیقت اور تواضع کا انعام:



تواضع عربی زبان کا لفظ ہے، اس کے معنی ہیں "اپنے آپکو کم درجہ سمجھنا"، لہٰذا اپنے آپ کو کم درجہ والا کہنا، تواضع نہیں، جیسا کہ آج کل لوگ تواضع اس کو سمجھتے ہیں کہ اپنے لیے تواضع اور انکساری کے الفاظ استعمال کر لئے، مثلاً اپنے آپ کو احقر کہہ دیا، ناچیز ناکارہ کہہ دیا، یا خطا کار، گناہ گار کہہ دیا اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان الفاظ کے استعمال کے ذریعہ تواضع حاصل ہوگئی، حالانکہ اپنے آپ کو کمتر کہنا تواضع نہیں، بلکہ کمتر سمجھنا تواضع ہے، مثلاً یہ سمجھے کہ میری کوئی حیثیت، کوئی حقیقت نہیں، اگر میں کوئی اچھا کام کر رہا ہوں، تو یہ محض اللہ تعالیٰ کی توفیق ہے، اس کی عنایت اور مہربانی ہے، اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے، یہ ہے تواضع کی حقیقت، جب یہ حقیقت حاصل ہو جائے، تو اس کے بعد زبان سے چاہے اپنے آپ کو حقیر اور ناچیز، ناکارہ کہو، یا نہ کہو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، جو شخص تواضع کی اس حقیقت کو حاصل کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو بلند مقام عطا فرماتے ہیں۔

## بزرگوں کی انکساری کی ایک جھلک:

جن بزرگوں کی باتیں سن اور پڑھ کر ہم لوگ دین سمجھتے ہیں، ان کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ وہ لوگ اپنے آپ کو اتنا بے حقیقت سمجھتے ہیں، جس کی حد و حساب نہیں، چنانچہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کا یہ ارشاد میں نے اپنے بے شمار

بزرگوں سے سنا وہ فرماتے تھے کہ۔

میری حالت یہ ہے کہ میں ہر مسلمان کو اپنے آپ سے فی الحال اور ہر کافر کو احتمالاً اپنے آپ سے افضل سمجھتا ہوں، مسلمانوں کو تو اس لیے افضل سمجھتا ہوں کہ وہ مسلمان اور صاحب ایمان ہے اور کافر کو اس وجہ سے کہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو کبھی ایمان کی توفیق دیدے اور یہ مجھ سے آگے بڑھ جائے۔

ایک مرتبہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ جب میں حضرت تھانوی کی مجلس میں بیٹھتا ہوں، تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ جتنے لوگ مجلس میں بیٹھے ہیں، سب مجھ سے افضل ہیں اور میں ہی سب سے زیادہ نکما اور ناکارہ ہوں، حضرت مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سن کر یہ فرمایا کہ میری بھی یہی حالت ہوتی ہے، پھر دونوں نے مشورہ کیا، کہ ہم حضرت تھانویؒ کے سامنے اپنی یہ حالت ذکر کرتے ہیں، معلوم نہیں کہ یہ حالت اچھی ہے یا بری ہے؟ چنانچہ یہ دونوں حضرات حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی حالت بیان کی، کہ حضرت آپ کی مجلس میں ہم دونوں کی یہ حالت ہوتی ہے، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا کہ کچھ فکر کی بات نہیں، اس لیے کہ تم دونوں اپنی یہ حالت بیان کررہے ہو، حالانکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب میں بھی مجلس میں بیٹھتا ہوں، تو میری بھی یہی حالت ہوتی ہے کہ اس مجلس میں سب سے زیادہ نکما اور ناکارہ میں ہی ہوں، یہ سب مجھ سے افضل ہیں۔

یہ ہے تواضع کی حقیقت، ارے! جب تواضع کی یہ حقیقت غالب ہوتی ہے، تو پھر انسان تو انسان، آدمی اپنے آپ کو جانوروں بھی کمتر سمجھنے لگتا ہے۔

## حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تواضع:

ایک حدیث میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب کوئی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کے وقت مصافحہ کرتا، تو آپ اپنا ہاتھ اس وقت تک نہیں کھینچتے تھے، جب تک دوسرا شخص اپنا ہاتھ نہ کھینچ لے اور آپ اپنا چہرہ اسوقت تک نہیں پھیرتے تھے، جب تک ملاقات کرنے والا شخص خود اپنا چہرہ نہ پھیر لے، جب آپ مسلسل مجلس میں بیٹھتے

،تو اپنا گھٹنا بھی دوسروں کے آگے نہیں کرتے تھے، یعنی امتیازی شان سے نہیں بیٹھتے تھے۔(ترمذی۔کتاب القیامۃ)

بعض روایات میں آتا ہے کہ شروع شروع میں جس طرح اور لوگ مجلس میں آکر بیٹھ جاتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے ساتھ مل جل کر بیٹھ جاتے، نہ تو بیٹھنے میں کوئی امتیازی شان ہوتی تھی اور نہ ہی چلنے میں، لیکن بعد میں یہ ہوا کہ جب کوئی اجنبی شخص مجلس میں آتا،تو اس کو آپ کے پہنچاننے میں تکلیف ہوتی،اس کو پتہ نہ چلتا کہ ان میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کون سے ہیں اور بعض اوقات جب مجمع زیادہ ہوجاتا،تو پیچھے والوں کو آپ کی زیارت کرنی مشکل ہوجاتی اور سب لوگوں کی یہ خواہش ہوتی کہ ہم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کریں،اس وقت صحابہ کرام نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ اپنے لیے کوئی اونچی جگہ بنوالیں اور اس پر بیٹھ کر بات کرلیا کریں،تاکہ آنے والوں کو پتہ بھی چل جائے اور سب لوگ آپ کی زیارت بھی کرلیا کریں اور بات سننے میں بھی سہولت اور آسانی ہو،اسوقت آپ نے اجازت دیدی اور آپ کے کے لیے ایک چوکی بنادی گئی،جس پر آپ تشریف فرما کر باتیں کیا کرتے تھے۔

## حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چلنے میں تواضع:

اس سے معلوم ہوا کہ اصل یہ ہے کہ انسان اپنی کوئی امتیازی شان اور امتیازی مقام نہ بنائے، بلکہ عام آدمیوں کی طرح رہے، عام لوگوں کی طرح چلے، البتہ جہاں ضرورت ہو، وہاں اس ضرورت کے مطابق عمل کرنے کی گنجائش ہے، چنانچہ ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چلنے کی یہ صفت بیان فرمائی گئی کہ

مَارُئِیَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَاْکُلُ مُتَّکِئًا قَطُّ وَلاَ یطاعقبه رِجْلَانِ. (ابو دائود کتاب الاطعمة باب فی الاکل متکئا)

یعنی کبھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ٹیک لگا کر کھاتے ہوئے نہیں دیکھا اور نہ کبھی یہ دیکھا کہ آپ کے پیچھے پیچھے لوگ بھاگ رہے ہوں،لہذا یہ مناسب نہیں کہ انسان خود تو آگے آگے چلے اور اس کے معتقدین اس کے پیچھے پیچھے،اس کی ایڑیوں کے ساتھ ساتھ چلیں،اس لیے کہ اس وقت انسان کا نفس اور شیطان اس کو بہکاتا ہے کہ دیکھ تیرے اندر کوئی خوبی اور

بھلائی ہے، تب ہی تو اتنا مجمع تیرے پیچھے پیچھے چل رہا ہے، اسی لیے حتی الامکان اس سے پرہیز کرنا چاہیے کہ لوگ اس کے پیچھے چلیں، جب آدمی چلے، تو اکیلا چلے یا لوگوں کے ساتھ مل کر چلے، آگے آگے نہ چلے۔

## حضرت تھانوی کا اعلان

چنانچہ حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کے معمولات میں یہ بات لکھی ہے کہ آپ نے یہ عام اعلان کر رکھا تھا کہ کوئی شخص میرے پیچھے نہ چلے، میرے ساتھ نہ چلے، جب میں تنہا کہیں جارہا ہوں، تو مجھے تنہا جانے دیا کرو، حضرت فرماتے کہ یہ مقتدا کی شان بنانا کہ جب آدمی چلے، تو دو آدمی اس کے دائیں طرف اور دو آدمی اس کے بائیں طرف چلیں، میں اس کو بالکل پسند نہیں کرتا، جس طرح ایک عام انسان چلتا ہے، اسی طرح چلنا چاہیے، ایک مرتبہ آپ نے یہ اعلان فرمایا کہ اگر میں اپنے ہاتھ میں کوئی سامان اٹھا کر جارہا ہوں تو کوئی شخص آکر میرے ہاتھ سے سامان نہ لے، مجھے اسی طرح جانے دے، تاکہ آدمی کی اپنی کوئی امتیازی شان نہ ہو اور جس طرح ایک عام آدمی ہوتا ہے، اس طریقے سے رہے۔

## اپنے آپ کو جتنا مٹاؤ گے اتنا ہی مقبول ہو گے:

ہمارے ڈاکٹر عبدالحئی صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ یہاں تو معاملہ عبدیت اور فنائیت اور بندگی کا ہے، شکستگی اور عاجزی کا ہے، لہذا اپنے آپ کو جتنا مٹاؤ گے اور جتنا اپنی بندگی کا مظاہرہ کرو گے، اتنا ہی انشاءاللہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہوں گے اور یہ شعر پڑھا کرتے تھے کہ

فہم خاطر تیز کردن نیست راہ ☆ جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

یعنی اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا یہ راستہ نہیں ہے کہ اپنے آپ کو زیادہ عقل مند اور ہوشیار جتائے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل تو اسی شخص پر ہوتا ہے، جو اللہ تعالیٰ کے سامنے شکستگی اور بندگی کا مظاہرہ کرتا رہے، ارے کہاں کی شان اور کہاں کی بڑائی جتاتے ہو، شان اور بڑائی اور خوشی کا موقع تو وہ ہے، جب ہماری روح نکل رہی ہو، اسوقت اللہ تعالیٰ یہ فرمادیں کہ

﴿ يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِىْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً

﴿فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ فِیْ جَنَّتِیْ﴾ (سورۃ الفجر ۲۷)

دیکھئے اس آیت میں اس بندہ کی روح سے کہا جائے گا کہ میرے بندوں میں داخل ہوجاؤ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کا سب سے اعلیٰ مقام بندگی ہے۔

## فنائیت سے سب کچھ حاصل ہوتا ہے:

اس لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہر معاملے میں وہ طریقہ پسند فرماتے، جس میں عبدیت ہو، بندگی ہو، شکستگی کا اظہار ہو، چنانچہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ پوچھا گیا کہ اگر آپ چاہیں، تو آپ کے لیے یہ احد پہاڑ سونے کا بنا دیا جائے، تاکہ آپ کی معاش کی تکلیف دور ہوجائے؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں، بلکہ مجھے تو یہ پسند ہے کہ اجوع یوما واشبع یوما ایک دن کھاؤں اور ایک دن بھوکا رہوں، جس دن کھاؤں تو آپ کا شکر ادا کروں اور جس دن بھوکا رہوں اس دن صبر کروں اور آپ سے مانگ کر کھاؤں، ایک حدیث میں آتا ہے کہ

مَا خُيِّرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ اَمْرَيْنِ قَطُّ اِلَّا اَخَذَ اَيْسَرَهُمَا. (صحیح بخاری کتاب الاداب)

یعنی جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی معاملے میں دوراستوں کا اختیار دیا جاتا ہے، یا تو یہ راستہ اختیار کرلیں یا یہ راستہ اختیار کرلیں، تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ان میں سے آسان راستے کو اختیار فرماتے، اس لیے کہ مشکل راستہ اختیار کرنے میں اپنی بہادری کا دعوی ہے کہ میں بڑا بہادر ہوں، کہ یہ مشکل کام انجام دے لوں گا اور آسان راستہ اختیار کرنے میں عاجزی اور شکستگی اور بندگی کا اظہار ہے کہ میں تو بہت کمزور ہوں اور اس کمزوری کی وجہ سے آسان راستہ اختیار کرتا ہوں، لہذا جو کچھ کسی کو حاصل ہوا وہ بندگی اور فنائیت ہی میں حاصل ہوا ہے اور فنا ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کی مرضی اور ان کی حیثیت کے آگے اپنے وجود کو انسان فنا کردے اور جب فنا کردیا تو سمجھو کہ سب کچھ اس فنائیت میں حاصل ہوگیا۔

## پھوٹ نکلی تیرے پیراھن سے خوشبو تیری:

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب قدس اللہ سرہ کی زبان پر اللہ تعالیٰ بڑے عجیب و

غریب معارف جاری فرمایا کرتے تھے، ایک دن فرمانے لگے، جب پلاؤ پکایا جاتا ہے، تو شروع شروع میں ان چاولوں کے اندر جوش پیدا ہوتا ہے اور ان میں سے آواز آتی رہتی ہے اور وہ حرکت کرتے رہتے ہیں اور ان چاولوں کا جوش مارنا، حرکت کرنا اس بات کی علامت ہے کہ چاول ابھی کچے ہیں، پکے نہیں ہیں، وہ ابھی کھانے کے لائق نہیں اور نہ ہی ان میں ذائقہ ہے اور نہ خوشبو، لیکن جب چاول پکنے کے بالکل قریب ہو جاتے ہیں، اس وقت ان کا دم نکالا جاتا ہے اور دم نکالتے وقت نہ تو ان چاولوں میں جوش ہوتا ہے اور نہ حرکت اور آواز ہوتی ہے، اس وقت وہ چاول بالکل خاموش پڑے رہتے ہیں، لیکن جیسے ہی اس کا دم نکالا ان چاولوں میں سے خوشبو پھوٹ پڑی اور اب اس میں ذائقہ بھی پیدا ہو گیا اور کھانے کے قابل ہو گئے۔

صبا جو ملنا تو کہنا میرے یوسف سے ☆ پھوٹ نکلی تیرے پیراھن سے بو تیری

اسی طرح جب تک انسان کے اندر یہ دعوے ہوتے ہیں کہ میں ایسا ہوں، میں بڑا علامہ ہوں، میں بڑا متقی ہوں، بڑا نمازی ہوں، چاہے دعوے زبان پر ہوں، چاہے دل میں ہوں، اس وقت تک اس انسان میں نہ خوشبو ہے اور نہ اس کے اندر ذائقہ ہے، وہ تو کچا چاول ہے اور جس دن اس نے اللہ تعالیٰ کے آگے اپنے ان دعوؤں کو فنا کر کے یہ کہہ دیا کہ میری تو کوئی حقیقت نہیں، میں کچھ نہیں، اس دن اس کی خوشبو پھوٹ پڑتی ہے اور پھر اللہ تعالیٰ اس کا فیض پھیلاتے ہیں۔

ایسے موقع پر ہمارے ڈاکٹر صاحب رحمتہ اللہ علیہ کیا خوبصورت شعر پڑھا کرتے تھے:

میں عارفی آوارہ صحراء فنا ہوں ☆ ایک عالم بے نام ونشاں میرے لیے ہے

یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے فنائیت کے صحراء میں آوارگی عطا فرمائی ہے اور مجھے فنائیت کا درس عطا فرمایا، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمیں بھی عطا فرمادے۔ آمین

## حضرت سلیمان ندوی کی تواضع کی جھلک:

حضرت سید سلیمان ندوی رحمتہ اللہ علیہ جن کے فضل وعلم کا طوطی بول رہا ہے اور ڈنکا بج رہا ہے، وہ خود اپنا واقعہ سناتے ہیں کہ جب میں نے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم چھ جلدوں میں مکمل کر لی، تو بار بار دل میں یہ خلش ہوتی تھی کہ جس ذات گرامی کی یہ سیرت لکھی ہے، ان کی

سیرت کا کوئی عکس یا کوئی جھلک میری زندگی میں بھی آئی یا نہیں؟ اگر نہیں آئی، تو کس طرح آئے؟ اس مقصد کے لیے کسی اللہ والے کی تلاش ہوئی اور سن رکھا تھا کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب تھانہ بھون کی خانقاہ میں مقیم ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کا فیض پھیلایا ہے، چنانچہ ایک مرتبہ تھانہ بھون جانے کا ارادہ کرلیا، سفر کر کے بھون تھانہ پہنچ گئے اور حضرت والا سے اصلاحی تعلق قائم کیا اور کئی روز وہاں مقیم رہے، جب واپس رخصت ہونے لگے، تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ حضرت کوئی نصیحت فرما دیجئے، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس وقت مجھے خیال آیا کہ میں اتنے بڑے علامہ کو کیا نصیحت کروں؟ علم و فضل کے اعتبار سے پوری دنیا میں ان کی شہرت ہے، چنانچہ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی یا اللہ میرے دل میں ایسی بات ڈال دیجئے، جو ان کے حق میں بھی فائدہ مند ہو اور میرے حق میں بھی فائدہ مند ہو، اس کے بعد حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''بھائی ہمارے طریق میں تو اول و آخر تو اپنے آپ کو مٹا دینا ہے''۔

حضرت سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت تھانوی نے یہ الفاظ کہتے وقت میرا ہاتھ سینے کی طرف لے جا کر نیچے کی طرف ایسا جھٹکا دیا کہ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے دل پر جھٹکا لگ گیا۔

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد حضرت سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے آپ کو ایسا مٹایا کہ اس کی نظیر ملنی مشکل ہے، ایک دن دیکھا کہ خانقاہ کے باہر حضرت سلیمان ندویؒ مجلس میں آنے والوں کے جوتے سیدھے کر رہے ہیں، یہ تواضع اور فنائیت اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں پیدا کر دی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد خوشبو پھوٹی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

## انانیت اور ''میں میں'' کا بت دل سے نکال دو:

بہر حال جب تک انا (میں) کا بت دل میں موجود ہے، اس وقت یہ چاول کچا ہے، ابھی جوش مار رہا ہے اور اس وقت یہ خوشبودار بنے گا، جب اس انا کو مٹا دیا جائے گا، فنائیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ خاصیت رکھی ہے۔

## فنائیت کا مطلب:

فنائیت کا مطلب یہ ہے کہ اپنے طور طریقے اور انداز و ادا میں انسان تکبر سے پرہیز کرے اور عاجزی کو اختیار کرے اور جس دن عاجزی کو اختیار کرے گا انشاء اللہ اس دن راستہ کھل جائے گا، کیونکہ حق تک پہنچنے میں سب سے بڑی رکاوٹ تکبر ہوتی ہے اور تکبر والا اپنے آپ کو کتنا ہی بڑا سمجھتا رہے اور دنیا والوں کو کتنا ہی ذلیل سمجھتا رہے، لیکن انجام کار اللہ تعالیٰ تواضع والے کو ہی عزت عطا فرماتے ہیں اور تکبر والے کو ذلیل کرتے ہیں۔

## متکبر کی عجیب و غریب مثال:

عربی زبان میں کسی نے بڑی حکیمانہ بات کہی ہے، کہ متکبر کی مثال اس شخص جیسی ہے، جو پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہو، اب وہ پہاڑ کے اوپر سے نیچے چلنے پھرنے والوں کو چھوٹا سمجھتا ہے، اس لیے کہ اوپر سے اس کو وہ لوگ چھوٹے نظر آرہے ہیں اور لوگ نیچے سے اس کو پہاڑ پر دیکھنے والے ہیں وہ اس کو چھوٹا سمجھتے ہیں، بالکل اسی طرح ساری دنیا متکبر کو حقیر سمجھتی ہے اور وہ دنیا والوں کو حقیر سمجھتا ہے، لیکن جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے آگے اپنے آپ کو فنا کر دیا، اللہ تعالیٰ اس کو عزت عطا فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے یہ چیز ہمارے اندر بھی پیدا فرمادے۔



## حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحبؒ کی تواضع کی جھلک:

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے کہ میں اپنے گھر میں کبھی کبھی ننگے پیر بھی چلتا ہوں، اس لیے کہ کسی روایت میں پڑھ لیا تھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کسی موقع پر ننگے پاؤں بھی چلا کرتے تھے، میں بھی اس لیے چل رہا ہوں، تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت پر بھی عمل ہو جائے اور فرمایا کرتے تھے کہ میں ننگے پاؤں چلتے وقت اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتا ہوں کہ دیکھ تیری اصل حقیقت تو یہ ہے کہ نہ پاؤں میں جوتا، نہ سر پر ٹوپی اور نہ جسم پر لباس اور تو انجام کار مٹی میں مل جانے والا ہے۔

## حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کی تواضع کی جھلک:

حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ رابسن روڈ کے

مطب میں بیٹھا ہوا تھا، اس وقت حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ مطب کے سامنے سے اس حالت میں گزرے کہ ان کے دائیں طرف کوئی آدمی تھا، نہ بائیں طرف، بس اکیلے جارہے تھے اور ہاتھ میں کوئی برتن اٹھایا ہوا تھا، حضرت ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ اس وقت کچھ لوگ میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے، میں نے ان سے پوچھا یہ صاحب جو جارہے ہیں آپ ان کو جانتے ہیں کہ یہ کون صاحب ہیں؟ پھر خود ہی جواب دیا کہ کیا تم یہ باور کر سکتے ہو پاکستان کا مفتی اعظم ہے، جو ہاتھ میں پتیلی لیے جارہا ہے اور ان کے لباس و پوشاک سے، انداز و ادا سے، چال ڈھال سے کوئی بھی پتہ نہیں لگا سکتا کہ یہ اتنے بڑے علامہ ہیں۔

## حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کی تواضع کی جھلک:

حضرت مفتی عزیز الرحمٰن رحمتہ اللہ علیہ جو میرے والد ماجد کے استاد اور دارالعلوم دیوبند کے مفتی اعظم تھے، ان کا واقعہ میں نے اپنے والد ماجد رحمتہ اللہ علیہ سے سنا کہ آپ کے گھر کے آس پاس کچھ بیواؤں کے مکانات تھے، آپ کا روز کا معمول تھا کہ جب آپ اپنے گھر سے دارالعلوم دیوبند جانے کے لیے نکلتے، تو پہلے ان بیواؤں کے مکانات پر جاتے اور ان سے پوچھتے کہ بی بی بازار سے کچھ سودا سلف منگانا ہے، تو بتادو میں لادوں گا، اب وہ بیوہ ان سے کہتی کہ ہاں بھائی بازار سے اتنا دھنیا، اتنی پیاز، اتنے آلو وغیرہ لادو، اس طرح دوسری کے پاس پھر تیسری کے پاس جاکر معلوم کرتے اور پھر بازار جاکر سودا لاکر ان کو پہنچادیتے ،بعض اوقات یہ ہوتا کہ جب سودا لاکر دیتے ،تو کوئی بی بی کہتی مولوی صاحب آپ غلط سودا لے آئے ہیں، میں تو فلاں چیز کہی تھی ،آپ فلان چیز لے آئے، میں نے اتنی منگائی تھی ،آپ اتنی لے آئے ،آپ فرماتے بی بی کوئی بات نہیں میں دوبارہ بازار سے لادیتا ہوں، چنانچہ دوبارہ بازار جاکر سودا لاکر ان کو دیتے ،ان کے بعد فتاوی لکھنے کے لیے دارالعلوم دیوبند تشریف لے جاتے ،میرے والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ یہ شخص جو بیواؤں کا سودا سلف لینے کے لیے بازار میں پھر رہا ہے، یہ مفتی اعظم ہند ہے، کوئی شخص دیکھ کر یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ علم وفضل کا پہاڑ ہے، لیکن اس تواضع کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج ان کے فتاوی پر مشتمل بارہ جلدیں چھپ چکی ہیں اور ابھی تک اس پر کام جاری ہے اور ساری دنیا ان سے فیض اٹھا رہی ہے، وہی بات ہے کہ

پھوٹ نکلی تیرے پیراہن سے بو تیری

وہ خوشبو اللہ تعالی نے عطا فرمادی، آپ کا انتقال بھی اس حالت میں ہوا کہ آپ کے ہاتھ میں ایک فتوی تھا اور فتوی لکھتے لکھتے آپ کی روح قبض ہوگئی۔

## مولانا قاسم صاحب نانوتوی کی تواضع کی جھلک:

حضرت مولانا قاسم صاحب ناتوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم دیوبند کے بانی ہیں، ان کے بارے میں لکھا ہے کہ ہر وقت ایک تہبند پہنے رہتے تھے اور معمولی سا کرتہ ہوتا تھا، کوئی شخص دیکھ کر یہ پہچان ہی نہیں سکتا تھا کہ یہ اتنا بڑا علامہ ہے، جب مناظرہ کرنے پر آجائیں، تو بڑوں بڑوں کے دانت کھٹے کردیں، لیکن سادگی اور تواضع کا یہ حال تھا کہ تہبند پہنے ہوئے مسجد میں جھاڑو دے رہے ہیں۔

چونکہ آپ نے انگریزوں کے خلاف جہاد کیا، تو انگریزوں کیطرف سے آپکی گرفتاری کا وارنٹ جاری ہوگیا، چنانچہ ایک آدمی ان کو گرفتار کرنے کیلئے آیا، کسی نے بتادیا کہ وہ چھتے کی مسجد میں رہتے ہیں، جب وہ شخص مسجد میں پہنچا، تو اس نے دیکھا کہ ایک آدمی بنیان اور لنگی پہنے ہوئے مسجد میں جھاڑو دے رہا ہے، اب چونکہ وارنٹ کے اندر لکھا کہ مولانا محمد قاسم ناتوتوی کو گرفتار کیا جائے، اس لیے جو شخص گرفتار کرنے آیا تھا، وہ یہ سمجھا کہ یہ تو جبے قبے کے اندر ملبوس بڑے علامہ ہوں گے، جنہوں نے اتنی بڑی تحریک کی قیادت کی ہے، اس کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی کہ یہ صاحب جو مسجد میں جھاڑو دے رہے ہیں، یہ ہی مولانا قاسم صاحب ہیں، بلکہ قاسم صاحب کہاں؟ حضرت مولانا کو معلوم ہو چکا تھا کہ میرے خلاف ورنٹ نکلا ہوا ہے، اس لیے چھپانا بھی ضروری ہے اور جھوٹ بھی نہیں بولنا ہے، اس لیے آپ جس جگہ کھڑے تھے، وہاں سے ایک قدم پیچھے ہٹ گئے اور پھر جواب دیا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو یہاں تھے، چنانچہ وہ شخص یہی سمجھا کہ تھوڑی دیر پہلے تو مسجد میں تھے، لیکن اب موجود نہیں ہیں، چنانچہ وہ شخص تلاش کرتا ہوا واپس چلا گیا۔

اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر دو حرف علم کی تہمت محمد قاسم کے نام پر نہ ہوتی، تو دنیا کو پتہ بھی نہ چلتا کہ قاسم کہاں پیدا ہوا تھا؟ اور کہاں مرگیا؟ اس طرح فنائیت کے ساتھ زندگی گزاردی۔

## حضرت شیخ الہند کی تواضع کی جھلک:

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا محمد مغیث صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے یہ واقعہ سنا کہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جنہوں نے انگریزوں کے خلاف ہندوستان کی آزادی کے لیے ایسی تحریک چلائی کہ جس نے پورے ہندوستان، افغانستان اور ترکی سب کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ آپ کی شہرت پورے ہندوستان میں تھی، چنانچہ اجمیر میں ایک عالم تھے، مولانا معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ، ان کو خیال آیا کہ دیو بند جا کر حضرت شیخ الہند سے ملاقات اور ان کی زیارت کرنی چاہیے، چنانچہ ریل گاڑی کے ذریعہ دیو بند پہنچے اور وہاں ایک تانگے والے سے کہا کہ مجھے مولانا شیخ الہند سے ملاقات کے لیے جانا ہے، اب ساری دنیا میں تو وہ شیخ الہند کے نام سے مشہور تھے، تانگے والے نے پوچھا کہ کیا بڑے مولوی صاحب کے پاس جانا چاہتے ہو؟ انہوں نے کہا، ہاں، بڑے مولوی صاحب کے پاس جانا چاہتا ہوں، چنانچہ تانگے والے نے حضرت شیخ الہند کے گھر کے دروازے پر اتار دیا، گرمی کا زمانہ تھا، جب انہوں نے دروازے پر دستک دی، تو ایک آدمی بنیان اور لنگی پہنے ہوئے نکلا، انہوں نے اس سے کہا کہ میں حضرت مولانا محمود الحسن سے ملنے کے لیے اجمیر سے آیا ہوں، میرا نام معین الدین ہے، انہوں نے کہا کہ حضرت تشریف لائیں، اندر بیٹھیں، چنانچہ جب بیٹھ گئے، تو پھر انہوں نے کہا کہ آپ حضرت مولانا کو اطلاع کر دیں کہ معین الدین اجمیری آپ سے ملنے آیا ہے، انہوں نے کہا کہ حضرت آپ گرمی میں آئیں ہیں، تشریف رکھیں، پھر پنکھا جھولنا شروع کر دیا، جب کچھ دیر گزر گئی، تو مولانا اجمیری صاحب نے پھر کہا کہ میں نے تم سے کہا کہ جا کر مولانا کو اطلاع دو کہ اجمیر سے کوئی ملنے کے لیے آیا ہے، انہوں نے کہا، اچھا ابھی اطلاع کرتا ہوں، پھر اندر تشریف لے گئے اور کھانا لے کر آئے، مولانا نے پھر کہا کہ بھائی میں یہاں کھانا کھانے نہیں آیا، میں تو مولانا محمود الحسن صاحب سے ملنے آیا ہوں، مجھے ان سے ملاؤ، انہوں نے فرمایا حضرت آپ کھانا تناول فرمائیں، ابھی ان سے ملاقات ہو جاتی ہے، چنانچہ کھانا کھایا، پانی پلایا، یہاں تک کہ مولانا معین الدین صاحب ناراض ہونے لگے کہ میں تم سے بار بار کہہ رہا ہوں، مگر تم جا کر ان کو اطلاع نہیں کرتے، پھر فرمایا کہ حضرت بات یہ

ہے کہ یہاں شیخ الہند تو کوئی نہیں رہتا، البتہ بندہ محمود اسی عاجز کا نام ہے، تب جا کر مولانا معین الدین صاحب کو پتہ چلا کہ شیخ الہند کہلانے والے محمود الحسن صاحب یہ ہیں، جن سے میں اب تک ناراض ہو کر گفتگو کرتا رہا، یہ تھا ہمارے بزرگوں کا البیلا رنگ، اللہ تعالی اس کا کچھ رنگ ہمیں بھی عطا فرمائے۔ آمین

## حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کی تواضع کی جھلک:

حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ کسی جگہ سے واپس کاندھلہ تشریف لا رہے تھے، جب ریل گاڑی سے کاندھلے کے اسٹیشن پر اترے، تو وہاں ایک بوڑھا آدمی سر پر سامان کا بوجھ اٹھائے جا رہا ہے اور بوجھ کی وجہ سے اس سے چلا نہیں جا رہا ہے، آپ کو خیال آیا کہ یہ شخص بے چارہ تکلیف میں ہے۔

چنانچہ آپ نے اس بوڑھے سے کہا کہ اگر آپ اجازت دیں، تو آپ کا تھوڑا سا بوجھ اٹھا لوں، اس بوڑھے نے کہا آپ کا بہت شکریہ، اگر آپ تھوڑا سا اٹھا لیں، چنانچہ مولانا صاحب اس کا سامان سر پر اٹھا کر شہر کی طرف روانہ ہو گئے، اب چلتے چلتے راستے میں باتیں شروع ہو گئیں، حضرت مولانا نے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہیں؟ اس نے کہا کہ میں کاندھلے جا رہا ہوں، مولانا نے پوچھا، کیوں جا رہے ہیں؟ اس نے کہا کہ سنا ہے کہ وہاں ایک بڑے مولوی صاحب رہتے ہیں، ان سے ملنے جا رہا ہوں، مولانا نے پوچھا کہ وہ بڑے مولوی صاحب کون ہیں؟ اس نے کہا مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی، میں نے سنا ہے کہ وہ بہت بڑے مولانا ہیں، بڑے عالم ہیں؟ مولانا نے فرمایا کہ ہاں وہ عربی تو پڑھ لیتے ہیں، یہاں تک کہ کاندھلہ قریب آ گیا۔

کاندھلہ میں سب لوگ مولانا کو جانتے تھے، جب لوگوں نے دیکھا کہ مولانا مظفر حسین صاحب سامان اٹھائے جا رہے ہیں، تو لوگ ان سے سامان لینے کے لیے اور تعظیم و تکریم کے لیے ان کی طرف دوڑے، اب ان بڑے میاں کی جان نکلنے لگی اور پریشان ہو گئے کہ میں نے اتنا بڑا بوجھ حضرت مولانا پر لاد دیا، چنانچہ مولانا نے ان سے کہا کہ بھائی اس میں پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں، میں نے دیکھا کہ تم تکلیف میں ہو، اللہ تعالی نے مجھے اس خدمت کی توفیق دے دی۔ اللہ تعالی کا شکر ہے۔

## شیخ الہندؒ کی تواضع کی ایک اور جھلک:

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں رمضان المبارک میں یہ معمول تھا کہ آپ کے یہاں عشاء کے بعد تراویح شروع ہوتی، تو فجر تک ساری رات تراویح ہوتی تھی، ہر تیسرے یا چوتھے روز قرآن شریف ختم ہوتا تھا، ایک حافظ صاحب تراویح پڑھایا کرتے تھے اور حضرت والا پیچھے کھڑے ہوکر سنتے تھے، خود حافظ نہیں تھے، تراویح سے فارغ ہونے کے بعد حافظ صاحب وہیں حضرت والا کے قریب تھوڑی دیر کے لئے سوجاتے تھے، حافظ صاحب فرماتے ہیں کہ ایک دن جب میری آنکھ کھلی، تو میں نے دیکھا کہ کوئی آدمی میرے پاؤں دبار ہا ہے، میں سمجھا کہ کوئی شاگرد یا کوئی طالب علم ہوگا، چنانچہ میں نے دیکھا نہیں کہ کون دبار ہا ہے؟ کافی دیر گزرنے کے بعد میں نے جو مڑکر دیکھا، تو حضرت شیخ الہند محمود الحسن صاحب میرے پاؤں دبا رہے تھے، میں ایک دم سے اٹھ گیا اور کہا کہ حضرت یہ آپ نے کیا غضب کردیا، حضرت نے فرمایا کہ غضب کیا کرتا، تم ساری رات تراویح میں کھڑے رہتے ہو، میں نے سوچا کہ دبانے سے تمہارے پیروں کو آرام ملے گا، اس لیے دبانے کے لیے آگیا۔

## مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کی تواضع کی جھلک:

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ جو دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس تھے، بڑے اونچے درجے کے عالم تھے، ان کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک وعظ فرمایا کہ ان کا طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی ان کے سامنے ان کی تعریف کرتا، تو بالکل خاموش رہتے تھے، کچھ بولتے نہیں تھے، جیسے آج کل بناوٹی تواضع اختیار کرتے ہیں، کہ اگر کوئی ہمارے سامنے ہماری تعریف کرتا، تو جواب میں کہتے ہیں کہ یہ آپ کا حسن ظن ہے، ورنہ ہم اس قابل نہیں ہیں، وغیرہ، حالانکہ دل میں بہت خوش ہوتے، کہ یہ شخص ہماری اور تعریف کرے اور ساتھ ساتھ دل میں بھی اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہیں، لیکن ساتھ میں یہ الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں، یہ حقیقت میں بناوٹی تواضع ہوتی ہے، حقیقی تواضع نہیں ہوتی، لیکن حضرت مولانا یعقوب صاحب خاموش رہتے، اب دیکھنے والا یہ سمجھتا کہ حضرت مولانا اپنی

تعریف پر خوش ہوتے ہیں، اپنی تعریف کرانا چاہتے ہیں، اس لیے تعریف کرنے سے نہ تو روکتے ہیں، نہ ٹوکتے ہیں اور نہ ہی اس کی تردید کرتے ہیں، حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اب دیکھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ ان کے اندر تواضع نہیں ہے، حالانکہ ان باتوں کا نام تواضع نہیں، بلکہ تواضع تو دل کے اندر ہوتی ہے اوراس کی علامت یہ ہوتی ہے کہ آدمی کبھی کسی کام کواپنے سے فروتر نہیں سمجھتا۔

چنانچہ انہیں کا ایک واقعہ ہے کہ ایک صاحب نے آپ کو کھانے کی دعوت دی، آپ نے قبول فرمالی، اس شخص کا گاؤں فاصلے پر تھا، دل میں یہ خیال بھی نہیں آیا کہ ان صاحب نے سواری کا کوئی انتظام نہیں کیا، سواری کا انتظام کرنا چاہیے تھا، بہر حال اس کے گھر پہنچے، کھانا کھایا، کچھ آم بھی کھائے، اس کے بعد جب واپس چلنے لگے، تو اس وقت بھی اس نے سواری کا کوئی انتظام نہیں کیا، بلکہ الٹا یہ غضب کیا کہ بہت سارے آموں کی گٹھڑی بنا کر حضرت کے حوالے کردی کہ حضرت یہ کچھ آم گھر کے لیے لیتے جائیں، اس اللہ کے بندے نے یہ نہ سوچا کہ اتنی دور جانا ہے اور سواری کا کوئی انتظام بھی نہیں ہے، کیسے اتنی بڑی گٹھڑی لے کر جائیں گے؟ مگر اس نے وہ گٹھڑی مولانا کو دے دی اور مولانا نے قبول فرمالی اور اٹھا کر چل دیئے، اب ساری عمر مولانا نے کبھی اتنا بوجھ اٹھایا نہیں، شہزادوں جیسی زندگی گزاری، اب اس گٹھڑی کو کبھی ایک ہاتھ میں اٹھاتے، کبھی دوسرے ہاتھ میں اٹھاتے چلے جارہے ہیں، یہاں تک کہ جب دیوبند قریب آنے لگا، تو اب دونوں ہاتھ تھک کر چور ہوگئے، نہ اس ہاتھ میں چین، نہ اس ہاتھ میں چین، آخر کار اس گٹھڑی کو اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لیا، جب سر پر رکھا، تو ہاتھوں کو آرام ملا، تو فرمانے لگے کہ ہم بھی عجیب آدمی ہیں، پہلے خیال نہ آیا کہ اس گٹھڑی کو سر پر رکھ دیں، ورنہ اتنی تکلیف اٹھانی نہ پڑتی، اب مولانا اس حالت میں دیوبند میں داخل ہورہے ہیں کہ سر پر آموں کی گٹھڑی ہے، اب راستے میں جو لوگ ملتے، وہ آپ کو سلام کررہے ہیں، آپ سے مصافحہ کررہے ہیں، اور آپ نے ایک ہاتھ سے گٹھڑی سنبھالی ہوئی ہے اور ایک ہاتھ سے مصافحہ کررہے ہیں، اسی حالت میں آپ اپنے گھر پہنچ گئے اور آپ کو ذرہ برابر بھی یہ خیال نہیں آیا کہ یہ کام میرے مرتبے کے خلاف ہے اور میرے مرتبے سے فروتر ہے، بہر حال انسان کسی بھی کام کو اپنے مرتبے سے فروتر نہ سمجھے، یہ ہے تواضع کی علامت۔

## سید احمد کبیر کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مصافحہ کا واقعہ:

حضرت سید احمد کبیر رفاعی رحمتہ اللہ علیہ کا نام آپ نے سنا ہوگا بڑے اونچے درجے کے اولیاء اللہ گزرے ہیں۔ جن کے ساتھ ایسا واقعہ پیش آیا کہ دنیا میں کسی اور کے ساتھ ایسا واقعہ پیش نہیں آیا۔ وہ کہ ساری عمران کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اقدس پر حاضری کی تمنا اور آرزو رہتی تھی بہت آرزوؤں اور تمناؤں کے بعد اللہ تعالیٰ نے حج کی سعادت عطا فرمائی۔ حج کے لیے تشریف لے گئے حج سے فراغت کے بعد مدینہ منورہ تشریف لے گئے جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اقدس پر حاضری ہوئی تو اس وقت بے ساختہ عربی کے یہ دو اشعار پڑھے۔

فِی حَالَةِ الْبُعْدِ رُوْحِیْ کُنْتُ اُرْسِلُهَا ☆ تَقَبَّلَ الْاَرْضَ عَنِّیْ وَهِیَ نَائِبَتِیْ
وَهٰذِهٖ دَوْلَةُ الْاَشْبَاحِ قَدْ حَضَرْتُ ☆ فَامْدُدْ یَمِیْنَکَ کَیْ تَحْظٰی بِهَا شَفَتِیْ

یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب میں آپ سے دور تھا تو دوری کی حالت میں روضہ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی روح کو بھیجا کرتا تھا وہ آکر میری نائب اور قائم مقام بن کر زمین کا بوسہ لیا کرتی تھی آج جب اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے مجھے جسمانی طور پر حاضری نصیب ہوگئی ہے تو آپ اپنا دست مبارک بڑھائیں تاکہ میرے ہونٹ اس سے سیراب اور فیض یاب ہوسکیں۔ یعنی میں ان کا بوسہ لوں بس شعر کا پڑھنا تھا کہ فوراً روضہ اقدس سے دست مبارک برآمد ہوا اور جتنے لوگ وہاں حاضر تھے سب نے دست مبارک کی زیارت کی اور حضرت سید احمد کبیر رفاعی رحمتہ اللہ علیہ نے دست مبارک کا بوسہ لیا اور اس کے بعد وہ واپس چلا گیا۔ اب حقیقت کیا تھی؟ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے مگر تاریخ میں یہ واقعہ لکھا ہوا ہے۔

اس واقعہ کے پیش آنے کے بعد سید احمد کبیر رفاعی رحمتہ اللہ علیہ کے دل میں خیال آیا کہ آج اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنا بڑا اعزاز عطا فرمایا اور اتنا بڑا کرم فرمایا کہ جو آج تک کسی کو نصیب نہیں ہوا، کہیں اس کے نتیجے میں میرے دل کے اندر تکبر اور عجب اور بڑائی کا شائبہ پیدا نہ ہوجائے، چنانچہ آپ مسجد نبوی کے دروازے پر لیٹ گئے اور حاضرین سے فرمایا کہ میں سب کو قسم دے کر کہتا ہوں کہ آپ لوگ میرے اوپر سے پھلانگ کر باہر نکلیں ، تاکہ بڑائی کا یہ شائبہ بھی دل سے نکل جائے، اس طرح آپ نے تکبر اور عجب کا علاج کیا،

یہ واقعہ تو درمیان میں بطور تعارف کے عرض کر دیا ورنہ اصل واقعہ یہ بیان کرنا تھا کہ:

## سید احمد کبیر کی تواضع کی جھلک:

ایک مرتبہ سید احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ بازار تشریف لے جارہے تھے، سڑک پر ایک خارشی کتا دیکھا، خارش اور بیماری کی وجہ سے اس سے چلا بھی نہیں جارہا تھا، جو اللہ کے نیک بندے ہوتے ہیں، ان کو اللہ کی مخلوق سے بے پناہ شفقت اور محبت ہوتی ہے اور یہ محبت اور شفقت اس بات کی علامتی ہوتی ہے، کہ ان کو اللہ تعالی سے خصوصی تعلق ہے، اسی کو مولانا رومی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

زتسبیح وسجادہ ودلق نیست ☆ طریقت بجز خدمت خلق نیست

یعنی تسبیح ،مصلی اور گدڑی کا نام طریقت نہیں، بلکہ خدمت خلق کا نام طریقت ہے، میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی بندہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو بھی اس سے محبت ہو جاتی ہے، تو اللہ تعالی اس کے دل میں مخلوق کی محبت ڈال دیتے ہیں، جس کے نتیجے میں اللہ والوں کو انسانوں بلکہ جانوروں تک سے اتنی محبت ہو جاتی ہے کہ ہم اور آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

بہر حال جب سید احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتے کو اس حالت میں دیکھا، تو آپ کو اس پر ترس اور رحم آیا اور اس کتے کو اٹھا کر گھر لائے اور پھر ڈاکٹر کو بلا کر اس کا علاج کرایا، اس کی دوا کی اور روزانہ اس کی مرہم پٹی کرتے رہے، کئی مہینوں تک اس کا علاج کرتے رہے ، یہاں تک کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس کو تندرست کر دیا، تو آپ نے اپنے کسی ساتھی سے کہا کہ اگر کوئی شخص روزانہ اس کو کھلانے پلانے کا ذمہ لے، تو اس کو لے جائے، ورنہ پھر میں ہی اس کو رکھتا ہوں اور اسکو کھلاؤں گا، اس طرح آپ نے اس کتے کی پرورش کی۔

## سید احمد کبیر کا ایک کتے سے مکالمہ اور حصول علم:

اس واقعہ کے بعد ایک روز سید احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ کہیں تشریف لے جارہے تھے، بارش کا موسم تھا، کھیتوں کے درمیان جو پگڈنڈی ہوتی ہے، اس پر سے گزر رہے تھے، دونوں طرف پانی کھڑا تھا، کیچڑ تھی، چلتے چلتے سامنے سے اس پگڈنڈی پر ایک کتا آ گیا، اب یہ بھی

رک گئے اور کتا بھی ان کو دیکھ کر رک گیا، وہ پگڈنڈی اتنی چھوٹی تھی کہ ایک وقت میں ایک ہی آدمی گزر سکتا تھا، دو آدمی نہیں گزر سکتے تھے، اب یا تو کتا نیچے کیچڑ میں اتر جائے اور یہ اوپر سے گزر جائیں یا پھر یہ کیچڑ میں اتر جائیں اور کتا اوپر سے گزر جائے، دل میں کشمکش پیدا ہوئی کہ کیا کیا جائے؟ کون نیچے اترے؟ میں اتروں یا کتا اترے؟

اس وقت سید احمد کبیر رفاعی رحمتہ اللہ علیہ کا اس کتے کے ساتھ مکالمہ ہوا، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ مکالمہ کس طرح ہوا؟ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بطور کرامت کے اس کتے کو کچھ دیر کے لیے زبان دے دی ہو اور واقعی مکالمہ ہوا ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انہوں نے اپنے دل میں یہ مکالمہ کیا ہو، بہر حال اس مکالمہ میں حضرت سید احمد کبیر رحمتہ اللہ علیہ نے کتے سے کہا کہ تم نیچے اتر جاؤ، تا کہ میں اوپر سے گزر جاؤں۔

کتے نے جواب دیا کہ میں نیچے کیوں اتروں؟ تم بڑے درویش اور اللہ کے ولی بنے پھرتے ہو اور اللہ کے ولیوں کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ وہ ایثار کا پیکر ہوتے ہیں، دوسروں کے لئے قربانیاں دیتے ہیں، تم کیسے اللہ کے ولی ہو، کہ مجھے اترنے کا حکم دے رہے ہو، خود کیوں نہیں اتر جاتے؟

حضرت شیخ نے جواب میں فرمایا کہ بات دراصل یہ ہے کہ میرے اور تیرے اندر فرق ہے، وہ یہ کہ میں مکلّف ہوں، تو غیر مکلف ہے، مجھے نماز پڑھنی ہے، تجھے نماز نہیں پڑھنی ہے، اگر نیچے اترنے کی وجہ سے تیرا جسم گندہ اور ناپاک ہوگیا، تو تجھے غسل اور طہارت کی ضرورت نہیں ہوگی، اگر میں اتر گیا، تو میرے کپڑے ناپاک ہو جائیں گے اور میری نماز میں خلل واقع ہوگا، اس لیے میں تجھ سے کہہ رہا ہوں کہ تو نیچے اتر جا۔

کتنے نے جواب میں کہا واہ! آپ نے بھی عجیب بات کہی کہ کپڑے گندے ہو جائیں گے، ارے اگر آپ کے کپڑے گندے ہو جائیں گے، تو ان کا علاج یہ ہے کہ ان کو اتار کر دھو لینا اور کپڑے پاک ہو جائیں گے، لیکن اگر میں نیچے اتر گیا تو تمہارا دل گندہ ہو جائے گا اور تمہارے دل میں یہ خیال آئے جائے گا کہ میں اس کتے سے افضل ہوں، میں انسان ہوں اور یہ کتا ہے اور اس خیال کی وجہ سے تمہارا دل ایسا گندہ ہو جائے گا کہ اس کی پاکی کا کوئی راستہ نہیں، اس لیے بہتر یہ ہے کہ دل کی گندگی کے بجائے کپڑوں کی گندگی کو گوارا کر لو اور نیچے اتر جاؤ۔

بس کتے کا یہ جواب سن کر حضرت شیخ نے ہتھیار ڈال دیئے اور کہا کہ تم نے صحیح کہا کہ کپڑوں کو دوبارہ دھوسکتا ہوں، لیکن دل نہیں دھوسکتا، یہ کہہ کر کیچڑ میں اتر گئے اور کتے کو راستہ دے دیا۔

جب یہ مکالمہ ختم ہوگیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت سید احمد کبیر رفاعی رحمتہ اللہ علیہ کو الہام ہوا اور اس میں اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا کہ اے احمد کبیر! آج ہم نے تم کو ایک ایسے علم کی دولت سے نوازا کہ سارے علوم ایک طرف اور یہ علم ایک طرف اور یہ درحقیقت تمہارے اس عمل کا انعام ہے کہ تم نے چند روز پہلے ایک کتے پر ترس کھا کر اس کا علاج اور دیکھ بھال کی تھی، اس عمل کی بدولت ہم نے تمہیں ایک کتے کے ذریعہ ایسا علم عطا کیا، جس پر ساری علوم قربان ہیں، وہ علم یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو کتے سے بھی افضل نہ سمجھے اور کتے کو اپنے مقابلے میں حقیر خیال نہ کرے۔

بہرحال حضرت سید احمد کبیر رفاعیؒ کو اس الہامی علم کے ذریعہ یہ بتایا گیا کہ وہ سارے علوم ایک طرف اور یہ ایک علم کہ میں بے حقیقت چیز ہوں اور میری اپنی ذات کے اندر کوئی حقیقت نہیں ہے، یہی سارے علوم کی جان ہے، جو آج ہم نے تمہیں عطا کردی، اسی کا نام تواضع ہے، سارے بڑے بڑے اولیاء اللہ اس بات کی فکر میں لگے رہتے تھے کہ کہیں اپنے اندر تکبر کا کوئی شائبہ پیدا نہ ہوجائے۔

## حضرت بایزید بسطامی کی مغفرت کا واقعہ:

حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ جو جلیل القدر بزرگ گزرے ہیں، ان کا واقعہ مشہور ہے کہ انتقال کے بعد کسی نے ان کو خواب میں دیکھا، تو ان سے پوچھا کہ حضرت اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیسا معاملہ فرمایا؟

جواب دیا کہ ہمارے ساتھ بڑا عجیب معاملہ ہوا، جب ہم یہاں پہنچے، تو اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ کیا عمل لے کر آئے ہو؟ میں نے سوچا کہ کیا جواب دوں اور اپنا کون سا عمل پیش کروں، اس لیے کہ کوئی بھی ایسا نہیں ہے، جس کو پیش کروں، لہٰذا میں نے جواب دیا، یا اللہ! کچھ بھی نہیں لایا، خالی ہاتھ آیا ہوں، آپ کے کرم کے سوا میرے پاس کچھ بھی نہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ویسے تو تم نے بڑے بڑے عمل کیے، لیکن تمہارا ایک عمل ہمیں پسند آیا، آج اسی عمل

کی بدولت ہم تمہاری مغفرت کر رہے ہیں، وہ عمل یہ ہے کہ ایک رات جب تم اٹھے تو دیکھا کہ ایک بلی کا بچہ سردی کی وجہ سے ٹھٹھر رہا ہے، کانپ رہا ہے، تم نے اس پر ترس کھا کر اس کو اپنے لحاف میں جگہ دے دی اور اس کی سردی دور کردی اور اس بلی کے بچے نے آرام کے ساتھ ساری رات گزاری، چونکہ تمہارا عمل اخلاص پر مبنی تھا اور ہماری رضا کے علاوہ کوئی غرض شامل حال نہیں تھی، بس تمہارا یہ عمل ہمیں اتنا پسند آیا، کہ اس عمل کی بدولت ہم نے تمہاری مغفرت کردی۔

حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دنیا میں جو بڑے علوم ومعارف حاصل کیے تھے، وہ سب دھرے کے دھرے رہ گئے، ہاں تو صرف ایک ہی عمل پسند آیا مخلوق کے حسن ساتھ اخلاق۔

## تواضع اور احساس کمتری میں فرق:

آج کل علم نفسیات کا بڑا زور ہے اور علم نفسیات میں سے ایک چیز آج کل لوگوں میں بہت مشہور ہے، وہ ہے ''احساس کمتری'' اس کو بہت برا سمجھا جاتا ہے، کہ احساس کمتری بہت بری چیز ہے، اگر کسی میں یہ پیدا ہو جائے، تو اس کا علاج کیا جاتا ہے، ایک صاحب نے سوال کیا کہ جب آپ لوگوں یہ کہتے ہیں کہ اپنے آپ مٹاؤ، تو اس کے ذریعے آپ لوگوں کے اندر احساس کمتری پیدا کرنا چاہتے ہیں، تو کیا یہ بات درست ہے کہ لوگ اپنے اندر احساس کمتری پیدا کریں؟

بات دراصل یہ ہے کہ ''تواضع'' اور ''احساس کمتری'' میں فرق ہے، پہلی بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے یہ علم نفسیات ایجاد کیا، انہیں دین کا علم، یا اللہ اور اسکے رسول کے بارے میں کوئی علم تھا ہی نہیں، انہوں نے ایک احساس کمتری کا لفظ اختیار کرلیا، حالانکہ اس میں بہت سی اچھی باتیں شامل ہو جاتی ہیں، ان کو احساس کمتری کہہ دیا جاتا ہے، لیکن حقیقت میں تواضع اور احساس کمتری میں فرق ہے۔

دونوں میں فرق یہ ہے کہ احساس کمتری میں اللہ تعالیٰ کی تخلیق پر شکوہ اور شکایت ہوتی ہے، یعنی احساس کمتری میں انسان کو یہ خیال ہوتا ہے کہ مجھے محروم اور پیچھے رکھا گیا ہے، میں مستحق تو زیادہ تھا، لیکن مجھے کم ملا، یا مثلاً یہ احساس کہ مجھے بدصورت پیدا کیا گیا، مجھے بیمار پیدا

کیا گیا، مجھے دولت کم دی گئی، میرا رتبہ کم رکھا گیا، اس قسم کے شکوے اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور پھر اس شکوے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی طبیعت میں جھجلاہٹ پیدا ہو جاتی ہے اور پھر اس احساس کمتری کے نتیجے میں انسان دوسروں سے حسد کرنے لگتا ہے اور اس کے اندر مایوسی پیدا ہو جاتی ہے کہ اب مجھ سے کچھ نہیں ہوسکتا بہر حال احساس کمتری کی بنیاد اللہ تعالی کی تقدیر کے شکوے پر ہوتی ہے۔

جہاں تک تواضع کا تعلق ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر شکوے سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ اللہ تعالیٰ کے انعامات پر شکر کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے، تواضع کرنے والا یہ سوچتا ہے کہ میں تو اس قابل نہیں تھا کہ مجھے یہ نعمت ملتی، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے یہ نعمت عطا فرمائی، یہ ان کا کرم اور ان کی عطا ہے، میں تو اس کا مستحق نہیں تھا۔

اس سے اندازہ لگائیں کہ احساس کمتری اور تواضع میں کتنا بڑا فرق ہے، اس لیے تواضع محبوب اور پسندیدہ عمل ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص تواضع اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو رفعت اور بلندی عطا فرماتے ہیں، تکبر کی خاصیت یہ ہے کہ متکبر بالآخر وہ ذلیل ہوتا ہے اور تواضع کی خاصیت یہ ہے کہ متواضع شخص کو بالآخر عزت حاصل ہوتی ہے، بشرطیکہ صرف رفعت اور بلندی حاصل کرنے کے لیے جھوٹی اور بناوٹی تواضع نہ ہو، بلکہ وہ حقیقی تواضع ہو۔

## تواضع کا دکھاوا:

بعض اوقات ہم لوگ زبان سے یہ الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ ہماری حقیقت کیا ہے؟ اور ہم ناچیز ہیں، ناکارہ ہیں، احقر ہیں، وغیرہ، بسا اوقات یہ تواضع نہیں ہوتی، بلکہ تواضع کا دکھاوا، تواضع کا دھوکہ ہوتا ہے، ہمارے حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ فرماتے تھے کہ اس بات کا اندازہ لگانا کہ وہ یہ الفاظ واقعی تواضع سے کہہ رہا ہے، یا دکھاوے سے کہہ رہا ہے، اس کا امتحان بہت آسان ہے، وہ اس طرح کہ جب کوئی شخص کہے، میں تو بڑا ناچیز ہوں، ناکارہ ہوں، خطا کار ہوں اور گناہ گار ہوں، آپ اس وقت اگر جواب میں یہ کہہ دیں کہ بے شک آپ نے بالکل صحیح فرمایا، آپ واقعی بڑے ناچیز ہیں، بڑے ناکارہ ہیں، بڑے خطا کار ہیں اور بڑے گناہ گار ہیں، پھر دیکھو کہ اس جواب کے بعد کیا ہوتا ہے، اگر اس نے سچے دل سے

یہ الفاظ کہے تھے، تب تو اس جواب کا خیر مقدم کرے گا، لیکن اگر اس جواب کی وجہ سے اس کے دل میں ملال پیدا ہو گیا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سچے دل سے یہ باتیں نہیں کہہ رہا تھا، بلکہ تواضع کے الفاظ اس لیے استعمال کر رہا تھا تا کہ جواب میں یہ کہا جائے کہ نہیں، حضرت آپ تو بڑے نیک ہیں، بڑے متقی ہیں، بڑے پرہیز گار ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ مصنوعی تواضع میں جو الفاظ کہے جاتے ہیں، وہ سے دل سے نہیں کہے جاتے، بلکہ دوسروں سے اپنی تعریف کرانے کے لیے کہے جاتے ہیں، لہذا یہ تواضع نہ ہوئی۔

## تواضع اس طرح ہو کہ ناشکری نہ بنے:

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کے اندر کچھ اچھے اوصاف ہوتے ہی ہیں، کسی کو اللہ تعالیٰ نے علم دیا ہے، کسی کو صحت دی ہے، کسی کو دولت دی ہے، کسی کو کوئی مرتبہ دیا ہے، کسی کو کوئی منصب دیا ہے، یہ ساری چیزیں موجود ہیں، تو انسان کیسے انکار کر دے اور کہے کہ یہ چیز ہمیں حاصل نہیں؟ اگر اس کا انکار کر دے گا تو ناشکری اور کفرانِ نعمت ہوگا، اس کے جواب میں بزرگوں نے فرمایا کہ تواضع کو اتنا نہ بڑھاؤ کہ ناشکری کی حد تک پہنچ جائے، تواضع بھی ہو لیکن ساتھ ہی اللہ تبارک وتعالیٰ کی ناشکری بھی نہ ہو۔

## یہ کونسی تواضع ہے......؟

حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے مواعظ میں ایک واقعہ بیان فرمایا ہے کہ میں ایک مرتبہ آلہ آباد سے کانپور کے لیے ریل میں سوار ہوا، چند جنٹلمین اس ہی ڈبہ میں سوار تھے اور ایک منصف صاحب بھی سوار تھے، یہ منصف صاحب پرانے اور سادی وضع کے آدمی تھے، ان جنٹلمینوں نے ان منصف صاحب کو بنانا شروع کیا، اگرچہ بے تکلفی کی ابتداء منصف صاحب کی طرف سے ہوئی، غرض ان جنٹلمنوں نے کھانے کا دستر خوان کھولا اور ان میں سے ایک نے منصف صاحب سے کہا کہ آیئے آپ بھی کچھ "گوموت" کھا لیجئے، دوسرے ساتھی بولے کہ کیا واہیات ہے؟ توبہ کرو، توبہ کرو، کھانے کو گوموت کہتے ہو؟ اس نے جواب میں کہا کہ اپنے کھانے کو کھانا کہنا بھی تکبر ہے، اس حیثیت سے کہ وہ اپنا کھانا ہے، گوموت ہی کہنا تواضع ہے۔

## تکبر اور ناشکری سے بچنا ہے:

ایک طرف تو ناشکری سے بھی بچنا ہے، دوسری طرف تکبر سے بھی بچنا ہے اور تواضع اختیار کرنی ہے، دونوں کام جمع کرے، مثلاً نماز پڑھی، روزہ رکھا اور اس عمل کو یہ سمجھنا کہ میں نے بڑا زبردست عمل کرلیا، تو یہ بڑا تکبر ہے اور اگر اپنے عمل کے بارے میں یہ کہا کہ یہ تو بے کار ہے، جیسا کہ آج کل بعض لوگ نماز کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ صاحب ہم نے ٹکریں مارلیں، تو یہ اس عمل پر اللہ تبارک تعالیٰ کی ناشکری اور ناقدری ہے۔

## شکر اور تواضع کیسے جمع ہوں؟

سوال یہ ہے کہ دونوں چیزوں کو کیسے جمع کیا جائے کہ ناشکری بھی نہ ہو، تکبر بھی نہ ہو؟ شکر بھی ادا ہو اور تواضع بھی ہو؟ حقیقت میں یہ کوئی مشکل کام نہیں، دونوں کاموں کو جمع کرنا بالکل آسان ہے، وہ اس طرح کہ انسان یہ خیال کرے کہ اپنی ذات میں تو میرے اندر اس عمل کی ذرہ برابر طاقت اور صلاحیت نہیں تھی، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے یہ عمل کرادیا، اس طرح دونوں چیزیں جمع ہوجاتی ہیں کہ ذات میں اپنے آپ کو بے حقیقت سمجھا تو اضع ہوگئی اور اللہ تبارک تعالیٰ کی عطا کا اقرار کیا، تو یہ شکر ہوگیا، اب دونوں باتیں جمع ہوگئیں، اس لیے جو بندہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر بجالاتا ہو، اس کے اندر کبھی تکبر نہیں آسکتا، کیونکہ شکر کے معنی یہ ہیں کہ میرے اندر اپنی ذات میں کوئی صلاحیت نہیں تھی، اللہ جل جلالہ نے اپنے فضل وکرم اور اپنی عطا سے مجھے یہ چیز عطا فرمائی ہے۔ دیکھئے! نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو جمع کرکے دکھادیا فرمایا:

اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ آدَمَ ، وَلَا فَخْرَ (ترمذی کتاب المناقب)

میں آدم کے بیٹوں کا سردار ہوں، اب اس سے ظاہر ہورہا ہے کہ اپنی بڑائی کا اظہار فرمارہے ہیں، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی فرمادیا کہ ''ولا فخر'' یعنی کہ میں اپنا سردار ہونا بڑائی کی وجہ سے نہیں کہہ رہا ہوں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے فضل وکرم سے بڑا بنادیا اور آدم کے بیٹوں کا سردار بنایا، یہ محض ان کی عطا ہے، میری ذات کی بڑائی کا اس میں کوئی دخل نہیں۔

## شکر اور تواضع کے اجتماع کی ایک حکیمانہ مثال:

اس بات کو حکیم الامت حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ نے ایک مثال کے ذریعہ سمجھایا فرمایا کہ اس کو ایک مثال سے سمجھو کہ پہلے زمانے میں غلام ہوا کرتے تھے اور اپنے مالک کے مملوک ہوتے تھے، مالک ان کو بازار میں باقاعدہ بیچ سکتا تھا، آقا ان کی ہر چیز کا مالک ہوتا تھا، مالک جو بھی حکم دے گا، غلام کو کرنا ہوگا، اگر وہ کہے کہ میں سفر میں جارہا ہوں، میری غیر موجودگی میں اب تم حکمرانی کرو، اب وہ حکمرانی کررہا ہے، گورنر بنا ہوا ہے، لیکن ہے غلام کا غلام، لہٰذا اس غلام کے دماغ میں یہ بات آہی نہیں سکتی کہ یہ جو اقتدار میرے پاس آیا ہے، یہ میری قوت بازو کا یا میری صلاحیت کا نتیجہ ہے، کچھ بھی نہیں، اس کو یہ خیال رہتا ہے کہ جب آقا آجائے گا، تو کہہ دے گا کہ ہٹو اب بیت الخلاء صاف کرو، تب وہ سارا تخت اور ساری حکمرانی دھری رہ جائے گی، معلوم ہوا کہ وہ غلام بے شک حاکم بن کر حکم چلا رہا ہے، لیکن ساتھ ساتھ اپنی حقیقت کا احساس بھی کررہا ہے کہ یہ حکمرانی میرے مالک کی عطا ہے، حقیقت میں تو میں غلام ہی ہوں۔

## بندہ کا درجہ غلام سے کم تر

یہ تو ایک غلام کا حال تھا، لیکن بندہ ہونے کا درجہ اس سے کہیں زیادہ نیچے ہے، لہٰذا جب اللہ تبارک وتعالیٰ کسی بندہ کو کوئی منصب عطا فرمادیں، تو بندہ کو سمجھنا چاہیے کہ منصب تو مجھے اللہ تعالیٰ نے عطا فرمادیا، اسی وجہ سے یہ کام انجام دے رہا ہوں، لیکن میں ان کا بندہ ہوں، میری حقیقت اس غلام سے بھی فروتر ہے، جس کو مالک نے تخت پر بٹھادیا، کتنے غلام گزرے ہیں، جنہوں نے بادشاہت کی ہے، لیکن رہے غلام کے غلام۔

## غلام بادشاہ کا حیرت انگیز واقعہ:

ایک عبرت ناک قصہ یاد آیا، ایک غلام نے اپنے آقا کے خلاف بغاوت کرکے آقا کو قتل کردیا اور باقاعدہ بادشاہ بن گیا، مدتوں تک بادشاہ بنا رہا، شہزادے بھی پیدا ہوگئے، لیکن حقیقت میں تو وہ بادشاہ کا غلام تھا، ایک مرتبہ اس غلام بادشاہ نے شیخ عزالدین بن عبدالسلام

رحمتہ اللہ علیہ کو اپنے دربار میں بلایا اور جو اولیاء اللہ میں سے تھے، یہ اپنی صدی کے مجدد تھے، اس غلام بادشاہ نے ان کو بلا کر کہا کہ میں آپ کو قاضی بنانا چاہتا ہوں، شیخ نے جواب میں کہا کہ بات یہ ہے کہ قاضی بنانے کا کام اس شخص کا ہے جو خلیفہ برحق ہو اور آپ خلیفہ برحق نہیں ہیں، اس لیے کہ آپ تو غلام ہیں، آپ اپنے آقا کو قتل کر کے از خود بادشاہ بن بیٹھے، اپنی ملکیت میں بہت ساری زمینیں آپ نے رکھی ہیں، حالانکہ آپ مالک بن نہیں سکتے، کیونکہ غلام کے اندر مالک بننے کی صلاحیت نہیں ہے، لہذا جب تک آپ اپنی اس حیثیت کی اصلاح نہیں کریں گے، میں اس وقت تک آپ کا کوئی منصب قبول نہیں کروں گا۔

اس زمانے میں بہرحال کچھ نہ کچھ خیر ہوا کرتی تھی، باوجودیکہ اپنے آقا کو قتل کرنے کا جرم کیا تھا، لیکن پھر بھی دل میں کچھ خدا کا خوف تھا اور اللہ والوں کے کہنے کے انداز سے بھی دل پر اثر ہوتا ہے، اس بادشاہ نے کہا بات تو آپ نے صحیح کہی، واقعی میں تو غلام ہوں، آپ مجھے کوئی ایسا راستہ بتا دیجئے جس کے ذریعے میں اس غلامی سے نکل جاؤں، شیخ نے کہا کہ اس کا راستہ یہی ہوسکتا ہے کہ تم اور تمہارے سارے شہزادوں کو بازار میں کھڑا کر کے فروخت کیا جائے اور جو قیمت وصول ہو، وہ تمہارے مرحوم آقا کے ورثاؤں میں تقسیم کردی جائے اور جو شخص تمہیں خریدے، وہ آزاد کر دے، پھر تمہیں آزادی مل جائے گی، اب اندازہ لگائیے بادشاہ کو یہ کہا جا رہا ہے کہ تم کو اور بیٹوں کو بازار میں کھڑا کر کے بیچا جائے گا، قیمت لگائی جائے گی، نیلام ہوگا، اس کے بعد پھر تمہاری بادشاہت درست ہوگی، لیکن چونکہ دل میں کچھ خوف خدا اور آخرت کی فکر تھی، وہ اس لیے وہ بادشاہ اس پر راضی ہوگیا۔

چنانچہ تاریخ کا یہ منفرد واقعہ ہے کہ اس بادشاہ کو اور شہزادوں کو بازار میں کھڑا کر کے نیلام کیا گیا، بولی لگائی گئی، چنانچہ ایک شخص نے ان کو خرید کر پھر معاوضہ لے کر ان کو آزاد کیا، تب جا کر بادشاہ کی بادشاہت درست ہوئی، ہماری تاریخ کے اندر ایسی ایسی مثالیں بھی موجود ہیں، جو دنیا میں کہیں اور نظر نہیں آئیں گی، بہرحال جس طرح ایک غلام تخت کے اوپر بیٹھا ہے، لیکن ساتھ ساتھ دل میں یہ سمجھ رہا ہے کہ میں غلام ہوں، اسی طرح جب تم کسی منصب پر فائز ہو جاؤ تو ساتھ ساتھ دل میں یہ سمجھو کہ تم اللہ کے بندے ہو، اگر یہ حقیقت ذہن نشین رہے گی، تو کبھی اس منصب پر بیٹھ کر دوسروں پر ظلم نہیں کرسکو گے۔

## عبادت میں تواضع پیدا کرو، عبادت کی تحقیر مت کرو:

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرما دی، اب نہ تو یہ کرو کہ اس نماز کو

دوسروں کے سامنے بیان کرتے پھرو کہ میں نے نماز پڑھی تھی اور نماز پڑھ کر میں تو بڑا بزرگ ہوگیا، جیسا کہ عربی کا محاورہ مشہور ہے کہ

صَلّٰی الْحَائِکُ رَکْعَتَیْنِ وَانْتَظَرَ الْوَحْیُ

ایک جولا ہے کو ایک مرتبہ دو رکعتیں نفل پڑھنے کا موقع مل گیا تھا، تو اس کے بعد وحی کے انتظار میں بیٹھ گیا تھا، اس نے یہ سمجھا کہ میں نے جو عمل کیا ہے، وہ اتنا اعلیٰ درجہ کا عمل ہے کہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھ پر وحی نازل ہونی چاہیے، لہذا نہ تو یہ کرو کہ اپنے عمل کو بہت بڑا سمجھ بیٹھو۔ اور اپنے لیے بڑے اعزاز تجویز کرنے لگو اور نہ اپنے عمل کو اتنا حقیر سمجھو جس سے ناشکری ہو جائے، جیسا کہ لوگ کہتے ہیں کہ میری نماز کیا؟ میں تو اٹھک بیٹھک کرتا ہوں۔

ایسے الفاظ مت کہو یہ نماز کی توہین ہے، بلکہ یوں کہو کہ میں تو اپنی ذات میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا، اللہ جل جلالہ کا کرم ہے کہ انہوں نے مجھے نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمائی۔



## جب عبادت کرو تو دو کام کر لو:

اس لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب بھی کسی عبادت کی توفیق ہو جائے، تو دو کام کرو، ایک شکر ادا کرو کہ اللہ تبارک تعالیٰ نے مجھے اس عمل کی توفیق دے دی، ورنہ کتنے لوگ ہیں، جن کو توفیق نہیں ہوتی، اللہ تبارک تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس نے توفیق دی، دوسرے استغفار کرو کہ جو کچھ غلطیاں اور کوتاہیاں اس عمل میں ہوئی ہیں، اللہ تعالیٰ اس کو معاف کر دے، ان شاء اللہ ان دو عملوں کی برکت سے اللہ تعالیٰ اسی عبادت کو قبول فرمالیں گے۔

## کیفیات ہرگز مقصود نہیں:

ہمارے دلوں میں ہر وقت یہ اشکال رہتا ہے کہ اتنے دن سے نماز پڑھ رہے ہیں، تسبیح بھی پڑھ رہے ہیں، ذکر بھی کر رہے ہیں، معمولات بھی ہیں، نفلیں بھی پڑھی ہیں، تہجد اور اشراق بھی پڑھ رہے ہیں، لیکن دل کی حالت میں تبدیلی کیوں نظر نہیں آ رہی ہے؟ کوئی کیفیت کیوں پیدا نہیں ہو رہی ہے؟ خوب سمجھ لو کہ یہ کیفیات ہرگز مقصود نہیں اور جو کچھ عمل کی

توفیق ہو رہی ہے، یہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کی طرف سے انعام ہے اور یہ جو فکر ہوتی ہے کہ یہ اعمال پتہ نہیں قبول ہوتے ہیں کہ نہیں، یہ خوف دل میں ہونا چاہیے اور یہ سوچے کہ اپنی ذات میں تو یہ عمل اس قابل نہیں تھا کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کیا جائے، لیکن جب اس نے اس عمل کی توفیق دے دی، تو اس کی رحمت سے یہ بھی امید ہے کہ یہ عمل قبول ہوگا۔

## عبادت کے قبول ہونے کی ایک علامت:

حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہ (اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے آمین) ان سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت اتنے دن سے نماز پڑھ رہا ہوں، معلوم نہیں، اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہوتی ہے کہ نہیں؟ حضرت نے جواب میں فرمایا کہ ارے بھئی! اگر یہ نماز قبول نہ ہوتی، تو دوسری بار پڑھنے کی توفیق نہ ہوتی، جب تم نے ایک عمل کرلیا اور اس کے بعد اللہ تبارک و تعالیٰ نے وہی عمل دوبارہ کرنے کی توفیق دیدی، تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ پہلا عمل قبول ہے، ان شاء اللہ اس وجہ سے نہیں کہ اس عمل میں کوئی خصوصیت تھی، بلکہ اس وجہ سے کہ اس نے تمہیں توفیق دی، اس لیے اپنی نماز اور عبادتوں کو حقیر نہ سمجھو۔

## اگر عمل قبول نہ ہوتا، تو تمہیں اللہ اللہ کرنے کی توفیق نہ ہوتی:

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے مثنوی میں ایک بزرگ کا قصہ لکھا ہے کہ ایک بزرگ بہت دنوں تک نمازیں پڑھتے رہے، روزے رکھتے رہے اور تسبیحات واذکار کرتے رہے، ایک دن دل میں یہ خیال آیا کہ میں اتنے عرصے سے یہ سب کچھ کر رہا ہوں، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی جواب وغیرہ تو آتا نہیں، معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو یہ اعمال پسند ہیں یا نہیں؟ اس کی بارگاہ میں مقبول ہیں یا نہیں؟ آخرکار اپنے شیخ کے پاس جا کر عرض کیا کہ حضرت اتنے دن سے عمل کر رہا ہوں، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی جواب نہیں آتا، یہ سن کر شیخ نے فرمایا کہ ارے بے وقوف یہ جو تمہیں اللہ کی توفیق ہو رہی ہے ، یہ وہی ان کی طرف سے جواب ہے، اس لیے کہ اگر تمہارا عمل قبول نہ ہوتا، تو تمہیں اللہ اللہ کرنے کی توفیق نہ ہوتی، کسی اور جواب کے انتظار میں رہنے کی ضرورت نہیں۔

کہ گفت آں اللہ تو لبیک ماست ☆ زیں نیاز و درد و سوزک ماست

یعنی جو تو اللہ اللہ کر رہا ہے، یہ اللہ اللہ کرنا ہی ہماری طرف سے لبیک کہنا ہے، یہ تیرے اللہ اللہ کا جواب ہے کہ ایک مرتبہ کرنے کے بعد دوسری مرتبہ کرنے کی توفیق دے دی۔

## عمل کی قبولیت پر ایک بہترین حکیمانہ مثال:

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماکرتے تھے کہ ایک دن کسی آدمی کے پاس جاکر اس کی تعریف کرو اور اس کے بارے میں اچھے اچھے کلمات کہو اور تم اگلے دن پھر جاکے اس کی تعریف کرو اور اس کے بارے میں اچھے اچھے کلمات کہو، تیسرے دن پھر جاکر اس کے لئے تعریفی کلمات کہو، اب اگر تمہارا یہ عمل اس شخص کو پسند ہوگا، تو وہ تمہاری بات سنے گا، منع نہیں کرے گا، لیکن اگر تمہارا یہ عمل اس کو پسند نہیں ہوگا، تو ایک مرتبہ کرو گے، دو مرتبہ کرو گے، لیکن تیسری مرتبہ وہ تمہیں باہر نکال دے گا اور تمہیں تعریف کرنے نہیں دے گا۔ اسی طرح جب تم نے اللہ تبارک وتعالیٰ کا ذکر کیا اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو جاری رکھا اور تمہیں دوبارہ توفیق دی، تیسری بار توفیق دی، تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ تمہارا یہ عمل اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، یہی ٹوٹا پھوٹا عمل ان کے یہاں پسند ہے، انشاء اللہ، لہذا اس کی ناقدری مت کرو، بلکہ اس پر اللہ تبارک وتعالی کا شکر ادا کرو۔

## تواضع، شکر اور تکبر تینوں کا حق ادا کرنے کا طریقہ:

ہمارے حضرت والا قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ سیدھی سیدھی بات یہ ہے کہ نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق عمل کرتے رہو اور ہر عمل پر اللہ تبارک تعالی کا شکر ادا کرو، کہ یا اللہ آپ نے اپنے فضل وکرم سے توفیق عطا فرمائی، آپ کا شکر ہے، میرے اندر تو کوئی طاقت نہیں تھی اور جب اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا خیال آئے، اس پر توبہ استغفار کرلو کہ یا اللہ مجھ سے کوتاہیاں ہوئی ہیں، مجھے معاف فرما دیجئے، ایسا کرنے سے انشاء اللہ تواضع کا بھی حق ادا ہو جائے گا، شکر کا بھی حق ادا ہو جائے گا اور تکبر بھی پاس نہیں آئے گا۔

## تواضع حاصل کرنے کا طریقہ:

تواضع حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو یہ سمجھو کہ میں تو بندہ ہوں، اللہ تعالیٰ

جو کچھ میرے ذمہ میں لگا دیں گے، وہ کام کروں گا، اب اگر وہ کہیں منصب پر بیٹھا دیں، تو وہ کام کروں گا، میں ان کا بندہ ہوں، غلام ہوں، لیکن اللہ تعالیٰ نے جو کچھ عطا فرمایا ہے یہ محض ان کی عطا ہے، اس طرح کرنے سے شکر اور تواضع دونوں جمع ہو جاتے ہیں۔

اس لیے صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ عارف جامع اضداد ہوتا ہے، جس کو اللہ تعالیٰ معرفت عطا فرمائیں، وہ ایسی چیزوں کو جمع کرتا ہے، جو بظاہر ایک دوسرے کی ضد نظر آتی ہے، مثلاً ایک طرف اپنے عمل کی تحقیر بھی نہیں کرنی اور دوسری طرف اس عمل پر عجب بھی نہیں کرنا اور یہ سوچنا کہ میری نسبت سے یہ عمل حقیر ہے اور اللہ تعالیٰ کی نسبت سے یہ عمل عظیم ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی توفیق کی نسبت ہے، یہ ان کا انعام ہے، یہ کرنے سے دونوں چیزیں جمع ہو جائیں گی۔

## شکر کثرت سے کیا کرو:

ہمارے حضرت بار بار فرمایا کرتے تھے کہ میں تمہیں ایک بات بتاتا ہوں، آج تمہیں اس بات کی قدر نہیں ہوگی، جب کبھی اللہ تعالیٰ سمجھنے کی توفیق دیں گے، تب تمہیں قدر معلوم ہوگی، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر کثرت سے کیا کرو، اس لیے جس قدر شکر کرو گے، امراض باطنہ کی جڑ کٹے گی، واقعہ یہ کہ اس وقت وہ باتیں واقعی اتنی سمجھ میں نہیں آتی تھیں، اب تو کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی ہیں کہ یہ شکر ایسی دولت ہے، جو بہت سے امراض باطنہ کا خاتمہ کرنے والی ہے، حضرت فرماتے ہیں کہ میاں وہ ریاضتیں اور مجاہدے کہاں کرو گے؟ جو پہلے زمانے میں لوگ اپنے شیوخ کے پاس جا کر کیا کرتے تھے، رگڑے کھایا کرتے تھے، محنتیں کرتے تھے، مشقتیں اٹھاتے تھے، بھوکے رہتے تھے، تمہارے پاس اتنا وقت کہاں؟ اور تمہارے پاس اتنی فرصت کہاں؟ بس ایک کام کرلو، وہ یہ کہ کثرت سے شکر کرو، جتنا شکر کرو گے، انشاء اللہ تواضع پیدا ہوگی، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے تکبر دور ہوگا، امراض باطنہ رفع ہوں گے۔

## شکر کے معنی:

اور جب شکر کرو تو ذرا سوچ سمجھ کر شکر کرو کہ شکر کے معنی کیا ہیں؟ شکر کے معنی یہ ہیں کہ میں تو اس چیز کا مستحق نہیں تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے عطا فرمائی، اسی کا نام تواضع

ہے، اگر اپنے آپ کو اس کا مستحق سمجھا، تو تواضع کیا ہوئی؟ پھر شکر کیا ہوا؟ اگر ایک آدمی ایک چیز کا مستحق ہو اور اس کو وہ چیز دی جائے، تو یہ شکر کا موقع نہیں ہے، مثلاً ایک آدمی نے کسی سے قرضہ لیا، تو مقروض پر واجب ہے کہ وہ قرض خواہ کو قرض لوٹائے، کیونکہ قرض خواہ اس رقم کا مستحق ہے، اب جب مقروض یہ رقم قرض خواہ کو لوٹائے گا، اس وقت قرض خواہ پر کوئی شکر ادا کرنا واجب نہیں ہوگا، اس لیے کہ یہ رقم ادا کرکے مقروض نے کوئی احسان نہیں کیا، شکر تو اس وقت ہوتا جب انسان یہ سمجھے کہ میں اس چیز کا مستحق تو تھا نہیں، مجھے استحقاق سے زیادہ کوئی چیز دی گئی"۔ لہٰذا جب کسی نعمت کا شکر ادا کرو، تو ذرا سوچ لو کہ یہ نعمت میرے استحقاق میں نہیں تھی، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے مجھے عطا فرمائی، بس یہ سوچ لوگے، انشاء اللہ تواضع حاصل ہو جائے گی، مثلاً کوئی منصب ملا، تو سوچ لو، یا اللہ آپ کا کرم ہے، آپ نے دے دیا، میرے بس کا تو تھا نہیں، میرے اندر طاقت نہیں تھی، میرے اندر صلاحیت نہیں تھی، مگر آپ نے اپنے فضل وکرم سے مجھے عطا فرمایا، بس یہ سوچ لیا، انشاء اللہ تواضع حاصل ہوگئی اور جب تواضع حاصل ہو جائے گی، تو اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وعدہ ہے کہ "مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ"، یعنی جو شخص اللہ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کو بلندی فرما دیتے ہیں۔

## وعظ ونصیحت کا خلاصہ:

ایک بات اور سمجھ لیں وہ یہ کہ تواضع اگرچہ دل کا عمل ہے کہ آدمی اپنے آپ کو دل میں بے حقیقت سمجھے، لیکن دل میں یہ بات مستحضر رکھنے کے لیے آدمی عملاً یہ کرے کہ کسی بھی کام سے اپنے آپ کو بلند نہ سمجھے اور کسی بھی کام میں عار نہ ہو، یہ نہ سوچے کہ یہ کام میرے مرتبے کا نہیں، بلکہ ہر چھوٹے سے چھوٹے عمل کے لیے بھی تیار رہے، دوسرے یہ کہ آدمی اپنی نشست وبرخاست میں اور انداز واداء میں چلنے، پھرنے میں ایسا طریقہ اختیار کرے، جس میں تکبر نہ ہو، بلکہ عاجزی اور انکساری ہو، اگرچہ ساری تواضع اس پر منحصر نہیں، یہ بھی تواضع کے حصول کا ایک طریقہ ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ظاہری افعال کے اندر بھی آدمی عاجزی اور انکساری اختیار کرے، اس لیے کہ اگر یہ کرلیا، تو پھر انشاء اللہ دل میں بھی تواضع پیدا ہو جائے گی۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہمارے اندر بھی تواضع پیدا فرما دے۔ آمین

روح کی بیماریاں اوران کا علاج

# باب......(۵)



- تکبر اور اس کا علاج
- تکبر کی اقسام
- تکبر کا ایک اور علاج

باب پنجم کا پہلا بیان:

# تکبر اور اس کا علاج

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِیْمِ وَعَلٰی آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ. وَعَلٰی كُلِّ مَنِ اتَّبَعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْن. اَمَّا بَعْدُ

## کائنات کا سب سے پہلا گناہ:

کبر یعنی تکبر بہت سی بیماریوں کی جڑ ہے، اس سے بہت سی باطنی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، اسی وجہ سے اس کو ام امراض کہا جاتا ہے اور سب سے پہلا گناہ جو کائنات میں سرزد ہوا، وہ کبر کا گناہ تھا، جب اللہ جل شانہ نے ابلیس سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو، تو اس نے سجدہ کرنے سے انکار کردیا، اور دلیل یہ دی کہ

﴿اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ﴾

(سورہ الاعراف آیت ۱۲)

میں اس سے بہتر ہوں، اپنے کو اس نے بڑا سمجھا اور حضرت آدم علیہ السلام کو چھوٹا سمجھا، اس کی دلیل بھی بہت مضبوط پیش کی، کہ آپ نے ان کو مٹی سے پیدا کیا ہے اور مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور آگ مٹی سے افضل ہے۔

اگر اس دلیل کی طرف دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ یہ دلیل بڑی قوی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو نہ ماننے کے نتیجے میں کبر کا جو مظاہرہ ہوا، یہ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی وہ نافرمانی تھی، جو سب سے پہلے سرزد ہوئی اور اسی تکبر کے نتیجے میں شیطان ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ ہوا۔

## تکبر تمام گناہوں کی جڑ ہے:

اسی تکبر سے حسد پیدا ہوتا ہے، کیونکہ جب دل میں یہ خیال ہے کہ میں بڑا ہوں، اب اگر دوسرا آدمی اس سے آگے بڑھ گیا اور ترقی کر گیا، تو دل میں یہ حسد پیدا ہوتا ہے کہ یہ آدمی کیوں آگے بڑھ گیا؟ مجھے آگے بڑھنا چاہیے تھا۔

اسی تکبر سے بغض پیدا ہوتا ہے، غصہ کی کثرت تکبر کی وجہ سے ہوتی ہے، غیبت کا گناہ عموماً تکبر کی وجہ سے ہوتا ہے، تجسس بھی تکبر کی وجہ سے ہوتا ہے، غرض یہ کہ تکبر بے شمار امراض کی جڑ ہے، جس طرح جسمانی امراض کے ماہرین اور اسپیشلسٹ ہوتے ہیں، کوئی کان کا اسپیشلسٹ ہے، کوئی ناک کا اسپیشلسٹ ہے، کوئی حلق کا اسپیشلسٹ ہے، اسی طرح روحانی امراض کے اسپیشلسٹ بھی ہوتے ہیں، ان میں ایک امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، وہ اپنی کتاب احیاء العلوم میں فرماتے ہیں کہ یہ تکبر ام الامراض ہے، یعنی تمام بیماریوں کی ماں ہے، اگر یہ ایک مرتبہ پیدا ہو جائے، تو دوسری بیماریاں اس سے پیدا ہوتی رہتی ہیں، لہٰذا اس بیماری کو ختم کرنے کی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں اس بیماری سے محفوظ فرمائے اور اگر یہ بیماری ہمارے اندر ہے، تو اس کا علاج بھی فرمادے۔ آمین



## کبر کے معنی اور کبر و تکبر میں فرق:

کبر کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے کے مقابلے میں اپنے آپ کو بڑا یعنی افضل سمجھنا، اگر کسی کی عمر ۳۰ سال ہے اور دوسرے کی عمر بیس سال ہے، تو ظاہر کہ تیس سال والا شخص اپنے آپ کو بیس سال والے سے عمر کے اعتبار سے بڑا سمجھے گا، یہ کبر نہیں اور بری بات نہیں، اپنے آپ کو بڑا یعنی افضل سمجھنا کہ میں اس سے بہتر ہوں، میں اس سے اچھا ہوں، یہ کبر ہے۔

اور جب اپنی بڑائی دل میں ہوتی ہے، تو پھر اپنے کسی انداز و ادا سے اس کا مظاہرہ بھی ہو جاتا ہے، مثلاً گفتگو سے، قول سے، فعل سے، اس کا نام تکبر ہے، لہٰذا دوسرے کے مقابلے میں بڑائی جتلانا تکبر ہے، یہ فرق ہے تکبر اور کبر میں، گویا کہ کبر یہ ہے کہ دل میں اپنی بڑائی کا پیدا ہونا اور تکبر یہ ہے کہ دوسرے کے مقابلے میں اپنی بڑائی جتلانا، مثلاً دوسرے سے اس انداز سے گفتگو کرنا، جس میں دوسرے کی تحقیر شامل ہو، یہ تکبر کبر کا نتیجہ ہوتا ہے، اس کو ختم

کرنے کی ضرورت ہے۔

## تکبر کینسر کی طرح ایک پوشیدہ مرض ہے:

یہ بیماری ایسی ہے کہ اکثر و بیشتر انسان کو پتہ نہیں چلتا کہ یہ بیماری میرے اندر ہے یا نہیں؟ اور وہی بیماری سب سے زیادہ خطرناک ہے، جو اندر ہی اندر بڑھتی چلی جائے اور اس کا پتہ ہی نہ چلے، جیسے آج کل ڈاکٹر یہ کہتے ہیں کہ سب سے خطرناک بیماری کینسر کی ہے، اس لیے کہ یہ بیماری ایسی ہے کہ جب انسان کے بدن میں پیدا ہو جاتی ہے، تو اندر ہی اندر بڑھنے لگتی ہے، اس وقت نہ بیمار کو پتہ چلتا ہے، نہ ڈاکٹر کو پتہ چلتا ہے کہ اندر کیا ہو رہا ہے؟ کیونکہ جب بیماری میں انسان کو تکلیف ہوتی ہے، تو اس وقت پتہ چلتا ہے کہ میرے اندر یہ بیماری ہے، اس لیے بیماری کے اندر تکلیف کا ہونا یہ بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے، کیونکہ تکلیف اس بات کا سگنل ہوتا ہے کہ اندر کوئی خرابی پیدا ہوگئی ہے، لہٰذا آدمی ڈاکٹر کے پاس اس کے علاج کے لیے جاتا ہے، اور اپنا علاج کرالیتا ہے اور ٹھیک ہو جاتا ہے، لیکن اگر بیماری تو اندر پیدا ہوگئی اور اس کی تکلیف نہیں ہوئی، تو اب اس کے علاج کی طرف بھی دھیان نہیں جائے گا اور اس کے تدارک کی فکر نہیں ہوگی، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بیماری اندر ہی بڑھتی چلی جاتی ہے اور انسان کو اس وقت پتہ چلتا ہے، جب وہ ناقابل علاج ہو جاتی ہے، اس کے بعد کوئی علاج ممکن نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے حفاظت فرمائے۔ آمین

اسی طرح کبر کی بیماری بھی ایسی ہی ہے، آدمی اپنے آپ کو یہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ میں ٹھیک ہوں لیکن حقیقت میں وہ کبر اور تکبر کا شکار ہو جاتا ہے اور یہ بیماری اس کے اندر موجود ہوتی ہے، کبھی آپ نے یہ سنا کہ کسی متکبر نے یہ کہا ہو کہ میں تکبر کرتا ہوں، آج تک کسی نے یہ اقرار نہیں کیا۔

## ”میں یہ کام تکبر کی وجہ سے نہیں کرتا“ یہ شیطانی دھوکہ ہے:

ایک بات ہمارے معاشرے میں بہت مشہور ہوگئی ہے، وہ یہ کہ ٹخنوں سے نیچے پاجامہ شلوار وغیرہ پہننے کی ممانعت حدیث شریف میں آئی ہے، اس کے بارے میں لوگوں نے یہ حیلہ نکالا ہے، کہ حدیث شریف میں تو یہ آیا ہے کہ جو شخص تکبر کی وجہ سے پاجامہ یا شلوار ٹخنوں سے نیچے لٹکائے، تو وہ حصہ جہنم میں جائے گا، اب لوگ یہ کہتے ہیں کہ دیکھئے اس حدیث میں

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تکبر کی قید لگائی ہے، لہذا تکبر کی وجہ سے شلوار کو نیچے لٹکانا تو ناجائز ہے، لیکن اگر تکبر کے بغیر ویسے ہی فیشن کے طور پر لٹکایا، یا اس لیے لٹکایا کہ ہمیں اس طرح لٹکانا اچھا لگتا ہے، تو پھر کوئی گناہ نہیں اور ہم تکبر سے نہیں لٹکاتے، یہ بات لوگوں نے بہت زیادہ مشہور کر رکھی ہے، میرا یورپ اور امریکہ جانا ہوا، تو دیکھا کہ یہاں کے مسلمانوں میں یہ بات بہت مشہور ہے اور جس سے بھی پوچھا جائے تو وہ یہی کہتا ہے کہ ہم یہ کام تکبر کی وجہ سے نہیں کرتے۔

میں ان سے یہ کہتا ہوں کہ اچھا تم مجھے کوئی ایک آدمی بھی ایسا دکھا دو، جو کہتا ہو کہ میں تکبر کی وجہ سے شلوار نیچے لٹکاتا ہوں، کوئی آدمی ایسا ملے گا؟ نہیں ملے گا، کیونکہ تکبر ایسی چیز ہے کہ اگر متکبر کو پتہ چل جائے کہ میں تکبر کرتا ہوں، تو بس تکبر ختم ہو جائے، تکبر تو پیدا ہی اس طرح ہوتا ہے کہ جس شخص کے اندر تکبر ہے، اس کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ میں کبر اور تکبر کے اندر مبتلا ہوں، یہ شیطان کا دھوکہ ہے کہ آدمی یہ کہے کہ میں یہ کام تکبر کی وجہ سے نہیں کرتا ہوں، لہذا میرے لیے یہ عمل جائز ہے۔

## کیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ تم متواضع ہو؟

حالانکہ دنیا میں کسی شخص کے بارے میں یہ گارنٹی نہیں ہے کہ وہ تکبر سے پاک ہوگا، سوائے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی کے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ گارنٹی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تکبر سے پاک تھے، جس ذات اقدس کے بارے میں یہ گارنٹی ہے کہ وہ تکبر سے پاک تھے، وہ تو اپنا ازار ٹخنوں سے نیچے نہیں لٹکاتے، بلکہ اپنا ازار نصف ساق تک رکھتے تھے، کیونکہ ٹخنوں سے نیچے لٹکانا تکبر والا کام ہے اور ہم لوگ جن کے اندر تکبر پیدا ہونے کا ہر وقت خطرہ ہے، لیکن ازار نیچے لٹکا کر یہ کہتے ہیں کہ ہم تکبر سے نہیں لٹکاتے، اس سے زیادہ شیطان کا دھوکہ اور کیا ہوگا، اس لیے کہ یہ تکبر ایک ایسا امر مخفی ہے کہ متکبر کو پتہ نہیں لگتا کہ میں تکبر کر رہا ہوں۔

## رواجی تواضع میں مخفی تکبر اور اس کی پہچان کا طریقہ:

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات ایک آدمی ایسا کام کر رہا ہوتا

ہے، جو بظاہر تواضع کا ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں سراسر تکبر ہوتا ہے، جیسے آج کل یہ رواج ہے کہ لوگ اپنے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ میں بالکل ناکارہ ہوں، میں گیا گزرا جاہل ہوں، اب یہ الفاظ تواضع کے ہیں کہ وہ شخص اپنے آپ کو ناکارہ اور جاہل کہہ رہا ہے، لیکن بسا اوقات یہ سراسر تکبر ہوتا ہے، کیونکہ وہ شخص یہ الفاظ اسلئے کہتا ہے، تاکہ سامنے والا پلٹ کر یہ کہے کہ جناب آپ جاہل کہاں؟ آپ تو بہت بڑے علامہ ہیں، اس کا آپ تجربہ کرکے دیکھ لیں، وہ اس طرح کہ جو شخص اپنے آپ کو یہ کہہ رہا ہے کہ میں جاہل ہوں، میں ناکارہ ہوں، اس کے جواب میں کوئی دوسرا شخص یہ کہہ دے کہ بے شک آپ جاہل اور ناکارہ ہیں، بس اس وقت اس کی طبیعت صاف ہو جائے گی، اس سے معلوم ہوا کہ وہ سچے دل سے یہ الفاظ نہیں کہہ رہا تھا، بلکہ اس لیے کہہ رہا تھا تاکہ سامنے والا پلٹ کر اس کے لیے تعریفی کلمات کہے، یہ تواضع نہیں بلکہ تکبر ہے۔ لہذا یہ تکبر بڑا دقیق اور باریک ہوتا ہے، اس کے وجود کا پتہ نہیں چلتا، اس لیے کسی معالج کی ضرورت ہوتی ہے، جو یہ پہچان کر بتائے کہ اس کے اندر تکبر ہے۔

## تحدیث بالنعمت تکبر میں داخل نہیں:

بعض اوقات بظاہر دیکھنے میں تکبر نظر آتا ہے، لیکن حقیقت میں نہیں ہوتا، جیسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا

اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ آدَمَ وَلَا فَخْرَ۔ میں آدم کے تمام بیٹوں کا سردار ہوں۔

یہ کون کہہ رہا ہے؟ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اگر کوئی دوسرا آدمی یہ بات کہے، تو اس کے حق میں بڑائی کا جملہ ہے، لیکن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما رہے ہیں کہ میں آدم کے بیٹوں کا سردار ہوں، لیکن یہ بات کسی فخر اور تکبر کی وجہ نہیں کہہ رہا ہوں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کا شکر ادا کرتے ہوئے کہہ رہا ہوں، اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے مجھے آدم کے بیٹوں کی سرداری عطا فرمائی ہے، اب ظاہر میں یہ الفاظ بڑائی کے ہیں، حقیقت میں بڑائی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ نعمت عطا فرمائی ہے۔

## حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ کا تعریف پر ہنسنا:

حضرت ذوالنون مصری رحمتہ اللہ علیہ بڑے درجہ کے اولیاء اللہ میں سے ہیں، ان کے

بارے میں لکھا ہے کہ جب کوئی شخص ان کے پاس آکر ان کی تعریف کرتا کہ حضرت آپ نے بڑا اچھا وعظ فرمایا، فلاں بات بڑی اچھی ارشاد فرمائی، تو وہ بہت خوش ہوتے اور ہنستے تھے، اب دیکھنے والا یہ سمجھتا تھا کہ یہ بزرگ اپنی تعریف سن کر خوش ہو رہے ہیں اور جس شخص کے دل میں عجب اور کبر ہوتا ہے، اس کی تو خواہش ہی یہ ہوتی ہے کہ دوسرا آدمی میری تعریف کرے اور تعریف سن کر اس کو بہت خوشی ہوتی ہے، کسی شخص نے حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ حضرت آپ کو اپنی تعریف سن کر بڑا مزہ آتا ہے، کیونکہ جب کوئی آپ کے کسی کام کی تعریف کرتا ہے، تو آپ بہت خوش ہوتے ہیں، حضرت نے جواب میں فرمایا ہاں بھائی، میں بہت خوش ہوتا ہوں، اس لیے کہ کوئی شخص میرے کسی عمل کی تعریف کرتا ہے، تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ میرا تو کوئی عمل نہیں ہے، وہ تو میرے اللہ نے مجھے توفیق دی ہے، تو میں نے وہ عمل کرلیا، تو درحقیقت میرے اللہ کی تعریف ہوتی ہے اور میں اللہ کی تعریف پر خوش ہوتا ہوں کہ میرے اللہ نے مجھے یہ کام کرادیا اور مجھے اس کام کی توفیق عطا فرمادی، میں اس پر خوش ہوتا ہوں، اب دیکھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ یہ صاحب عجب اور کبر میں مبتلا ہیں، لیکن حقیقت میں وہ اللہ تعالیٰ کے شکر کے مقام پر ہیں۔

لہذا بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ تکبر کی بیماری ہوتی ہے، لیکن انسان کو پتہ نہیں لگتا اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دیکھنے میں بیماری معلوم ہوتی ہے، لیکن حقیقت میں بیماری نہیں ہوتی، اس لیے کہ صرف یہ کہہ دینا کہ ہمارے اندر تکبر نہیں ہے، اس سے بات نہیں بنتی، اس لیے کہ جب تمہارے اندر تکبر ہوگا، تو تمہیں پتہ بھی نہیں ہوگا کہ تمہارے اندر تکبر ہے یا نہیں؟

## متکبر کی حکیمانہ مثال:

کسی نے عربی زبان میں متکبر کی ایک بہت اچھی مثال بیان کی ہے، کہ متکبر کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہو اور نیچے کی طرف دیکھ رہا ہو، اب نیچے جو لوگ اس کو نظر آرہے ہیں، وہ ان سب کو چھوٹا سمجھتا ہے، کیونکہ وہ سب اس کو چھوٹے چھوٹے نظر آتے ہیں اور نیچے والے اس کو چھوٹا دیکھتے ہیں، اس لئے وہ اس کو چھوٹا سمجھتے ہیں، لہذا وہ دوسروں کو چھوٹا سمجھتا ہے اور دوسرے اس کو چھوٹا سمجھتے ہیں، کیونکہ اس متکبر کو اپنے تکبر کا پتہ نہیں، لہذا اپنے آپ کو ان سے افضل سمجھ کر ان کو چھوٹا سمجھ رہا ہے اور دوسرے لوگ جن کو یہ معلوم ہے کہ یہ متکبر

ہے، وہ چاہے منہ پر اس کی تعریف کریں، لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ یہ بے وقوف آدمی تکبر کے اندر مبتلا ہے، اس لیے معالج کے بغیر تکبر کا پتہ نہیں چلتا، لہذا یہ دھوکہ مت کھانا کہ ہم تو تکبر کی وجہ سے ٹخنوں سے نیچے ازار نہیں کرتے، کیونکہ ازار کو نیچے کرنا ہی تکبر پیدا کرنے کا ایک سبب ہے، اس لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے منع فرمایا۔ تکبر کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے کچھ ملفوظات ہیں ان کی مختصر تشریح عرض کرتا ہوں۔

## عالم کا اپنے کو جاہل سے اچھا سمجھنے کا علاج:

ایک صاحب نے حضرت والا سے پوچھا کہ

'اکثر بلا قصد یہ خیال آتا ہے کہ فلاں جاہل ہے میں عالم ہوں میں اس سے اچھا ہوں۔'' (انفاس عیسیٰ ص ۱۵۴)



ایک آدمی کو اللہ تعالیٰ نے واقعتاً علم عطا فرمایا ہے، عالم ہے اور دوسرا شخص عالم نہیں، اب اس عالم کو یہ خیال آہی جاتا ہے کہ مجھے الحمد للہ علم حاصل ہے اور جو دوسرے کو حاصل نہیں اور علم جہل سے اچھا ہے، اس لیے اپنے اچھے ہونے کا خیال دل میں آگیا، آیا یہ خیال تکبر ہے یا نہیں؟ حضرت والا نے جواب دیا کہ

نفس سے کہے کہ کیا معلوم اللہ تعالیٰ کے یہاں کون اچھا ہے؟ ممکن ہے کہ اس کا باطن اچھا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑا ذلیل وخوار ہوں اور اللہ تعالیٰ نے تجھ کو دو چار حرف ظاہری سکھا دیئے ہیں، اس لیے تو بڑائی کرتا ہے، اگر وہ چاہے تو آج چھین لے، تو کیا کرے گا؟ اسی کا استحضار بہ تکرار کرے اور دعا بھی کرے۔ (ایضاً)

## حقیقت کا اظہار تکبر اور انکار جھوٹ، تطبیق کیسے ممکن ہے؟

یہاں ایک بات سمجھ لینی چاہیے، بعض اوقات دل میں یہ خیال آتا ہے کہ آدمی کسی حقیقت سے تو انکار نہیں کرسکتا، اگر ایک آدمی کے پاس علم ہے اور دوسرے کے پاس وہ علم نہیں ہے، اب جس کے پاس علم ہے، وہ کیسے کہہ دے کہ میرے پاس علم نہیں؟ اور ظاہر ہے کہ علم جہل کے مقابلے میں بہتر ہے، قرآن کریم کی آیت ہے

﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (سورۃ الزمر۔ آیت ۹)

یعنی علم رکھنے والا بہتر ہے، اس کے بنسبت جو علم نہیں رکھتا، لہذا جس کے پاس علم ہے، وہ کیسے جھٹلا دے کہ میرے اندر یہ وصف نہیں ہے؟ یا مثلاً ایک آدمی زیادہ صحت مند ہے، اس کے مقابلے میں دوسرا آدمی کمزور ہے، اب ظاہر ہے کہ صحت مند یہ سوچے گا کہ اس کے مقابلے میں میری صحت اچھی ہے، میں اس کے مقابلے میں زیادہ طاقت ور ہوں، مضبوط ہوں۔ یا مثلاً ایک آدمی کے پاس پیسہ زیادہ ہے اور اس کے مقابلے میں دوسرے آدمی کے پاس پیسہ نہیں ہے، تو وہ یہ خیال کرے گا کہ میں اس کے مقابلے میں مالدار ہوں، اس کے پاس پیسہ نہیں ہے، میرے پاس پیسہ ہے، یا ایک آدمی بڑا افسر ہے، کسی بڑے عہدے پر فائز ہے، دوسرا آدمی چپڑاسی اور مزدور ہے، تو بڑے منصب اور عہدے والا اپنے آپ کو اس چپڑاسی سے بڑا سمجھے گا یا نہیں؟ اب اگر وہ اپنے کو بڑا سمجھے گا، تو تکبر ہوگا اور اگر بڑا نہ سمجھے تو جھوٹ ہوگا، مثلاً اگر وہ یہ سمجھے کہ میں افسر نہیں ہوں، بلکہ میں تو ایک مزدور ہوں، یہ تو بالکل جھوٹ ہوگیا، یا مثلاً ایک آدمی طاقتور ہے، صحت مند ہے، وہ یہ کہے کہ میں طاقت ور نہیں ہوں، بلکہ میں کمزور ہوں، یا مثلاً ایک عالم ہے، وہ یہ کہے کہ میں عالم نہیں ہوں، بلکہ جاہل ہوں، تو یہ جھوٹ ہوگیا، اب سوال یہ ہے کہ دونوں باتوں کے درمیان کیسے تطبیق ہوگی کہ تکبر بھی نہ ہو اور جھوٹ بھی نہ ہو۔



## تعارض کی تطبیق:

ایک اور جگہ پر حضرت والا نے ایک اور جملہ ارشاد فرمایا اس کو یاد رکھنا چاہیے، اس سے یہ مسئلہ آسان ہو جاتا ہے، وہ یہ کہ

''اپنے آپ کو اکمل سمجھنا تکبر نہیں، افضل سمجھنا تکبر ہے۔''

اکمل سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی یہ سمجھے کہ دوسرے کے پاس بظاہر علم کم ہے اور میرے پاس علم زیادہ ہے، اس کی صحت اچھی نہیں ہے اور میری صحت اچھی ہے، اس کے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں، میرے پاس الحمدللہ اتنے پیسے ہیں، اس کے پاس چھوٹا مکان ہے اور میرے پاس بڑا مکان ہے، اس کی اولاد کم ہے اور میری اولاد زیادہ ہے، تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں میں مقدار کے اعتبار سے اپنے آپ کو زیادہ سمجھنا تکبر نہیں، البتہ افضل سمجھنا میں اس سے افضل ہوں، یہ تکبر ہے اور اس کا علاج حضرت والا نے یہ بتایا کہ آدمی یہ سوچے کہ کیا

معلوم اللہ تعالیٰ کے یہاں کون اچھا ہے؟

## اظہار نعمت کے وقت اس نعمت پر شکر ادا کرے:

یہ جو اوپر بیان کیا کہ اپنے آپ کو دوسرے کے مقابلے میں اکمل سمجھنا اور علم میں زیادہ سمجھنا تکبر نہیں، یا عمر میں زیادہ سمجھنا، یا صحت میں زیادہ سمجھنا، یا مال میں زیادہ سمجھنا، تکبر نہیں، اس میں بھی ایک شرط ہے، وہ یہ کہ دل میں جس زیادتی کا خیال آرہا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے اور یہ کہے کہ یہ زیادتی میری قوت بازو کا کرشمہ نہیں ہے، بلکہ یہ اللہ جل جلالہ کی عطا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کی عطا کا تصور کرے گا، تو اس سے تکبر پیدا نہیں ہوگا۔

## دنیا میں اپنے آپ کو افضل سمجھنا بے بنیاد ہے:

اور اپنے آپ کو دوسرے سے افضل سمجھنا بالکل بے بنیاد ہے، کیا معلوم کہ آخر میں جا کر کیا انجام ہوتا ہے؟ اللہ تعالیٰ کے یہاں کون مقرب ہے اور کون مقرب نہیں؟ نہ وہاں علم کی بڑائی کام آئے گی، نہ عمر کی بڑائی کام آئے گی، نہ وہاں مال و دولت کی کثرت کام آئے گی، نہ اس کی گارنٹی ہے کہ جس کے پاس علم زیادہ ہے، وہ ضرور افضل ہوگا، جبکہ حدیث شریف میں ہے کہ سب پہلے جہنم جس کے ذریعہ سلگائی جائے گی، وہ ایک عالم ہوگا، لہٰذا صرف علم کے بھروسے پر، یا اس بنا پر کہ لوگ دنیا میں میرے ہاتھ چومتے ہیں، یا مجھے بڑا سمجھتے ہیں، یا علامہ سمجھتے ہیں، میں افضل ہوں، یاد رکھے! اس میں کوئی بھروسہ نہیں ہے، جب حساب کتاب کا منظر سامنے ہوگا، تو بڑے بڑے علماء دھرے رہ جائیں گے، لہٰذا علم کی وجہ سے اپنے آپ کو دوسرے سے کیا افضل سمجھے؟ اسی طرح مال کی وجہ سے اپنے آپ کو دوسرے سے کیا افضل سمجھے؟ جبکہ قیامت کے دن بڑے بڑے مالدار جہنم کا ایندھن بنیں گے، لہٰذا جب کسی بات کا بھروسہ نہیں، تو پھر کس بنیاد پر آدمی اپنے آپ کو دوسرے سے افضل سمجھے۔

## کتے سے افضل ہونے یا نہ ہونے پر ایک بزرگ کا واقعہ:

ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ ایک آدمی نے ان سے یہ کہہ دیا، کہ تم تو میرے کتے سے بدتر ہو، ان بزرگ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ بات دراصل یہ ہے کہ ابھی میرا کچھ

پتہ نہیں، کہ میں کتے سے بدتر ہوں یا نہیں، جب اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوگی اور وہاں پر میں حساب کتاب کے مرحلے کو پار کر گیا، تو میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں کتے سے افضل ہوں اور اگر میں وہاں حساب کتاب کے مرحلے سے نہ گزر پایا اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کا مستحق ہوگیا، تو پھر بے شک تم ٹھیک کہتے ہو، کہ میں کتے سے بدتر ہوں، اس لیے کہ کم ازکم اس کتے کو حساب کتاب نہیں دینا پڑے گا اور اس کو اللہ تعالیٰ کے عذاب کا سامنا نہیں ہوگا۔

## کسی سے افضل ہونے کا خیال دل سے نکال دو:

یہ ہیں حقیقی معنی میں اللہ والے، دوسرا شخص گالی دے رہا ہے، لیکن یہ اپنے حقائق اور معارف میں گم ہیں اور اپنی حقیقت حال کو دیکھ رہے ہیں، کہ میری حقیقت تو یہ ہے، لہٰذا دماغ سے افضل ہونے کا خیال نکال دو، نفس سے کہو کہ تمہیں کیا معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں کون اچھا ہے؟ ممکن ہے کہ اس کا باطن اچھا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑا ذلیل وخوار ہوں اور اللہ تعالیٰ نے تجھ کو دو چار حرف ظاہری سکھا دیئے ہیں، اس لیے تو بڑائی کرتا ہے، اگر وہ چاہے تو آج چھین لے، کس چیز پر اکڑتا ہے اور اتراتا ہے؟ کیا یہ علم تجھے ماں کے پیٹ سے حاصل ہوگیا تھا؟ کسی نے اپنے فضل وکرم سے عطا فرمادیا اور جس نے عطا فرمایا ہے، وہ جب چاہے، سلب کرلے، جب چاہے واپس لے لے۔

کیا تو مال پر اکڑتا ہے؟ کیا یہ مال تجھے ماں کے پیٹ سے ملا تھا؟ کسی دینے والے نے مال دیا ہے اور جس نے دیا ہے، وہ جب چاہے، واپس لے لے، کیا تو صحت پر اکڑتا ہے؟ بڑے بڑے تندرست اور توانا لوگ ایسے گزرے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان سے صحت واپس لی، تو وہ بتاشے کی طرح پچک گئے۔

## جب صلاحیت سلب ہوجائے تو بندہ زیرو ہے:

ہمارے ایک عزیز تھے، جن کا ابھی ایک دوسال پہلے انتقال ہوا، ان کے بارے میں سارے دیوبند میں یہ بات مشہور تھی کہ وہ برف کی سل کو مکہ مار کر توڑ دیتے تھے، اتنے طاقت ور تھے، انہوں نے کبھی بھی زندگی میں تربوز کو چاقو سے نہیں کاٹا، بس مکہ مارا اور توڑ دیا اور اس کے ساتھ ساتھ بڑے عابد وزاہد آدمی تھے، بعد میں لاہور میں مقیم ہوگئے، چار پانچ سال پہلے

لاہور میں ان سے ملاقات کے لیے گیا، تو دیکھا کہ کھانا کھانے کے لیے ہاتھ منہ تک نہیں اٹھ رہا تھا، دوسرے لوگ کھانا کھلا رہے تھے، جب میں ان کے پاس پہنچا، تو مجھے دیکھ کر رو پڑے اور کہنے لگے کہ یہ وہی حامد ہے، جو برف کی سل مکے سے توڑ دیا کرتا تھا اور اب یہ حال ہے کہ خود اپنے ہاتھ سے کھانا نہیں کھا سکتا۔

## اترانے اور اکڑنے کا کوئی موقع نہیں:

ارے تم کس بات پر اتراتے ہو؟ صحت پر اتراتے ہو؟ قوت پر اتراتے ہو؟ کیا مال پر اتراتے ہو؟ کیا علم پر اتراتے ہو؟ ارے ان میں سے کوئی چیز ایسی ہے جس کی ہمیشہ تمہارے پاس رہنے کی گارنٹی ہو؟ بلکہ کسی دینے والے نے دی ہے، وہ جب چاہے، واپس لے لے، اس لیے دو چار حرف اس نے سکھا دیئے، وہ اگر آج چھین لے، تو تم کیا کر لو گے؟ بس اس کا استحضار اور تکرار کیا جائے، جب کبھی دل میں بڑائی کا خیال آئے، بس اس کا دھیان کر لے کہ کسی دینے والے نے یہ وصف اپنے فضل سے دیا ہے، اپنے انعام سے دیا ہے، تیرا کوئی استحقاق نہیں تھا، کتنے لوگ ہم میں سے ایسے ہیں جو جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں اور جس طرح دیا ہے، وہ اسی طرح واپس بھی لے سکتا ہے، لہٰذا تیرے لیے اترانے اور اکڑنے کا اور دوسروں پر بڑائی جتلانے اور اپنے آپ کو افضل سمجھنے کا کوئی موقع نہیں، ہاں شکر کا موقع ہے کہ اے اللہ آپ نے اپنے فضل وکرم سے مجھے یہ نعمت عطا فرمائی، میں اس کا مستحق نہیں تھا اور میرے قبضہ قدرت میں نہیں تھا، آپ نے اپنے فضل وکرم سے مجھے عطا فرمائی، اے اللہ آپ کا شکر ہے:: اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ.

## ''شکر'' بے شمار روحانی بیماریوں کا علاج:

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ شکر ایسی چیز ہے، کہ یہ بے شمار روحانی بیماریوں کا علاج ہے، جو آدمی شکر کرے گا، وہ کبھی تکبر میں مبتلا نہیں ہوگا، انشاء اللہ، اس لیے کہ شکر کے معنی کیا ہیں؟ شکر کے معنی یہ ہیں کہ یہ نعمت جو مجھے ملی، میں اس کے لائق نہیں تھا، میں اس کا مستحق تو نہیں تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے دی ہے، اس کا شکر و احسان ہے۔

## قرض اور قرض کی ادائیگی پر شکر کا موقع نہیں:

شکر کب کیا جاتا ہے؟ اگر کوئی شخص اپنا فریضہ ادا کرے یا قرضہ ادا کرے، تو کیا قرض خواہ کے ذمے شکر ادا کرنا واجب ہے؟ نہیں، مثلاً ایک آدمی مجھ سے ایک ہزار روپے قرض لے گیا، اور یہ کہا کہ دو مہینے بعد واپس کروں گا، یہ احسان تو میں نے کیا، کہ میں نے ایک ہزار روپے بطور قرض دیئے، اس کو چاہیے کہ میرا شکریہ ادا کرے، پھر جب دو ماہ بعد وہ ایک ہزار روپے مجھے واپس لاکر دے گا، تب بھی احسان دینے والے کا ہے کہ میں نے ایک ہزار روپے دیئے تھے اور دو ماہ تک اس ہزار روپے سے اپنے آپ کو محروم رکھا، لہٰذا وہ قرضدار جب واپس لاکر دے رہا ہے، تو وہ کوئی احسان نہیں کر رہا ہے، لہٰذا وہ شکریہ کا مستحق نہیں سمجھا جائے گا۔

## اضافی کام پر شکر کا موقع ہے:

شکریہ اس وقت ادا کیا جاتا ہے، جب آدمی اپنے فریضہ سے زیادہ کام کرے، مثلاً ایک ہزار روپے دوسرے کے ذمے واجب تھے، واپس کرتے وقت اس نے ایک ہزار کے بجائے بارہ سو روپے اپنی طرف سے خوش دلی سے واپس کردیئے، چونکہ اس نے زیادہ دے کر احسان کیا، لہٰذا اس کا شکریہ واجب ہے، جب انسان اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذمے یہ کام ضروری اور واجب نہیں تھا اور میں اس کا مستحق تو نہیں تھا، لیکن اللہ جل جلالہ نے محض اپنے فضل و کرم سے مجھے یہ نعمت عطا فرمائی، لہٰذا شکر کے اندر خود یہ اعتراف پنہاں ہے کہ میں اس کے لائق نہیں تھا اور جو شخص لائق نہ ہونے کا اعتراف کرے، کیا وہ تکبر میں مبتلا ہوسکتا ہے؟ نہیں ہوسکتا، اس لیے جب بھی اللہ تعالیٰ کی کوئی نعمت ملے، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، انشاء اللہ تکبر کی جڑ کٹتی جائے گی۔

## شکر گزار پر شیطان کا داؤ نہیں چلتا:

ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ جب شیطان راندہ درگاہ ہوگیا اور اس نے اللہ تعالیٰ سے کہا:

﴿ثُمَّ لَاٰتِیَنَّهُمْ مِنْ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَیْمَانِهِمْ وَعَنْ

شَمَائِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شَاكِرِيْنَ﴾ (سورہ الاعراف آیت ۱۷)

چونکہ ابن آدم نے مجھے تباہ کیا ہے، اس لیے میں اس کا بدلہ لینے کے لیے، اس کے پاس دائیں طرف سے آؤں گا، بائیں طرف سے آؤں گا، آگے سے آؤں گا، پیچھے سے آؤں گا اور ابن آدم کو گمراہ کروں گا۔ (آخر میں کہتا ہے کہ) آپ ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہیں پائیں گے۔ ہمارے حضرت والا فرماتے ہیں کہ شیطان چونکہ بڑا خرانٹ ہے، اس کو یہ معلوم ہے کہ جو آدمی شکر کرنے والا ہوگا، اس کے سامنے میری نہیں چلے گی، اس پر میرا داؤ نہیں چلے گا، اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والا ہو، اس پر شیطان کا داؤ نہیں چلتا۔

## عین پریشانی میں بھی نعمتوں کو یاد کرو:

لہذا اللہ تعالیٰ کی جو نعمت حاصل ہو، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اور ایک وقت میں صرف ایک نعمت نہیں ہے، بلکہ ہر لمحے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی بارش برس رہی ہے۔

﴿وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾ (سورۃ ابراہیم آیت ۳۴)

اگر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو گے، تو شمار نہیں کر سکو گے۔

انسان چونکہ ناشکرا ہے، اس لیے اگر ذرا سی تکلیف پہنچ جاتی ہے، یا پریشانی آجاتی ہے، تو اس کو ہر وقت گاتا رہتا ہے اور عین اس تکلیف اور پریشانی کے وقت میں اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں متوجہ اور مبذول ہیں، ان کا کوئی ذکر نہیں، ان کی طرف ذرا سا دھیان نہیں، ورنہ عین تکلیف اور پریشانی کے وقت بھی اللہ تعالیٰ کی اتنی نعمتیں ہماری طرف متوجہ ہوتی ہیں کہ ہم ان کا شمار نہیں کر سکتے۔

## اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے شکر کا ایک انوکھا انداز:

ہمارے ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک نانا تھے، حضرت والا کی تربیت میں ان کا بڑا دخل رہا ہے، بڑے فاضل اور بزرگوں کے صحبت یافتہ تھے، حضرت فرمایا کرتے تھے کہ میں بچپن میں رات کو سوتے وقت ان کو دیکھتا تھا، تو مجھے عجیب نظر آتا تھا، وہ یہ کہ میرے نانا رات کو سونے کے وقت بستر پر بیٹھ جاتے اور بڑے والہانہ انداز میں پڑھنا شروع کر دیتے

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ. اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ. اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ.

مسلسل جھوم جھوم کر کافی دیر تک یہ پڑھتے رہتے، جب میں نے کچھ ہوش سنبھالا، تو میں نے ایک دن ان سے پوچھا کہ یہ رات کو سونے سے پہلے آپ کیا کرتے ہیں؟ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ بات دراصل یہ ہے کہ سارا دن تو غفلت میں گزر جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں ہوتا، اس لیے میں رات کو سونے سے پہلے بستر پر اللہ تعالیٰ کی ایک ایک نعمت کا تصور کر کے اس پر شکر ادا کرتا ہوں

یا اللہ آپ نے یہ مکان عطا فرمایا: اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ

آپ نے صحت عطا فرمائی: اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ.

آپ نے رزق عطا فرمایا: اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ.

آپ نے یہ آرم دہ بستر عطا فرمایا: اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ.

آپ نے عافیت عطا فرمائی: اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ.

آپ نے بیوی عطا فرمائی: اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ.

آپ نے بچے عطا فرمائے: اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ.

ایک ایک نعمت کا تصور کر کے اس پر شکر ادا کرتا ہوں، تاکہ ان نعمتوں کے شکر کا ہزاروں یا لاکھواں حصہ زبان سے ادا ہو جائے۔



## سونے سے پہلے نعمتوں کا شکر ادا کرلو:

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ تم بھی ایسا ہی کیا کرو، رات کو سونے سے پہلے تمام نعمتوں کا شکر ادا کیا کرو، ذرا سا دھیان کرو گے، تو سینکڑوں نعمتوں کا استحضار ہو جائے گا، ارے صرف ایک نعمت کو سوچنا شروع کرو گے، تو وہ بھی اتنی زیادہ نظر آئے گی کہ ساری عمر بھی سجدے میں پڑے رہو گے، تب بھی اس ایک نعمت کا شکر ادا نہیں ہوگا، یہ دو آنکھیں اللہ تعالیٰ نے دی ہیں، ایک آنکھ کو لے لو اور اس کے بارے میں سوچو کہ یہ کیسی نعمت ہے؟ ذرا سا اس میں بال آجائے، تب اندازہ ہوگا کہ کیسی نعمت ہے، اسی ایک نعمت کو سوچنا شروع کرو گے، تو حق شکر ادا نہیں ہو سکے گا۔

## تکبر سے بچنے کا ایک چٹکلہ:

ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے، میاں یہ تکبر بڑی خراب چیز ہے، بڑے بڑے معالجوں کو چکر دے دیتی ہے، اس کا علاج کرنا آسان کام نہیں ہے، لیکن میں تمہیں ایک چٹکلہ بتا دیتا ہوں، اس چٹکلے پر عمل کرلو، تو انشاء اللہ پھر اس تکبر کی بیماری میں مبتلا ہی نہ ہوگے اور اگر ہو گئے تو انشاء اللہ تعالیٰ نکل جاؤ گے، وہ چٹکلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر ادا کرنے کی عادت ڈالو، ہر وقت، ہر لمحے، چلتے، پھرتے، اٹھتے، بیٹھتے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے شکر کی رٹ لگاؤ، موسم اچھا ہے۔: اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ. ۔ ہوا چل رہی ہے: اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ.

جو اچھی بات سامنے آئے اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی عادت ڈالو، جتنا جتنا شکر ادا کرو گے، انشاء اللہ تکبر سے اتنی ہی حفاظت رہے گی۔ کہنے کو تو یہ چھوٹا سا چٹکلہ ہے، لیکن حقیقت میں یہ بڑے کانٹے کی بات ہے اور عمل کرنا بھی اس پر مشکل نہیں، صرف دھیان کرنے اور مشق کرنے کی بات ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

باب پنجم کا دوسرا بیان:

# کبر کی اقسام

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ. وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ. وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ. وَعَلٰی آلِهِ وَاَصْحَابِهِ اَجْمَعِیْنَ. اَمَّا بَعْدُ

## کبر کی اقسام:

فرمایا کہ

> اقسام کبر کے اس کثرت سے ہیں لا تعد ولا تحصیٰ اور اکثر ان میں ادق اور اغمض اس قدر ہیں کہ بجز محقق کے کسی کی بھی نظر وہاں نہیں پہنچتی۔ اور اس میں علماء ظاہر کو بھی اس محقق کی تقلید بلا تفحص حقیقت کرنا پڑتی ہے۔ (انفاس عیسیٰ:۱)



جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ یہ کبر کی بیماری ایسی ہے کہ خود بیمار کو پتہ نہیں ہوتا، کہ میں اس بیماری میں مبتلا ہوں اور کبر کی بعض قسمیں اتنی دقیق اور باریک ہیں، کہ اکثر اوقات بیمار کو اس کا پتہ نہیں چلتا، شیخ جو محقق بھی ہو، وہی پتا لگاتا ہے کہ اس کو یہ بیماری ہے یا نہیں؟ اور اس بیماری کا علاج کیا ہے؟

## کبر کے مختلف علاج:

ایک مثال کے ذریعہ اس کو سمجھئے، وہ یہ کہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کے یہاں یہ معمول تھا کہ جب کوئی شخص اپنی اصلاح کرانے کے لیے آتا، تو ''کبر'' کا علاج سب سے پہلے کیا جاتا تھا، حضرت والا مختلف لوگوں کے لیے مختلف علاج تجویز فرمایا کرتے تھے، مثلاً کسی کو دیکھا کہ اس کے اندر ''تکبر'' ہے، تو آپ نے اس سے فرمایا کہ تم ہر نماز کے بعد مسجد میں یہ اعلان کیا کرو کہ بھائیو! میرے اندر تکبر کی بیماری ہے، میرے لیے دعا کرو، کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس سے نجات عطا فرمائے، اب ظاہر ہے کہ ایک متکبر آدمی جس کے دل

میں تکبر اور بڑائی ہے، اس کو جب بھرے مجمع میں یہ اعلان کرنا پڑے، کہ میرے اندر تکبر ہے، تو اس اعلاج کے نتیجے میں اس کے دل پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے، لیکن جب شیخ کے حکم سے کرتا ہے، تو دل پر اتنی زور سے ضرب پڑتی ہے کہ وہ سارا تکبر ختم ہو جاتا ہے۔

یا مثلاً کسی متکبر کے لیے یہ علاج تجویز کیا، کہ تم نمازیوں کے جوتے سیدھے کیا کرو، ہر ایک کو مختلف علاج بتائے، کیونکہ ہر آدمی کے لیے ایک علاج نہیں ہوتا، چونکہ بیماریاں مختلف ہوتی ہیں، ان کے انداز مختلف ہوتے ہیں، اسباب مختلف ہوتے ہیں، حالات مختلف ہوتے ہیں، اس لیے ایسا نہیں ہے کہ ایک علاج سب کے لیے تجویز کر دو، جیسے حکیم صاحب نے ایک ہی جوشاندہ سب کے لیے تجویز کر دیا، یا کوئی شخص یہ سوچے کہ چونکہ حضرت والا نے فلاں شخص کو فلاں بیماری میں یہ علاج تجویز کیا تھا، لہٰذا میں بھی وہی علاج کرلوں، یہ ٹھیک نہیں ہے، بلکہ شیخ دیکھتا ہے کہ اس کے لیے کیا مناسب ہے۔

## خود اپنا علاج کرنا نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے:

ایک صاحب نے یہ دیکھا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فلاں شخص کو یہ علاج بتایا ہے کہ تم نمازیوں کے جوتے سیدھے کیا کرو، اب بجائے اس کے کہ اپنے علاج کے لیے خود رجوع کرتے اور اپنے لئے علاج تجویز کراتے، ان صاحب کو دیکھ کر خود اپنا علاج شروع کر دیا اور نمازیوں کے جوتے سیدھے کرنے شروع کر دیئے، حضرت کو پتہ چلا کہ فلاں صاحب نے خود سے یہ کام شروع کر دیا ہے، آپ نے اس کو بلایا اور اس سے فرمایا کہ اس طرح علاج نہیں ہوا کرتا اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ تمہارے اس طرح لوگوں کے جوتے سیدھے کرنے سے تمہارے تکبر میں اور زیادہ اضافہ ہوگا، اس تکبر میں کمی نہیں ہوگی، اس لیے کہ دماغ میں شیطان یہ بات بٹھائے گا کہ دیکھ تو کتنا متواضع ہے، لہٰذا یہ نہیں ہوسکتا کہ آدمی خود اپنے تکبر کا علاج کرنے بیٹھ جائے، بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جس کو یہ علم عطا کیا ہو، وہی یہ کام کرسکتا ہے۔

## شیخ کے ہاں رگڑے کھانے سے گوہر بنتا ہے:

عام طور پر یہ علم عطا نہیں ہوتا، جب تک اس نے اپنے آپ کو پامال نہ کیا ہو، شیخ تھوڑے

رگڑے دیتا ہے، اس رگڑے کھانے کے نتیجے میں وہ کبر دل سے نکلتا ہے اور اس وقت حقیقت کھلتی ہے کہ کس کبر کا کیسے علاج کیا جائے؟ ہمارے یہ جتنے بزرگ جن کا نام لے کر ہم زندہ ہیں، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوھی رحمتہ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمتہ اللہ علیہ، یہ حضرات رگڑے کھائے ہوئے تھے، ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا، جو خود ساختہ پیر بن کر بیٹھ گیا ہو، بلکہ ان سب نے رگڑے کھائے تھے۔

## حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی بیعت کا واقعہ:

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہ جب نئے نئے درس نظامی سے فارغ ہوئے، اور عالم بن گئے، جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ علم تکبر پیدا کرنے کا بہت بڑا ذریعہ ہوتا ہے، اس لیے کہ عالم بننے کے بعد دماغ میں یہ بات آجاتی ہے کہ میں نے بہت کچھ پڑھ لیا ہے، مجھے بہت کچھ آتا ہے، بہر حال حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ یہ ہمارے تمہارے جیسے عالم نہیں تھے کہ بس کچے پکے پڑھ کر عالم بن گئے، بلکہ ان کی استعداد بڑی پختہ تھی، اس وقت تھانہ بھون کی خانقاہ میں تین بزرگ بیٹھے تھے، ایک حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی رحمتہ اللہ علیہ، دوسرے حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمتہ اللہ اور تیسرے حضرت حافظ ضامن شہید رحمتہ اللہ علیہ، ان کو "اقطاب ثلاثہ" کہا جاتا ہے، یہ تین اولیاء اللہ خانقاہ میں بیٹھے ہوئے تھے، ان میں سے حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی صاحب رحمتہ اللہ علیہ عالم تھے، ان کا ایک رسالہ حضرت گنگوھی رحمتہ اللہ علیہ کی نظر سے گزرا، اس رسالے میں کوئی ایسی بات لکھی ہوئی تھی، جو علمی طور پر حضرت گنگوہی صاحب کو صحیح معلوم نہیں ہو رہی تھی، چنانچہ انہوں نے ارادہ کیا کہ حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی صاحب سے اس مسئلہ پر مناظرہ کروں، چنانچہ مناظرہ کی نیت سے گنگوہ سے تھانہ بھون کی طرف روانہ ہوئے۔

جب تھانہ بھون پہنچے، تو چونکہ پہلے حضرت حاجی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا کمرہ تھا اور حضرت حاجی صاحب سے پہلے سے شناسائی تھی، اس لیے سلام کرنے کے لیے حاجی صاحب کے پاس رکے، حضرت حاجی صاحب نے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ کہا کہ شیخ محمد تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کے پاس جا رہا ہوں، کیوں جا رہے ہو؟ ان سے مناظرہ کرنا ہے، توبہ توبہ وہ

اتنے بڑے عالم اور تم ابھی نئے نئے فارغ ہوئے ہو اور ابھی ابھی مولوی بنے ہو اور اتنے بڑے عالم سے مناظرہ کرنے جارہے ہو، جو اللہ والے بھی ہیں، حضرت گنگوہی نے عرض کیا کہ حضرت انہوں نے ایک رسالے کے اندر ایسی غلط بات لکھ دی ہے، حضرت حاجی صاحب نے حضرت مولانا کو ٹھنڈا کیا اور اسی ٹھنڈا کرنے میں اللہ تعالیٰ نے ان کی کایا پلٹ دی، حاجی صاحب کی ان پر ایسی نظر پڑی کہ مناظرہ کرنے کا جو ارادہ تھا، وہ ختم کر دیا اور وہیں حضرت حاجی صاحب سے بیعت ہو گئے۔

پھر چالیس دن وہاں رہے، حالانکہ جب گنگوہ سے چلے تھے، تو اس خیال سے چلے تھے کہ تھوڑی دیر بعد واپس آجاؤں گا، اس لیے کوئی کپڑے وغیرہ بھی ساتھ نہیں لیے تھے، بلکہ جو جوڑا پہن کر آئے تھے، اسی کو دھو کر سکھا کر دوبارہ پہن لیتے، اس طرح چالیس دن وہاں گزار دیئے، اس قیام کے دوران حضرت حاجی صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے خوب رگڑے کھلائے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب چالیس دن کے بعد واپس جانے لگے، تو حضرت حاجی صاحب نے ان سے فرمایا کہ ''میاں رشید احمد! جو کچھ میرے پاس امانت تھی، وہ ساری میں نے تمہارے حوالے کر دی''

یہ کوئی معمولی مقام ہے کہ شیخ یہ کہے کہ جو کچھ میرے پاس تھا، وہ سب کچھ میں نے چالیس دن میں تمہیں دے دیا، اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ مقام عطا فرمایا تھا۔

## حضرت گنگوہیؒ کی عجیب حالت:

پھر جب آپ واپس گنگوہ پہنچے، تو ایک عرصے تک عجیب استغراق کی حالت طاری رہی، حتی کہ بہت عرصے تک حضرت حاجی صاحب کو خط بھی نہیں لکھا، تو حضرت حاجی صاحب نے خود خط لکھا کہ مدت سے آں عزیز کی خیریت معلوم نہیں ہوئی کہ کس حالت میں ہیں، خط کے ذریعہ اپنے حالات سے مطلع کریں۔

اب دیکھئے! یہ خط شیخ اپنے مرید کو لکھ رہا ہے، جواب میں حضرت گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ نے لکھا کہ ''حضرت بہت دن سے خط نہیں لکھ سکا، کوتاہی رہی، لیکن اس لیے نہیں لکھا کہ اپنی حالت لکھتے ہوئے شرم معلوم ہوتی تھی کہ کیا اپنا حال لکھوں، آپ سے تعلق بھی ہو گیا، اس کے باوجود اپنی بے حالی کو کیا لکھوں؟ اس لیے شرم معلوم ہوتی تھی، البتہ آپ کی دعاؤں اور توجہ

سے اتنا فرق ضرور معلوم ہوتا ہے کہ

۱)......شریعت طبیعت بن گئی ہے۔

یعنی جس طرح انسان کے اندر طبعی تقاضے بھوک اور پیاس کے ہوتے ہیں اور جب تک انسان ان تقاضوں کو پورا نہ کرلے، انسان کو اس وقت تک چین نہیں آتا، اسی طرح شریعت کے تقاضوں پر جب تک عمل نہ کرلوں، اس وقت تک چین نہیں آتا۔

۲)...... مادح اور ذام یکساں ہو گئے ہیں۔

یعنی تعریف کرنے والا اور برائی کرنے والا دونوں برابر ہو گئے ہیں، کوئی تعریف کرے تو اور کوئی برائی کرے تو دونوں کے اندر کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا، کہ یہ تعریف کررہا ہے اور یہ برائی کررہا ہے، نہ تعریف سے طبیعت میں کوئی حرکت پیدا ہوتی ہے اور نہ برائی سے طبیعت میں کوئی تغیر آتا ہے۔

۳)...... کسی مسئلہ شرعی میں کوئی اشکال باقی نہیں رہا۔

جب خط تھانہ بھون میں حضرت حاجی صاحب کے پاس پہنچا، تو آپ نے وہ خط اپنے سر پر رکھ لیا اور فرمایا کہ یہ حال جو انہوں نے لکھا ہے، یہ تو اب تک ہمیں بھی حاصل نہیں ہوا بہر حال یہ کیسے شیخ اور کیسے مرید تھے! یہ ایسے ہی نہیں بن جاتے، بلکہ کچھ رگڑے کھانے پڑتے ہیں۔



## حضرت گنگوہی کا ایک اور واقعہ:

انہی چالیس دن کے قیام کے دوران یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک دن حضرت حاجی صاحب نے اپنے مرید حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو بلایا کہ آج تم ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ، چنانچہ کھانے کے وقت تشریف لے آئے، دستر خوان پر سالن کے دو پیالے تھے، ایک میں کوفتے ، ایک میں دال تھی، حضرت حاجی صاحب نے کوفتے کے سالن کا پیالہ اپنے پاس رکھا اور دال کا پیالہ ان کے سامنے رکھ دیا اور اشارہ اس طرف کر دیا کہ دال تم کھاؤ، کوفتے ہم کھائیں گے، کھانے کے دوران حضرت حافظ ضامن شہید رحمتہ اللہ علیہ پہنچ گئے، حافظ صاحب نے فرمایا کہ:

حضرت یہ کیا آپ کررہے ہیں کہ خود تو کوفتے کھارہے ہیں اور اس کو دال کھلا رہے

ہیں؟ حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا کہ: ارے! یہ تو میرا احسان ہے کہ اس کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلا رہا ہوں، حق تو یہ تھا کہ روٹی پر دال رکھ کر ہاتھ میں دے دیتا کہ باہر سیڑھیوں پر بیٹھ کر کھالے۔

یہ الفاظ کہنے کے بعد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے چہرے کی طرف دیکھا کہ اس بات سے ان کے چہرے پر کوئی تغیر آیا یا نہیں؟ دیکھا کہ کوئی تغیر نہیں آیا، معلوم ہوا کہ الحمد للہ کبر کی بیماری نکل گئی ہے، بہر حال اس طرح رگڑے دیئے جاتے ہیں، تب جا کر علاج ہوتا ہے، ہر ایک کے بس کا کام نہیں، وہ اپنے بارے میں خود فیصلہ کر لے کہ میرا کیا علاج ہے؟

## شیخ سے پہلے بیماری کی تشخیص اور پھر علاج تجویز کراؤ:

ایک صاحب حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے پاس آیا کرتے تھے، وہ اپنا علاج خود تجویز کرلیا کرتے تھے، خود ہی فیصلہ کرلیا کہ میرے اندر تکبر کی بیماری ہے اور پھر خود ہی اپنا علاج تجویز کرلیا، ایک مرتبہ حضرت والد صاحب نے ان کو پکڑلیا اور فرمایا کہ اس طریقے سے تمہارا نفس اور زیادہ موٹا ہورہا ہے اور تمہارے اندر اور زیادہ تکبر بڑھ رہا ہے، اس لیے حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ فرمارہے ہیں کہ اس تکبر کی بے شمار قسمیں ہیں، ہر ایک کا حکم الگ ہے، ہر ایک کا علاج الگ ہے، اس لیے اس کے علاج کے لیے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے، کہ اپنے آپ کو کسی شیخ کے حوالے کردو، وہ شیخ پہلے یہ دیکھے گا کہ تکبر ہے یا نہیں؟ کیونکہ بعض اوقات حقیقت میں تکبر نہیں ہوتا، بلکہ تکبر کا شبہ اور دھوکہ ہوتا ہے، بعض اوقات تکبر ہوتا ہے، مگر اسے تکبر نہیں سمجھا جاتا، اس لیے شیخ پہلے تشخیص کرے گا کہ اس کے اندر تکبر ہے یا نہیں؟ تشخیص کرنے کے بعد وہی اس کا علاج بھی تجویز کرے گا۔

## طالب علم کا خاموش ہونا اور مرید کا چوں چرا کرنا درست نہیں:

حتیٰ کہ جو شخص بظاہر عالم اور فارغ التحصیل ہے، قرآن وحدیث اور فقہ وتفسیر سب کچھ پڑھا ہوا ہے، بظاہر تو وہ سب کچھ جانتا ہے، لیکن ایسے عالم کو بھی شیخ محقق کی تقلید محض کرنی پڑتی ہے، جب شیخ یہ کہہ دے کہ تمہارے اندر کبر ہے، تو سمجھ لے کہ ہاں میرے اندر کبر ہے اور پھر اس کا علاج کرائے، چوں وچرا کی گنجائش نہیں، اگر چوں چرا کرے گا تو مارا جائے گا۔ کسی

نے خوب کہا ہے کہ

تِلْمِیْذِیْ کِہْ چُوْنْ وَچِرَا نَکُنَدْ . مُرِیْدِیْ کِہْ چُوْنْ چِرَا کُنَدْ ھَرْ دُوْ رَا بِصَحْرَا بَایَدْ فَرِسْتَادْ

یعنی وہ شاگرد جو علم ظاہر حاصل کر رہا ہے، اگر وہ چوں چرا نہ کرے، اس کو باہر نکال دو، وہ شاگرد بننے کے لائق نہیں، اس کا کام ہی یہ ہے کہ سمجھنے کے لیے سوال کرے، جو شبہ پیدا ہو جائے، اسے پیش کرے اور جو شخص کسی شیخ کا مرید ہو، وہ چوں چرا کرے کہ یہ آپ نے کیوں کیا؟ ایسا کیوں کیا؟ ایسے مرید کو جنگل میں بھیج دینا چاہیے، وہ مرید بنائے جانے کے قابل نہیں، لہٰذا شاگرد کا وظیفہ یہ ہے کہ چون وچرا کرے اور سوال کرے، جو شاگرد سبق میں خاموش بیٹھا ہے اور کبھی کچھ پوچھتا ہی نہیں، وہ احمق ہے، وہ سبق کا حق ادا نہیں کر رہا، مرید کا کام یہ ہے کہ وہ خاموش بیٹھے، وہ چون وچرا نہ کرے، وہ اگر چوں وچرا کرتا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اندر خرابی ہے۔

لہٰذا جو عالم ظاہر ہو، اس کو اس بات کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے کہ وہ بلاچوں چرا شیخ کی بات کو تسلیم کرے، اس لیے کہ علم کے اندر خود رفعت کی شان موجود ہے، لہٰذا جس شخص کو کوئی علم حاصل ہو جاتا ہے، اس کے اندر خود بخود ترفع اور بڑائی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے، کہ میرے اندر یہ کمال حاصل ہوا، اس لیے اکثر و بیشتر علم کے ساتھ تکبر بھی آ جاتا ہے، جب تک اس کی تربیت نہ ہو اور رگڑے نہ کھائے۔

## ذکی کیفی مرحوم کا واقعہ:

میرے سب سے بڑے بھائی محمد ذکی کیفیؒ مرحوم تھے، جو شاعر بھی تھے، بچپن میں انہوں نے دارالعلوم دیوبند میں کافیہ اور شرح جامی تک کتابیں پڑھی تھیں، اس کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا تھا، پھر تجارت وغیرہ میں لگ گئے، ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ بھائی جان آپ نے تعلیم مکمل کیوں نہیں کی تھی؟ درمیان میں کیوں چھوڑ دیا تھا؟ جواب میں فرمایا کہ بڑے میاں نے ہمارا معاملہ ختم کر دیا تھا، بڑے میاں سے مراد حضرت میاں سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، جو میاں مرحوم کے نام سے مشہور تھے اور صاحب کشف وکرامات بزرگ تھے، میں نے پھر سوال کیا کہ کیا قصہ ہوا تھا؟ فرمانے لگے کہ ایک مرتبہ گھر سے دارالعلوم

دیوبند پڑھنے کے لیے جارہا تھا، راستے میں حضرت میاں صاحب کا مکان تھا اور حضرت میاں صاحب گھر میں تشریف فرما تھے، ہمارے والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی تربیت کا یہ اثر تھا کہ یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ میاں صاحب کے گھر کے پاس سے گزریں اور میاں صاحب سے سلام کر کے اور دعا کرا کے نہ جائیں، میں نے سوچا کہ حضرت میاں صاحب موجود ہیں، چلو ان کو سلام کر کے دعا کرالوں، پھر مدرسہ جاؤں، میاں صاحب اپنے پاس بادام وغیرہ بھی رکھا کرتے تھے، جب کوئی بچہ ان کے پاس ملاقات کے لیے آتا، تو اس کو بادام وغیرہ بھی دیا کرتے تھے۔

## علم تکبر پیدا کرتا ہے:

بہر حال میں ان کے پاس گیا اور جا کر سلام کیا، حضرت میاں صاحب نے جواب دیا، پھر میں نے دعا کی درخواست کی، حضرت میرے لیے دعا فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے علم عطا فرمادے، بڑے میاں نے جواب دیا، نا بھائی! علم بڑی خراب چیز ہے، میں تمہارے واسطے دعا نہیں کرتا، میں بڑا پریشان ہوگیا کہ یا اللہ یہ فرما رہے ہیں کہ کہ علم بڑی خراب چیز ہے، پھر اپنے بارے میں فرمانے لگے کہ میاں صاحب پہلے دارالعلوم میں مولسری کے درخت کے نیچے پھٹی پرانی چٹائی پر بیٹھا کرتا تھا اور اب چوکی پر بیٹھ کر پڑھاتا ہے اور اب میاں صاحب سے کہو کہ نیچے بیٹھ کر پڑھا دو، تو میاں صاحب کے مزاج میں فرق آجاتا ہے، میاں علم تو تکبر پیدا کرتا ہے، اس واسطے میں تمہارے واسطے علم کی دعا نہیں کرتا، بھائی جان کہتے ہیں کہ مجھے اسی دن خطرہ ہوگیا تھا، کہ بڑے میاں نے ہمارا تو پتہ ہی صاف کر دیا، اب یہ علم پورا ہونے والا نہیں، بہر حال وہ تو صاحب کشف وکرامات بزرگ تھے، اللہ تعالیٰ نے ان پر منکشف فرمایا ہوگا کہ اس علم کی تکمیل ان کے حق میں مقدر نہیں، اس لیے مناسب طریقے سے بچے کو بتا دیا۔

لیکن بات جو ارشاد فرمائی وہ یہ تھی کہ علم تکبر پیدا کرتا ہے، لہٰذا اگر علم کی وجہ سے تکبر پیدا ہوگیا، تو پھر اس علم سے ہزار درجہ بہتر یہ ہے کہ آدمی جاہل رہتا اور ایک ان پڑھ دیہاتی کی طرح زندگی گزارتا، تو کم از کم اللہ تعالیٰ کے یہاں جا کر علم کے اس تکبر اور بڑائی کا عذاب نہ ہوتا، اس لیے علم کے ساتھ اکثر وبیشتر یہ چیز جمع ہو جاتی ہے اور اس کا حل اس کے علاوہ کوئی اور نہیں کہ اپنی لگام کسی کے حوالے کرے، وہ یہ دیکھے کہ کیا بیماریاں اس کے اندر پیدا

ہو رہی ہیں، اور جو بیماریاں پیدا ہو رہی ہیں، ان کا علاج کرے۔

## عالم کو اصلاح کی زیادہ ضرورت ہے:

ہمارے والد صاحب رحمۃ اللہ فرمایا کرتے تھے، یہ علم دو دھاری تلوار ہے، اگر اللہ تعالیٰ اس علم میں نور عطا فرمادے، اس میں برکت عطا فرمادے، تو اس کو نافع بنادے، تو سبحان اللہ یہ علم کیا عجیب وغریب چیز ہے، لیکن اگر خدانخواستہ اس علم میں نور اور برکت نہ ہو، اس میں نافعیت نہ ہو اور یہ انسان کو کبر اور گھمنڈ میں مبتلا کردے، تو پھر اس علم سے زیادہ مہلک چیز کوئی بھی نہیں ہے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جتنی مرغن اور شاندار اور مزیدار غذا ہوتی ہے، سڑنے کے بعد وہ اتنی ہی زیادہ بدبودار بن جاتی ہے، اگر معمولی غذا ہے جس میں روغن نہیں ہے، اس کے سڑنے سے تھوڑی بہت بدبو پیدا ہوگی، لیکن مرغن غذا سڑنے کے بعد سارے محلے کو متعفن کردے گی، اسی طرح جتنے اونچے سے انسان گرتا ہے، اتنی ہی زیادہ چوٹ لگتی ہے، اسی طرح یہ علم اگرچہ اعلیٰ درجے کی چیز ہے، لیکن اگر یہ خراب ہوجائے اور انسان کو تکبر اور گھمنڈ میں مبتلا کردے، تو یہ علم انسان کے لیے اتنا ہی مہلک ہے، اس کے لیے خاص طور پر عالم کو اس بات کی زیادہ ضرورت ہے کہ وہ کسی سے اپنی اصلاح کرائے۔

## حب جاہ اور تکبر کی منڈی ''مولوی صاحبان'' ہیں:

میں نے اپنے والد ماجد قدس اللہ سرہ سے سنا کہ کسی شخص نے خواب میں شیطان کو دیکھا کہ وہ بہت ساری گٹھریاں اپنی کمر پر اٹھائے لے جارہا ہے، جیسے بنجارہ ایک شہر سے دوسرے شہر سامان اٹھا کر لے جاتا ہے اور بیچتا ہے، اسی طرح وہ بھی سامان لے جارہا ہے، اب گٹھریوں کو دیکھا، تو کسی گٹھری میں پاخانہ بھرا ہوا ہے، کسی میں لید، کسی میں گوبر اور کسی میں پیشاب بھرا ہوا ہے، اس نے شیطان سے پوچھا کہ یہ سب کیا ہے؟ شیطان نے ایک گٹھری کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ یہ تکبر ہے، دوسری گٹھری کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ یہ حب جاہ ہے، کسی کی طرف اشارہ کرکے کہا یہ حسد ہے، وغیرہ۔ لیکن یہ سب چیزیں نجاستوں کی شکل میں تھیں، ان صاحب نے پھر شیطان سے پوچھا کہ ان کو کہاں لے جارہا ہے؟ شیطان نے

جواب دیا کہ ان کو لے جا کر فروخت کروں گا، ان صاحب نے پھر پوچھا کہ پیسے دے کر تجھ سے یہ نجاستیں کون خریدے گا؟ شیطان نے جواب دیا کہ اپنے مال کی منڈی میں جانتا ہوں اور اس کے گاہک اور خریداروں کو میں جانتا ہوں، یہ تکبر اور حب جاہ یہ دونجاستیں میں مولویوں کے پاس جا کر بیچوں گا، وہ ان دونوں کے بڑے شوقین ہیں، ان کو ان دونوں کے کھانے میں بڑا مزہ آتا ہے، حب جاہ کا کیا مطلب ہے؟ حب جاہ کے معنی ہیں شہرت کہ لوگ میرے آگے جھکیں، لوگ میرے معتقد بنیں، لوگ میری تعریف کریں، میری شہرت ہو، یہ سب حب جاہ ہے، حب جاہ کو بیچنے کی سب سے بہترین منڈی ''مولوی صاحبان'' ہیں وہاں جا کر اس کو بیچوں گا، وہ خوب مزے لے کر اس کو کھائیں گے۔

## ''ہم بھی کچھ ہیں'' کا خیال نقصان دہ ہے:

بہر حال یہ علم ایک تو بذات خود فی نفسہ طالب علو ہے، اس لیے صاحب علم کے اندر تکبر پیدا کرتا ہے، دوسری آفت اس علم میں یہ ہے کہ لوگ حامل علم دین کی عزت کرتے ہیں، کوئی اس کے ہاتھ چوم رہا ہے، کوئی اس کے پاؤں چوم رہا ہے، کوئی اس کے لیے عزت سے کھڑا ہو رہا ہے، کوئی اس کے لیے ہدیہ لا رہا ہے، کوئی دعوت کر رہا ہے، ان افعال کے نتیجے میں وہ حامل علم اپنے بارے میں یہ سمجھنے لگتا ہے کہ ہم بھی کچھ ہیں، یہ اتنی ساری مخلوق جو ہماری عزت کر رہی ہے، ہمارے پیچھے پھر رہی ہے، آخر کچھ تو ہمارے اندر کمال ہوگا۔



## اشعب طماع کا واقعہ اور مولوی کے تکبر کا فلسفہ:

چنانچہ اہل علم کی ایک مثال دیتے ہوئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ''اشعب طماع'' ایک بہت لالچی انسان تھا، ایک مرتبہ راستے سے گزر رہا تھا، بچے اس کو چھیڑنے کے لیے اس کے پیچھے لگ گئے، ان بچوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے اس نے بچوں سے کہا کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ فلاں جگہ جاؤ، وہاں مٹھائی تقسیم ہو رہی ہے، چنانچہ بچے اس طرح بھاگے، تو خود بھی بچوں کے پیچھے بھاگنے لگا، لوگوں نے پوچھا کہ تم کیوں بھاگ رہے ہو؟ اس نے کہا کہ سب بچے بھاگ رہے ہیں، تو ضرور مٹھائی تقسیم ہو رہی ہو گی، ہماری مثال بھی ایسی ہے کہ پہلے اپنے علم کے ذریعہ مخلوق کو دھوکہ دیا، اس دھوکہ دینے کے

نتیجے میں جب مخلوق ہماری معتقد ہوگئی، اب کوئی ہاتھ چوم رہا ہے، کوئی دعوت کر رہا ہے، کوئی ہدیہ لا رہا ہے، کوئی علامہ کا لقب دے رہا ہے، تو اب دماغ میں یہ خیال آیا کہ جب اتنی ساری مخلوق ہمارے پیچھے چل رہی ہے اور ہماری معتقد ہو رہی ہے، تو ہمارے اندر ضرور کوئی وصف ہوگا، جس کی وجہ سے یہ ساری مخلوق ہماری معتقد ہو رہی ہے۔

زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھو

اس کے نتیجے میں وہ عالم اور زیادہ تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

## تکبر کا علاج:

لہذا جو حضرات علم دین سے وابستہ ہیں، یا جن کو اللہ تعالیٰ نے کوئی اور وصف عطا فرمایا ہے، ان کو اس کی بہت زیادہ فکر رکھنے کی ضرورت ہے، کہ کہیں یہ بیماری پیدا نہ ہو جائے اور اگر پیدا ہو جائے، تو اس کا فوری علاج ضروری ہے، وہ علاج یہ ہے کہ اس علم پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کریں کہ یا اللہ میں اس علم کا مستحق نہیں تھا، پھر بھی آپ نے عطا فرما دیا، اے اللہ آپ کا شکر ہے اور اس بات کا استحضار کر لے کہ یہ علم ان کی عطا ہے اور وہ جب چاہیں، واپس لے لیں، میرا اس پر کنٹرول نہیں ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

﴿ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا ﴾

سب کچھ پہلے معلوم تھا، بعد میں سب رخصت ہو گیا اور اب کچھ بھی باقی نہیں، اگر انسان کے دماغ کا ذرا سا اسکرو ڈھیلا ہو جائے، تو ایک سیکنڈ کے اندر سارا علم، ساری معرفت، ساری تحقیقات سب ختم ہو جائیں، لہذا انسان کس بات پر اترائے؟ کس بات پر ناز کرے؟ کس بات پر اکڑے؟

## عالم اور شیخ کے درمیان فرق

اسی وجہ سے حضرت گنگوہی اور حضرت نانوتوی جو اپنے وقت میں علم کے پہاڑ تھے، لیکن اپنی اصلاح کے لیے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں گئے، جو ضابطے کے پورے عالم بھی نہیں تھے، لوگوں نے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ حضرت یہ کیا قصہ ہوا کہ الٹا معاملہ ہو گیا ان کو چاہیے تھا کہ وہ آپ کے پاس آتے، اس لیے

کہ آپ عالم ہیں، وہ عالم نہیں ہیں، لیکن آپ ان کے پاس چلے گئے۔

جواب میں حضرت نانا توی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہماری اور ان کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک شخص کو مٹھائی کے بارے میں پورا علم اور پوری تحقیق حاصل ہے، مثلاً اس کو گلاب جامن کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ

یہ سب سے پہلے کس نے ایجاد کی؟ اس کا موجد کون ہے؟

کہاں کہاں یہ متعارف ہوئی؟ کن ملکوں میں کھائی جاتی ہے؟

کن چیزوں سے اس کو بنایا جاتا ہے؟ اس کے اجزاء ترکیبی کیا کیا ہیں؟

اور اس کی کتنی قسمیں ہیں؟ اور اس کو کیسے پکایا جاتا ہے اور کیسے تلا جاتا ہے؟

اور اگر اس سے کہا جائے تو وہ گلاب جامن کے فضائل پر ایک تقریر کر دے اور ایک مقالہ لکھ دے لیکن اس سے پوچھا جائے کہ تم نے کبھی گلاب جامن کھائی ہے؟ تو وہ جواب میں کہے، میں نے کبھی نہیں کھائی، ایک دوسرا شخص ہے جس کو گلاب جامن کی تاریخ کے بارے میں کچھ پتہ نہیں کہ کس نے ایجاد کی؟ کون اس کا موجد ہے؟ کس طرح پکائی جاتی ہے؟ لیکن روزانہ صبح وشام گلاب جامن کھاتا ہے، پھر فرمایا کہ بتاؤ ان دونوں میں سے کون بہتر ہے؟ وہ بہتر ہے جس میں گلاب جامن پر مقالہ لکھنے کی صلاحیت ہے یا وہ بہتر ہے جو روزانہ صبح وشام گلاب جامن کھاتا ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ بہتر ہے جو روزانہ صبح وشام کھاتا ہے، اگرچہ اس کی تعریف بیان نہیں کرسکتا۔

پھر فرمایا کہ ہماری مثال اس شخص کی سی ہے، جس کو گلاب جامن کی پوری تاریخ معلوم ہے، اس کے لغوی اور اصطلاحی تعریف جانتا ہے، لیکن کھائی کبھی نہیں اور حاجی صاحب وہ ہیں، جو روزانہ کھاتے ہیں، جب ہم حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں گئے، تو ہم نے صرف گلاب جامن کی تاریخ ہی پڑھی تھی، انہوں نے گلاب جامن اٹھا کر ہمارے منہ میں رکھ دی کہ لو گلاب جامن کھالو۔ اس لیے ہم حاجی صاحب کی خدمت میں گئے تھے، بہر حال علم والے کو خاص طور پر اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ باطن کی اصلاح کرائے اور کسی شیخ سے تربیت حاصل کرے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

باب پنجم کا تیسرا بیان:

# کبر کا ایک اور علاج

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ . وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِیْمِ. وَعَلٰی آلِهِ وَاَصْحَابِهِ اَجْمَعِیْنَ . اَمَّا بَعْدُ

## کبر کا ایک اور علاج:

فرمایا کہ

> کبر کا ایک علاج یہ ہے کہ عظمت حق سبحانہ کو پیش نظر رکھے۔ جس موقع پر کبر کا اندیشہ ہو اس وقت تو ضرور ورنہ اور بھی بہتر یہ ہے کہ روزانہ ایک وقت اس کے لیے نکال لے۔''

کبر کا ایک علاج یہ ہے کہ انسان اللہ جلالہ کی عظمت کا استحضار کرے اور اس کے ساتھ اپنی بے وقعتی کا استحصار کرے، اس کے علاوہ ایک بزرگ کے جواب کا استحصار کرے، جو جواب ان بزرگ نے ایک متکبر کو دیا تھا ایک متکبر نے ان بزرگ سے کہا کہ جانتے نہیں ہم کون ہیں؟ ان بزرگ نے فرمایا کہ میں جانتا ہوں تو کون ہے؟ تیری حقیقت یہ ہے کہ

اَوَّلُکَ نُطْفَةٌ مَذِرَةٌ وَآخِرُکَ جِیْفَةٌ قَذِرَةٌ
وَاَنْتَ فِیْمَا بَیْنَ ذٰلِکَ تَحْمِلُ الْعَذِرَةَ

یعنی تیری ابتداء تو ایک گندہ نطفہ ہے اور تیری انتہاء بدبودار مردار پر ہونے والی ہے، تو ایسی حالت میں پہنچے والا ہے کہ تیرے عزیز واقارب اور رشتہ دار بھی تجھے اپنے پاس رکھنے کو تیار نہیں ہوں گے، بلکہ تجھے گھڑے میں پھینک آئیں گے، اس لیے کہ اگر تجھے اور زیادہ گھر میں رکھا گیا تو گھر میں بدبو پھیلا دے گا، لہذا تیری ابتداء اور انتہاء تو یہ ہے اور دونوں کے درمیان کا جو زمانہ ہے، اس میں تو ہر وقت نجاست اٹھا کر پھر رہا ہے۔

## انسان اپنی ابتداء وانتہاء سوچ لے تو تکبر نہیں آئیگا:

اللہ تعالٰی نے اس کھال کے ذریعہ پردہ پوشی فرما رکھی ہے، یہ کھال اگر کسی جگہ چھیل دی جائے، تو اندر سے گندگی برآمد ہو جائے گی، کہیں سے خون نکل آئے گا، کہیں سے پیپ نکل آئے گی، کہیں سے پیشاب نکل آئے گا، کہیں سے پاخانہ نکل آئے گا، پورے جسم میں گندگی ہی گندگی بھری ہوئی ہے، لیکن اللہ تعالٰی نے اس کھال کے ذریعہ پردہ پوشی فرما رکھی ہے، جس کی وجہ سے وہ نجاست نظر نہیں آتی، حضرت والا فرماتے ہیں جب کبھی تمہارے دل میں اپنی بڑائی کا احساس پیدا ہو، تو ذرا اس بات کو سوچ لیا کرو کہ میری ابتداء کہاں سے ہوئی؟ اور میرا انجام کیا ہوتا ہے؟

## قضاء حاجت کی حالت کا تصور تکبر ختم کرتا ہے:

حضرت فرماتے ہیں کہ ایک کارآمد نسخہ اور بتاتا ہوں وہ یہ کہ جب دل میں تکبر پیدا ہو، اس وقت اپنی اس حالت کا تصور کر لیا کرو، جب قضاء حاجت کے لیے بیٹھتے ہو، اس وقت کیا حالت ہوتی ہے؟ اور کیا شان ہوتی ہے؟ بس سارا تکبر دھرا رہ جائے گا اور پتہ چل جائے گا کہ میری حقیقت تو یہ ہے۔

بہر حال اللہ جل جلالہ کی عظمت کا استحضار اور اپنی بے وقتی کا استحضار کرے، کس بات پر انسان ناز کرے؟ کس چیز پر فخر کرے؟ نہ کوئی چیز اپنی ہے، نہ اپنی طاقت سے حاصل ہوئی ہے، نہ اپنے بل بوتے پر باقی رہ سکتی ہے، جو کچھ حاصل ہے، وہ سب کسی کی عطا ہے

## ایک اور علاج

فرمایا کہ: ”علاج ہی کا ایک جزو یہ ہے کہ قصداً ایسے افعال اختیار کرے، جو عرفاً موجب ذلت سمجھتے ہیں اور بدون اس کے دوسرے علاج ناکافی ہیں۔ یعنی قصداً ایسا کام اختیار کرے، جس کو عام طور پر لوگ ذلت کا کام سمجھتے ہیں، بطور علاج کے وہ کام کرے، جیسے صحابہ کرام کیا کرتے تھے۔

## حضرت عمرؓ کا اپنا علاج کرنے کا واقعہ:

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک شاندار جبہ پہن کر خطبہ دیا، وہ جبہ بہت پسند آیا اور اپنا سراپا اچھا معلوم ہوا، تھوڑی دیر کے بعد وہ جبہ اتارا اور مشک اٹھا کر کمر پر لادی اور پانی بھر کر لوگوں کے گھروں میں پہنچانا شروع کر دیا، کسی نے آپ سے پوچھا کہ آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ فرمانے لگے کہ چونکہ میرے دل میں عجب کا خیال آ گیا تھا، اس لیے اس کے ذریعہ میں اس عجب کا علاج کر رہا ہوں۔

## حضرت ابو ہریرہؓ کا اپنا علاج کرنے کا واقعہ:

حضرت ابو ہریرہؓ درس تدریس کے کام میں لگے رہتے تھے، ان کو سیاست سے کوئی غرض نہ تھی، ایک مرتبہ بحرین کے گورنر چھٹی پر جا رہے تھے، ان کی جگہ ان کو گورنر بنا دیا گیا، چونکہ درویش آدمی تھے، ساری عمر قال اللہ وقال الرسول میں گزاری تھی، سارا دن گورنری کے کام میں مشغول رہتے، شام کو لکڑیوں کا ایک گٹھڑ سر پر رکھتے اور بازار کے درمیان میں سے اس طرح گزرتے کہ آواز لگاتے جاتے کہ ہٹو امیر المومنین آ رہے ہیں، امیر المومنین آ رہے ہیں، گویا کہ راستے میں لوگوں کو متنبہ بھی کرتے جاتے کہ یہ امیر المومنین آ رہا ہے جس کے سر پر لکڑی کا گٹھڑ ہے، یہ کام اس لیے کرتے کہ کہیں گورنری کی شان کی وجہ سے دماغ میں تکبر پیدا نہ ہو جائے، اس طرح اپنا علاج خود کیا۔

## حضرت گنگوہی کا طلبہ کے جوتے اٹھانے کا واقعہ:

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جو قلب الارشاد، امام وقت اور ابوحنیفہ عصر کے لقب سے مشہور ہیں، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارواح ثلاثہ میں ان کا واقعہ لکھا ہے کہ حضرت والا ایک دفعہ سبق پڑھا رہے تھے اور بارش شروع ہوگئی، تو طلبہ سے فرمایا کہ اندر چلیں، طلبہ اپنی اپنی کتابیں لے کر اندر جانے لگے اور حضرت والا طلبہ کے جوتے سمیٹ کر اندر لے جانے لگے، تاکہ وہ بارش سے بھیگ کر خراب نہ ہو جائیں۔

یہ طلبہ کے جوتے دو وجہ سے اٹھا رہے تھے، ایک تو علاج کی غرض سے کہ کہیں میرے اندر

تکبر کا شائبہ پیدا نہ ہو جائے، دوسری وجہ یہ تھی کہ جب انسان یہ علاج کر لیتا ہے، تو اس کا نفس مزکی اور مجلی ہو جاتا ہے اور جب اللہ والے کا نفس مزکی اور مجلی ہو جاتا ہے، تو اس کو یہ بات غیر معمولی معلوم نہیں ہوتی کہ میں طلبہ اور شاگردوں کے جوتے اٹھا رہا ہوں، بلکہ یہ کام بھی اس کے معمول کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔

## حضرت تھانویؒ کی سید سلیمان ندوی کو نصیحت:

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حضرت سید سلیمان ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تشریف لے گئے، پورے ہندوستان میں جن کے علم کا ڈنکا بج رہا تھا، سیرۃ النبی کے مصنف، محقق وقت اور سیاسی اعتبار سے بھی لوگوں کے اندر مشہور و معروف، حضرت سید سلیمان ندوی صاحب خود بیان فرماتے ہیں کہ میں جب حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس سے رخصت ہونے لگا، تو میں نے حضرت سے عرض کیا کہ حضرت کوئی نصیحت فرما دیں، حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ یہ اتنے بڑے عالم ہیں اور مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ میں نصیحت کروں یا اللہ ایسی نصیحت دل میں ڈال دیجئے، جو ان کے حق میں فائدہ مند ہو، تو اس وقت بے ساختہ میرے دل میں یہ بات آئی کہ ہمارے یہاں اول و آخر ایک ہی چیز ہے، وہ یہ کہ اپنے آپ کو مٹا دینا، حضرت سید صاحب فرماتے ہیں کہ یہ بات کہتے ہوئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ہاتھ کو جھٹکا دیا وہ جھٹکا میرے دل پر ایسا لگا کہ اسی وقت گریہ طاری ہو گیا، ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اس کے بعد حضرت سید صاحب نے اپنے آپ کو ایسا مٹایا کہ میں نے ایسی بہت کم نظیریں دیکھی ہیں، کہ اتنے بڑے عالم نے اپنے آپ کو ایسا مٹا دیا ہو، اس طرح مٹایا کہ میں نے ایک دن حضرت سید صاحب کو دیکھا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس کے باہر حاضرین مجلس کی جوتیاں سیدھی کر رہے ہیں۔

## علوم تو ان بڑے میاں کے پاس ہیں:

حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سہ دری میں بیٹھ کر تصنیف کا کام کر رہے تھے اور حضرت سید صاحب دور

ایسی جگہ پر کھڑے ہو کر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے تھے، جہاں سے حضرت تھانوی ان کو نہ دیکھ سکیں، میں اچانک پیچھے سے ان کے قریب پہنچا اور کہا کہ حضرت یہاں کیا کر رہے ہو؟ کیا دیکھ رہے ہو؟ میرے سوال پر اچانک چونک پڑے اور کہا کہ کچھ نہیں، میں نے جب اصرار کیا تو فرمایا کہ میں یہ دیکھ رہا تھا کہ ساری زندگی جن چیزوں کو علوم سمجھتے رہے، وہ تو جہل ثابت ہوئے، علوم تو ان بڑے میاں کے پاس ہیں، پھر اللہ تعالی نے حضرت سید صاحب کو وہ مقام بخشا کہ خود ان کے شیخ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے بارے میں یہ شعر کہا۔

از سلیمان گیر اخلاص عمل
دان تو ندوی راہ منزہ از دغل

یہ شعر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سید صاحب کے بارے میں کہا، بہر حال اپنے آپ کو مٹانا پڑتا ہے، تب جا کر کچھ بنتا ہے۔

مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہیے ☆ کہ دانہ خاک میں مل کر گل گلزار بنتا ہے

کسی کے در پر رگڑے کھائے بغیر یہ چیز حاصل نہیں ہوتی، اس لیے کہا جاتا ہے کہ شیخ کی نگرانی میں یہ عمل کرے۔

## حضرت مفتی اعظم مفتی محمد شفیع کی تواضع:

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مطب ابتداء میں رابسن روڈ پر تھا، اسی زمانہ میں میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کا اسی مطب کے کچھ فاصلے پر مکان تھا، حضرت ڈاکٹر صاحب خود بیان کرتے ہیں کہ ایک دن میں مطب میں بیٹھا ہوا تھا اور میرے پاس کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے، حضرت ڈاکٹر صاحب کے پاس ظاہری بیماریوں کے مریض بھی آتے تھے اور باطنی بیماریوں کے مریض بھی آیا کرتے تھے، تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہاتھ میں دودھ کی پتیلی لیے ہوئے سڑک پر سامنے سے گزر رہے ہیں، میں نے سوچا کہ یا اللہ یہ مفتی اعظم ! اس طرح سڑک پر پتیلی ہاتھ میں لیے جا رہا ہے، جو لوگ مطب میں بیٹھے ہوئے تھے، ان سے میں نے پوچھا کہ یہ شخص جو پتیلی ہاتھ میں لیے جا رہا ہے، جانتے ہو یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا کہ ہم نہیں جانتے، آپ نے فرمایا کہ یہ

پاکستان کے مفتی اعظم ہیں اور ہاتھ میں پتیلی لیے ہوئے اس طرح جا رہے ہیں جس طرح ایک عام آدمی جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو تواضع کا وہ مقام عطا فرمایا تھا کہ سچی بات یہ ہے کہ میں نے ایسا متواضع آدمی کوئی نہیں دیکھا، ایک تو آدمی بتکلف تواضع کرتا ہے، لیکن ان کے یہاں تواضع کے لیے کوئی تکلف نہیں تھا، کیونکہ ان کے دماغ میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ میں تو بالکل بے حقیقت ہوں اور اپنے بارے میں دماغ کے اندر کسی بڑائی کا تصور کبھی آیا ہی نہیں، اسی وجہ سے ان کو معمولی سے معمولی کام کرنے میں کوئی تکلف نہیں ہوتا تھا، میں نے خود دیکھا کہ آپ کرتے کے دامن میں بازار سے آلو خرید کر لے آتے تھے۔

## حضرت مدنیؒ کی مفتی صاحبؒ کو نصیحت:

دیوبند میں بھی ایک دن اسی طرح دودھ لینے کے لیے پتیلی لے کر جا رہے تھے، حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو دیکھ لیا، اگلے دن جب آپ درالعلوم دیوبند میں پہنچے، تو حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مفتی صاحب سے فرمایا کہ دیکھو بھائی مولوی شفیع! آپ کو تواضع کا بہت اونچا مقام عطا فرمایا ہے، لیکن اتنی تواضع بھی نہ کیا کرو، اس لیے کہ اب آپ دارالعلوم کے مفتی ہو گئے ہو اور اس طرح کے کام کرنے سے بعض اوقات عوام کی نگاہوں میں وقعت کم ہو جاتی ہے، اس لیے اتنی تواضع نہیں کرنی چاہیے، لیکن والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ سمجھتے تھے کہ میں تو کچھ ہوں ہی نہیں، اس لیے میں کیا اہتمام کروں، کہ فلاں کام کروں اور فلاں کام نہ کروں، اللہ تعالیٰ نے تواضع کا یہ مقام عطا فرمایا تھا۔



## کبھی ننگے پاؤں بھی چلا کرو:

ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ کبھی کبھی ننگے پاؤں بھی چلا کرو اور کبھی کبھی دوسروں کے جوتے سیدھے کر دیا کرو۔ ''ارواح ثلاثہ'' میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہ جب کسی طالب علم کو دیکھتے کہ اس کے اندر تکبر ہے اور اس کے تکبر کا علاج کرنا ہے، تو اس کو مامور کرتے تھے کہ تم درسگاہ کے باہر طلبہ کے جوتے روزانہ سیدھے کیا کرو اور جب کسی طالب علم کو دیکھتے کہ

اس کے اندر کوئی خرابی نہیں ہے، تو اس کے جوتے خود سیدھے فرمایا کرتے تھے۔

## شیخ کے بتانے پر ذلت کے کام کرنا علاج ہے، از خود نہیں:

یہ جو کہا جاتا ہے کہ اس راستے میں بعض اوقات ذلت کے کام بھی کرنے پڑتے ہیں، وہ ذلت کے کام بھی اپنی خود رائی سے نہ کرے، خود رائی سے کرنے سے بعض اوقات تکبر پیدا ہوتا ہے اور دماغ اور سڑ جاتا ہے، بلکہ شیخ کی نگرانی میں کرے، جب شیخ کہے تو وہ کام کرے اور جب شیخ نہ کہے، تو وہ کام نہ کرے۔

ایک صاحب نے کسی کتاب میں پڑھ لیا تھا کہ دوسرے کے جوتے سیدھے کرنے سے تکبر دور ہوتا ہے، چنانچہ وہ صاحب حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی مجلس میں آئے اور دوسروں کے جوتے سیدھے کرنے شروع کر دیئے، حضرت والد صاحب نے ان کو منع کیا، کہ یہ کام نہ کرو، پھر منع کرنے کی وجہ بتائی کہ اس شخص کے حالات ایسے ہیں کہ اگر یہ جوتے سیدھے کرے گا، تو اور زیادہ اس کے دماغ میں تکبر پیدا ہوگا، کہ میرے اندر اتنی تواضع پیدا ہوگئی ہے کہ میں لوگوں کے جوتے سیدھے کرتا ہوں، اس لیے حضرت فرماتے ہیں کہ اس راستے میں کسی کی نگرانی میں چلنا پڑتا ہے۔

## کبر اور شکر میں فرق:

فرمایا کہ ''نعمت پر فخر کرنا کبر ہے اور اس کو عطاء حق سمجھنا اور اپنی نااہلی کو مستحضر رکھنا شکر ہے''۔ جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا تھا کہ تکبر کی بیماری کا بہترین علاج کثرت شکر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر ادا کرنے کی عادت ڈالنا، وہی بات حضرت نے اس ملفوظ میں ارشاد فرمائی کہ کسی نعمت کے حصول پر فخر کرنا، اس کی وجہ سے اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور دوسروں کو کمتر سمجھنا تکبر ہے، لیکن یہ سمجھنا کہ میں تو اس نعمت کا مستحق نہیں تھا، اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے یہ نعمت عطا فرمادی ہے، یہ استحضار شکر ہے اور یہی شکر کبر کا علاج ہے۔

## تحدیث بالنعمت:

اسی کو تحدیث نعمت کہا جاتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمت کا ذکر کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ

نعمت عطا فرمائی ہے، نہ صرف یہ کہ یہ چیز تکبر نہیں، بلکہ عبادت ہے اور اپنی بڑائی کا ذکر کر کے اپنا کوئی وصف بیان کرنا تکبر ہے اور زبردست گناہ ہے۔ باطن کے یہ گناہ بہت باریک ہیں اور ان کی سرحدیں آپس میں ایک دوسرے سے ملتی ہیں، ایک طرف تحدیث نعمت ہے، اگر تحدیث نعمت کی غرض سے انسان اپنا کوئی وصف بیان کرتا ہے، یا اللہ تعالیٰ کی کسی نعمت کا اور اس کی عطا کا اظہار کر رہا ہے، تو یہ عبادت ہے، اور اگر اپنی بڑائی کے خیال سے اس کا اظہار کر رہا ہے، تو یہ گناہ کبیرہ ہے، لیکن دونوں کے درمیان خط امتیاز کھینچنا کہ کیا بات تکبر ہے اور کیا بات تحدیث نعمت ہے؟ یہ ہر ایک کے بس کا کام نہیں۔

## ''تحدیث نعمت'' کا حکم

''تحدیث نعمت'' تو وہ چیز ہے کہ اللہ تعالیٰ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کا حکم دے رہے ہیں فرماتے ہیں:

﴿ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ﴾ (سورة الضحى)

یعنی آپ پر آپ کے رب کی جو نعمتیں ہوئی ہیں، ان کو لوگوں کے سامنے بیان کیا کریں کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت عطا فرمائی ہے، اسی تحدیث نعمت کے طور پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت سی باتیں ارشاد فرمائیں، ایک موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا:

اَنَا سَيِّدُ وُلْدِ آدَمَ وَلَا فَخْرَ

میں آدم کے بیٹوں کا سردار ہوں، یہ تحدیث نعمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ مقام عطا فرمایا، کہ مجھے آدم کے تمام بیٹوں کا سردار بنا دیا، لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ تحدیث نعمت کبر کی حد میں داخل ہو جائے، اس لیے فوراً اگلا جملہ ارشاد فرما دیا ولا فخر یعنی اس پر کسی فخر کا اظہار نہیں کرتا، جس سے دوسروں کی تحقیر ہو، اب دیکھئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں اپنے اوپر ہونے والی نعمتوں کا ذکر فرما رہے ہیں، لیکن دھڑکا یہ لگا ہوا ہے کہ کہیں حدود سے متجاوز نہ ہو جاؤں، اس لیے فوراً فرمایا ولا فخر میں فخر نہیں کرتا۔

## تحدیث نعمت کی علامت:

پھر تحدیث نعمت کی ایک علامت ہے، وہ یہ کہ تحدیث نعمت کے نتیجے میں سر اور زیادہ جھکتا

ہے اور تواضع پیدا ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کے حضور مزید عاجزی اور انکساری پیدا ہوتی ہے، اس لیے کہ انسان یہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ یا اللہ تعالیٰ میں اس نعمت کا مستحق نہیں تھا اور میں اس نعمت کو حاصل کرنے سے عاجز تھا، لیکن آپ نے محض اپنے فضل سے یہ نعمت عطا فرمادی اس استحضار اور اقرار کے نتیجے میں اور زیادہ عاجزی پیدا ہوگی۔

## فتح مکہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انکساری:

فتح مکہ پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فاتح بن کر مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے اور اس شہر میں فاتح بن کر داخل ہورہے ہیں، جس شہر کے لوگوں نے آپ کو ہجرت کرنے پر مجبور کیا، جس شہر کے لوگوں نے آپ کو قتل کے منصوبے بنائے، جس شہر کے لوگوں نے آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے، جس شہر کے لوگوں نے آپ کے اوپر غلاظتیں ڈالنے کی کوشش کی، جہاں کے لوگوں نے آپ پر پتھر برسانے کی کوشش کی، اس شہر کے لوگوں پر فاتح بن کر تشریف لارہے ہیں، صرف ۸ آٹھ سال کی مدت کے بعد تشریف لارہے ہیں، آپ کے علاوہ کوئی اور اس شہر میں فاتح بن کر داخل ہوتا، تو اس کا سینہ تنا ہوتا اور گردن اکڑی ہوئی ہوتی، انا ولا غیری کے نعرے لگا رہا ہوتا، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ مکرمہ میں اس شان سے داخل ہوئے کہ آپ کی گردن مبارک جھکی ہوئی ہے، یہاں تک سینہ مبارک سے آپ کی ٹھوڑی لگ رہی ہے، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور زبان مبارک پر قرآن کریم کی یہ آیات ہیں:

﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا، لِیَغْفِرَلَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ، وَیُتِمَّ نِعْمَتَہٗ عَلَیْکَ ، وَیَھْدِیَکَ صِرَاطًا مُّسْتَقِیْمًا﴾ (سورۃ فتح ۱۔۲)

یہ ہے "تحدیث نعمت" کیونکہ "اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا" کی آیات تلاوت کرکے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا ذکر فرمارہے ہیں کہ یا اللہ آپ نے یہ فتح مجھے عطا فرمائی اور اس نعمت کے استحضار کے نتیجے میں عاجزی اور انکساری پیدا ہورہی ہے اور رجوع الی اللہ زیادہ ہورہا ہے، یہ تحدیث نعمت کی علامت ہے۔

## تکبر کی علامت:

اور تعلّی اور تکبر کی علامت یہ ہے کہ اس سے گردن اکڑتی ہے، سینہ تنتا ہے اور انسان اپنے

آپ کو دوسروں سے بالا سمجھتا ہے اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے اور ان کے ساتھ حقارت کا معاملہ کرتا ہے، ورنہ کم از کم یہ تو ہوتا ہی ہے کہ وہ دل سے اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا اور افضل سمجھتا ہے، اب دونوں کے درمیان حد فاصل قائم کرنا کہ کہاں تحدیث نعمت ہے اور کہاں سے تکبر شروع ہو گیا؟ یہ حد قائم کرنا آسان کام نہیں، یہی وہ مقام ہے جہاں شیخ کی ضرورت ہوتی ہے، وہ شیخ یہ بتاتا ہے کہ تم جو نعمت کا اظہار کر رہے ہو، یہ تحدیث نعمت نہیں ہے بلکہ یہ تکبر ہے، لیکن اس کا نام تم نے ''تحدیث نعمت'' رکھ دیا، حالانکہ حقیقت میں وہ تکبر اور شیطانی عمل تھا۔

## حضرت تھانوی کا تحدیث بالنعمت پر ایک واقعہ:

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنے نفس کی نگرانی کی توفیق عطا فرماتے ہیں، وہ اپنے قدم قدم پر اپنے نفس کا جائزہ لیتے رہتے ہیں، کہ کہیں یہ نفس صحیح راستے سے نہ ہٹ جائے، میں نے اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت تھانویؒ کا یہ واقعہ سنا کہ ایک مرتبہ حضرت تھانویؒ ایک مسجد میں وعظ فرما رہے تھے، بڑا مجمع سن رہا تھا اور شرح صدر کے ساتھ وعظ ہو رہا تھا، علوم و معارف کے دریا بہہ رہے تھے، اسی وعظ کے دوران کوئی بات حضرت والا کے ذہن میں آئی، آپ نے فرمایا کہ اب میں آپ سے ایک بات کہتا ہوں اور میں تحدیث نعمت کے طور پر کہتا ہوں کہ یہ بات آپ مجھ ہی سے سنیں گے، کسی اور سے یہ بات آپ کو سننے میں نہیں آئے گی۔

ابھی وہ بات کہی نہیں تھی، بلکہ اسی وقت سر جھکایا اور فرمایا استغفراللہ میں نے یہ کیا کہہ دیا، میں نے اس کو تحدیث نعمت کا نام دیدیا، حالانکہ یہ تو تعلّی ہو گئی اور اپنی بڑائی کا بیان ہو گیا، کہ یہ بات آپ مجھ ہی سے سنئے گا اور کسی سے نہیں سنئے گا، میں استغفار کرتا ہوں، یا اللہ مجھے معاف فرما، یہ عمل وہی شخص کر سکتا ہے، جس کے دل میں میٹر لگا ہوا ہے اور وہ میٹر یہ تول رہا ہے کہ کونسا کلمہ حد سے متجاوز ہو گیا اور کونسا حد کے اندر ہے؟ لہٰذا اتنے بڑے انسان بزرگ محقق یہ فرما رہے ہیں کہ میں نے تحدیث نعمت کا لفظ تو استعمال کیا، لیکن حقیقت میں تو یہ تعلّی اور تکبر ہو گیا، تو پھر ہم اور آپ کس شمار و قطار میں ہیں، ہم لوگ نہ جانے کتنی مرتبہ ''تحدیث نعمت'' کے عنوان سے اپنے اوصاف بیان کرتے ہیں، جب کہ حقیقت میں وہ تعلّی اور تکبر میں

داخل ہوتے ہیں۔

## نعمتوں میں اضافے سے رجوع الی اللہ میں اضافہ:

لہٰذا ''تحدیث نعمت'' کی جو علامت ہے، اس کو پیش نظر رکھنا چاہیے، کہ اس تحدیث نعمت کے نتیجے میں عاجزی پیدا ہو رہی ہے یا نہیں؟ خشوع پیدا ہو رہا ہے یا نہیں؟ رجوع الی اللہ میں اضافہ ہو رہا ہے یا نہیں؟ اگر یہ چیزیں پیدا ہو رہی ہیں، تو پھر سمجھ لیجئے کہ یہ تحدیث نعمت ہے اور ایک مومن کی علامت ہی یہ ہے کہ اس کو جتنا جتنا نعمتوں سے نوازا جاتا ہے، وہ اتنا ہی اللہ تعالیٰ کے آگے سجدہ ریز ہوتا چلا جاتا ہے، اپنی بے حقیقتی اس پر عیاں ہوتی چلی جاتی ہے، اپنی عاجزی، اپنی فرومائیگی، اپنی عبدیت اور اپنی بندگی کا احساس اور بڑھتا چلا جاتا ہے، اس لیے کہ وہ اللہ کا بندہ ہے اور اس کو اپنے بندہ ہونے کا احساس ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ اس کو جس نعمت سے بھی نوازتے ہیں، وہ پکار اٹھتا ہے کہ یا اللہ! میں تو اس نعمت کے قابل نہیں تھا، آپ نے اپنی رحمت سے عطا فرمادی ہے، لہٰذا جتنی نعمت بڑھتی ہے، رجوع الی اللہ میں اتنا ہی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

## حضرت سلیمان علیہ السلام اور نعمتوں کا شکر

حضرت داؤد علیہ السلام اور ان کی اولاد میں حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار نعمتیں عطا فرمائیں، مثلاً حضرت سلیمان علیہ السلام کو ایسی حکومت عطا فرمائی، جو تاریخ انسانیت میں کسی کو بھی ایسی حکومت نہ تو پہلے نصیب ہوئی، نہ بعد میں نصیب ہوئی، وہ یہ کہ انسانوں پر حکومت، جنات پر، پرندوں پر، فضاؤں پر اور ہواؤں پر حکومت عطا فرمائی، یہ نعمتیں دینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا

﴿اِعۡمَلُوۡۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُکۡرًا ؕ وَ قَلِیۡلٌ مِّنۡ عِبَادِیَ الشَّکُوۡرُ﴾

(سبا:۱۳)

اے آل داؤد شکر کا عمل اختیار کرو اور میرے بندوں میں بہت کم لوگ شکر گزار ہیں

روایات میں آتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے یہ طے کر رکھا تھا کہ چوبیس گھنٹے میں کوئی لمحہ ایسا نہ گزرے، جس میں ہمارے گھر میں کوئی شخص بھی اللہ کا ذکر یا شکر نہ کرتا

ہو، چنانچہ آپ نے اوقات کو تمام گھر والوں پر تقسیم کر دیا تھا کہ اس وقت سے لے کر اس وقت تک فلاں ذکر میں لگا رہے گا، اس وقت سے اس وقت تک فلاں صاحب ذکر کریں گے، دیکھئے جس طرح نعمتوں سے نوازا جا رہا ہے، تو اسی طرح رجوع الی اللہ میں اضافہ ہو رہا ہے اور یہ دعا فرما رہے ہیں:

﴿ رَبِّ اَوْزِعْنِیْ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِکَ فِیْ عِبَادِکَ الصّٰلِحِیْنَ ﴾۔ (النمل: ۱۹)

ترجمہ: اے میرے رب مجھ کو اس پر ہمیشگی دیجئے کہ میں آپ کی ان نعمتوں پر شکر کیا کروں، جو آپ نے مجھ کو اور میرے ماں باپ کو عطا فرمائی ہیں اور میں نیک کام کیا کروں، جس سے آپ خوش ہوں اور مجھ کو اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں داخل رکھئے۔

لہٰذا ایک مومن کی خاصیت یہ ہے کہ جوں جوں اس کو نعمتوں سے نوازا جائے گا، اس کے اندر عاجزی اور انکساری پیدا ہوگی، تواضع پیدا ہوگی، اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع میں اضافہ ہوگا۔

## شریر آدمی کی خاصیت:

دوسری طرف شریر آدمی کی خاصیت یہ ہے کہ اس کو جتنی زیادہ نعمتیں ملتی ہیں، اتنا ہی اس کی رعونت میں اضافہ ہوگا، اس کی فرعونیت بڑھے گی، متنبی شاعر بھی کبھی کبھار بڑی حکیمانہ باتیں کہہ دیتا ہے، چنانچہ وہ کہتا ہے کہ۔

اِذَا اَنْتَ اَکْرَمْتَ الْکَرِیْمَ مَلَکْتَهٗ

وَاِنْ اَنْتَ اَکْرَمْتَ اللَّئِیْمَ تَمَرَّدَا

یعنی اگر تم ایک شریف آدمی کی عزت کرو گے، اس کے ساتھ اچھا معاملہ کرو گے، تو تم اس کے مالک بن جاؤ گے، وہ تمہارا غلام بن جائے گا، اس لیے کہ شریف آدمی تمہارا احسان نہیں بھولے گا، اس کے نتیجے میں وہ تمہارا غلام اور تم اس کے مالک بن جاؤ گے اور اگر تم کمینے آدمی کا اکرام کرو گے، تو چونکہ وہ کمینہ آدمی تھا، وہ اکرام کے قابل نہیں تھا، مگر تم نے

اس کی عزت کر کے اس کو سر پر چڑھا دیا، تو اس کے نتیجے میں وہ سرکش بن جائے گا۔

یہی معاملہ ہر انسان کا ہے، اگر انسان کو نعمتیں ملتی جائیں اور اس کے نتیجے میں اس کا سر اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکتا چلا جائے گا، تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ بندہ شکر گزار ہے اور اب اگر وہ نعمت کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ الحمد للہ فلاں نعمت حاصل ہے اور یہ بات وہ ڈرتے ڈرتے کہتا ہے کہ کہیں تکبر اور تعلّی نہ ہو جائے، تو معلوم ہوا کہ یہ تحدیث نعمت کے طور پر یہ بات کہہ رہا ہے اور اگر نعمت ملنے کے بعد وہ منہ اٹھا کر، اپنی بڑائی بیان کر رہا ہے کہ میں ایسا ہوں، میں نے ایسا کیا، میں نے ایسا کیا، تو اس صورت میں وہ چاہے تحدیث نعمت کے الفاظ استعمال کرے، لیکن حقیقت میں وہ تحدیث نعمت نہیں، بلکہ وہ تکبر ہے۔

## شیخ کی ضرورت:

یہ تو تحدیث نعمت کی علامت ہے؟ لیکن انسان خود سے اس علامت کو اپنے اوپر منطبق نہیں کر سکتا، اس لیے شیخ کی ضرورت ہوتی ہے، لہٰذا جب کسی نعمت کا اظہار کرے، تو اپنے شیخ سے پوچھے کہ فلاں موقع پر میں نے فلاں نعمت کا اظہار کیا تھا، آیا یہ حدود سے متجاوز ہوا یا نہیں؟ وہ شیخ بتائے گا کہ اس حد تک ٹھیک ہے اور اس حد کے بعد غلط ہے اور جب پندرہ بیس مرتبہ شیخ کو بتایا اور شیخ نے اس کی اصلاح کر دی، تو اس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ خود ذہن کے اندر ایک ترازو قائم ہو جائے گا، پھر انسان کو خود اس بات کا ادراک ہونے لگے گا کہ کہاں میرا قدم صحیح ہے اور کہاں غلط ہے؟ اور کہاں تکبر ہے اور کہاں تحدیث نعمت ہے؟

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

الله اكبر
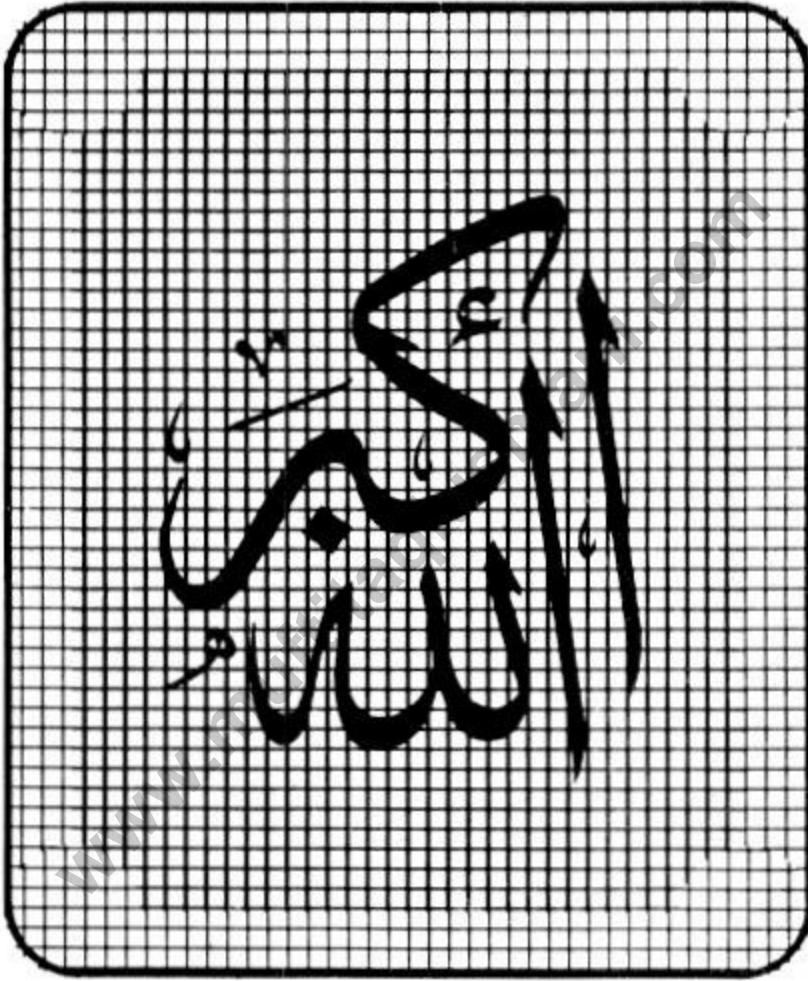
روح کی بیماریاں اور ان کا علاج

# باب ...... (۶)

## بدگمانی اور اس کا علاج
## تجسس اور اس کا علاج

باب ششم کا پہلا بیان:

# بدگمانی، تجسس اوران کا علاج

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ. اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ. بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَبْ بَعْضُکُمْ بَعْضًا﴾ (سورۃ الحجرات آیت ۱۲)

## بدگمانی، تجسس اور عیب جوئی کی حرمت وشناعت:

بدگمانی اور تجسس ایسے گناہ ہیں، جنکو ہم نے گناہ سمجھنا ہی چھوڑ دیا ہے، حالانکہ قرآن کریم کی نص صریح ہے کہ دوسرے کے خلاف بدگمانی کرنا بھی حرام ہے اور تجسس کرنا یعنی دوسرے کی ٹوہ میں لگنا کہ یہ کیا غلط کام کر رہا ہے اور دوسرے کے عیب تلاش کرنا بھی حرام ہے۔ قرآن کریم نے صاف لفظوں میں فرما دیا ''ولا تجسسوا'' دوسرے کی ٹوہ میں نہ لگو، بلکہ ہر شخص کو چاہیے کہ اپنے کام سے کام رکھے، دوسرے کی فکر میں نہ پڑے، اسی طرح بدگمانی کرنا بھی حرام ہے، کسی کے بارے میں ٹوہ میں نہ لگو، بلکہ ہر شخص کو چاہیے کہ اپنے کام سے کام رکھے، دوسرے کی فکر میں نہ پڑے، اسی طرح بدگمانی کرنا بھی حرام ہے، کسی کے بارے میں اگر کوئی بات سامنے آئی ہے، تو آدمی کو چاہیے کہ اس کے بارے میں نیک گمانی کرے، حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ظُنُّوْا بِالْمُؤْمِنِیْنَ خَیْرًا. مومنین کے ساتھ نیک گمان رکھو۔

خواہ مخواہ بلاوجہ بدگمانی کرنا کہ اس نے یہ کیا ہوگا، اس نیت سے کیا ہوگا، یہ بدگمانی ہے، جس کے بارے میں قرآن کریم نے فرمایا:

﴿اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ﴾. یعنی بعض گمان براہ راست گناہ ہوتے ہیں۔

## تجسس اور بدگمانی معاشرتی خرابیوں کا اہم سبب:

یہ سب کام ناجائز اور حرام ہیں اور قرآن وحدیث کی نصوص ان کے خلاف صریح ہیں، ان میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں اور یہ گناہ معاشرتی خرابیاں پیدا کرنے کی ذمہ دار ہیں ،معاشرے میں آپس میں نااتفاقیاں، ایک دوسرے سے لڑائیاں، یہ سب بدگمانی اور تجسس سے پیدا ہوتی ہیں، اس لیے یہ دونوں بڑے گناہ ہیں اور بہت سے فتنوں کی جڑ ہیں۔

## بدگمانی چلتے چلتے یقین ہو جاتی ہے:

لیکن ہمارا معاشرہ ان دونوں سے بھرا ہوا ہے، ہر شخص اپنی طرف سے دوسرے کے بارے میں ایک گمان قائم کرلیتا ہے اور پھر اس پر ایسا یقین کرلیتا ہے، جیسے اس نے اپنی آنکھوں سے اسے وہ کام کرتے دیکھا ہے، ذرا سی بات علم میں آ گئی، بس اس پر اپنی طرف سے مفروضوں کا محل تعمیر کرلے گا، پھر ان مفروضوں کو دوسروں کی طرف منسوب کردے گا، کہ اس نے ایسا کیا ہوگا، پھر بعد میں ''کیا ہوگا'' بھی نہیں رہتا بلکہ ''کیا ہے'' ہو جاتا ہے۔

## آیت قرآنی میں عجیب ترتیب:

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ قرآن کریم کی اس آیت:

﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ﴾ (سورۃ الحجرات آیت ۱۲)

کی تفسیر کے تحت فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے عجیب ترتیب قائم فرمائی ہے، وہ یہ کہ پہلے تو یہ فرمایا کہ بدگمانی مت کرو، یعنی کسی شخص کے بارے میں کسی بات کا کوئی قرینہ اور شائبہ معلوم ہوا، تو آپ اس کی تحقیق کیے بغیر، اس کے بارے میں بدگمانی کرکے بیٹھ گئے، یہ فعل تو حرام ہے، اب جو شخص بدگمانی کررہا ہے، وہ یہ کہتا ہے کہ اچھا آپ نے بدگمانی کو منع کردیا، کہ بلاتحقیق کے کسی کے بارے میں بدگمان مت ہو جاؤ، تو اچھا مجھے تحقیق کرنے کی اجازت دے دو، تاکہ میں تحقیق کروں کہ آیا اس نے یہ گناہ کیا یا نہیں؟ یہ عیب اس کے اندر موجود ہے یا نہیں؟

تو اب دوسرے مرحلے میں قرآن کریم نے یہ حکم دے دیا کہ ولا تجسسوا یعنی اگر تم کسی کے گناہ کی اور عیب کی تحقیق کرنا چاہتے ہو، تو تمہیں اس تحقیق کی بھی اجازت نہیں، اس لیے کہ تمہیں اس کے گناہوں کی کیا پڑی ہے کہ تم اس فکر میں لگ گئے کہ اس نے یہ گناہ کیا ہے یا نہیں؟

تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

جو کچھ وہ کر رہا ہے اس کا جواب اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ دے گا، تمہیں اس کی تحقیق کی کیا ضرورت ہے، اس لیے تجسس کرنا منع ہے۔

## تجسس اور تحسس میں فرق:

حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے لیے دو لفظ استعمال فرمائے، فرمایا:

وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا تَحَسَّسُوْا۔ نہ تجسس کرو اور نہ ہی تحسس کرو

''تجسس'' کے معنی وہ ہیں جو اوپر بیان کیے یعنی انسان اس فکر میں پڑے کہ دوسرے کا عیب مجھے معلوم ہو جائے، چاہے اس کے لیے کوئی بھی طریقہ اختیار کرے۔

اور ''تحسس'' کے معنی وہ ہیں جس کو اردو میں ''کنسوئے لینا'' کہتے ہیں، یعنی کسی کی راز کی بات چپکے سے سننے کی کوشش کرنا، وہ چھپانا چاہتا ہے اور یہ سننے کی کوشش کر رہا ہے، اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تجسس اور تحسس دونوں کو حرام قرار دے دیا۔

## تجسس اور تحسس کیوں حرام ہیں؟

تجسس اور تحسس کو کیوں حرام قرار دے دیا؟ اس لیے کہ تجسس کرنا یا تحسس کرنا اس بات کی علامت ہے کہ انسان اپنے عیب سے بے خبر اور بے فکر ہے، اگر اسے اپنے عیب کی فکر ہوتی، تو کبھی دوسرے کے عیب کے تجسس میں نہ پڑتا، جس آدمی کے خود پیٹ میں درد ہو اور وہ اس درد سے بے تاب اور بے چین ہو، کیا اس کو یہ فکر ہوگی کہ فلاں کو نزلہ ہے یا نہیں؟ فلاں کو کھانسی ہے یا نہیں؟ اس لیے اس کو تو اپنی فکر پڑی ہوئی ہے، وہ اپنے درد

سے بے چین ہے، جب تک اس درد سے اس کو سکون نہ مل جائے، وہ اس وقت تک دوسرے کی طرف کیسے دیکھے۔

## اپنے عیوب کی فکر کیجئے!

اگر ہم لوگوں کو اپنے عیوب کی فکر ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں جا کر میرا کیا انجام ہونا ہے؟ آخرت میں میرا کیا حال ہوگا؟ جب یہ فکر پیدا ہو جائے، تو پھر دوسرے کی طرف نگاہ پڑ نہیں سکتی، بہادر شاہ ظفر مرحوم فرماتے ہیں:

تھے جب اپنے عیوب سے بے خبر
رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر
تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

جب اپنی برائیوں سے بے خبر تھے، اس وقت تک یہ حال تھا کہ کبھی اس کی طرف دیکھ رہے ہیں، کبھی اس کی طرف دیکھ رہے ہیں اور انہی کو برا سمجھ رہے ہیں، لیکن جب اپنے عیوب پر نگاہ پڑی، تو کوئی برا نہ رہا۔

## حضرت تھانوی جیسے بزرگ کی حالت ملاحظہ فرمایئے!

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنے عیوب کی فکر عطا فرماتے ہیں، ان کو تو ساری دنیا اچھی نظر آتی ہے، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جو اس صدی کے مجدد تھے، وہ فرماتے ہیں کہ "میں تمام مسلمانوں کو اپنے آپ سے حالاً اور تمام کافروں کو اپنے آپ سے مآلاً افضل سمجھتا ہوں"۔

یعنی مسلمان تو سارے کے سارے اس وقت بھی مجھ سے افضل ہیں اور کافروں کو بھی آئندہ کے اعتبار سے افضل سمجھتا ہوں کہ شاید اللہ تعالیٰ ان کو کسی وقت ایمان کی توفیق دیدے اور مآل اور انجام کے اعتبار سے وہ بھی مجھ سے آگے نکل جائیں، اس لیے میں ان کو بھی افضل سمجھتا ہوں، جب اتنے بڑے آدمی کا یہ حال ہے، تو ہما شما (ہم اور آپ) کس شمار قطار میں ہیں، جس کو اللہ تعالیٰ اپنے عیوب کی فکر عطا فرماتے ہیں، وہ ساری دنیا

کو اپنے سے افضل سمجھتا ہے، دوسروں کے عیوب کی فکر میں نہیں رہتا ہے۔

لہٰذا اپنی فکر کرو کہ تم کہاں جارہے ہو؟ کیا عمل کررہے ہو؟ کیا کیا عیب تمہارے اندر موجود ہیں؟ کیا کیا خرابیاں تمہارے اندر پائی جاتی ہیں؟ ان کو دور کرنے کی فکر کرو، دوسروں کی فکر کرنا، دوسروں کا تجسس کرنا، ان کی ٹوہ میں لگنا، دوسروں کے بارے میں بدگمانی اور غیبت کرنا حرام ہے۔ اور اس کے ذریعہ ہم اپنی دنیا بھی خراب کررہے ہیں اور آخرت بھی خراب کررہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے فضل وکرم سے ان برائیوں سے محفوظ رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

## مذموم بدگمانی کونسی؟

بہرحال بدگمانی اور تجسس کے بارے میں حضرت والا کے ملفوظات ہیں، فرمایا کہ:

> "بدگمانی تکبر سے پیدا ہوتی ہے، مذموم بدگمانی وہ ہے، جو خود لائی جائے، باقی جو وسوسہ خود آئے، وہ مذموم بدگمانی نہیں، جب تک اس پر عمل نہ ہو اور عمل کی صورت یہ ہے کہ یا دل سے اس پر اعتقاد جازم کرلے، یا زبان سے کسی کے سامنے اس کا تذکرہ کردے، جب تک وسوسہ پر عمل نہ ہو، اس وقت تک اس پر مواخذہ ہے، نہ وہ مضر ہے۔ (انفاس عیسیٰ ۱۵۳)

ایک شخص کے طرزِ عمل سے اس کے بارے میں آپ کو کچھ شبہ ہوا، اور دل میں وسوسہ آیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے فلاں کام کیا ہوگا، اگر دل میں یہ وسوسہ خود بخود دل میں شبہ پیدا ہوا، تو اس پر کوئی گناہ نہیں، کیونکہ اس میں آپ کے اختیار کو کوئی دخل نہیں۔

## دوسرے کے عمل کی تاویل کرنے کی عادت ڈالئے:

مثلاً رمضان کے دن آپ نے ایک شخص کو ہوٹل سے نکلتے دیکھا، تو آپ کے دل میں خیال آئے گا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے روزہ توڑا ہے، اب یہ جو خیال دل میں خود بخود پیدا ہوا، یہ کوئی گناہ نہیں، البتہ آدمی کو چاہیے کہ حتی الامکان اس کے اس عمل کو صحیح محمل پر محمول کرے، مثلاً کہ جو شخص جو ہوٹل سے نکل رہا ہے، شاید یہ اپنے بیمار کے لیے کھانا خریدنے گیا ہوگا، یا کسی آدمی سے بات کرنے کے لیے ہوٹل کے اندر گیا ہوگا، یہ احتمالات

بھی موجود ہیں، لہذا دل میں یہ احتمالات پیدا کرے، کہ شاید ایسا ہوا ہو، زیادہ تحقیق میں پڑنے کے ہم مکلف نہیں۔

## حرام بدگمانی کونسی؟

لہذا خود بخود دل میں جو خیال آیا تھا، وہ گناہ نہیں، اس پر مواخذہ بھی نہیں، لیکن اگر دل میں جو خیال پیدا ہوا تھا، اس پر آپ نے پہلے اعتقاد اور یقین کرلیا، کہ یہ صاحب ہوٹل میں روزہ توڑنے کے لیے داخل ہوئے تھے اور کھانا کھا کر باہر آئے ہیں، اس کا یقین کرلیا اور دوسرے احتمالات کی طرف دھیان نہیں کیا اور پھر اس سے آگے بڑھ کر یہ کیا کہ دوسروں کے سامنے بیان کرنا شروع کردیا، کہ میں نے خود اس کو روزہ میں کھاتے ہوئے دیکھا ہے، حالانکہ اس نے صرف یہ دیکھا تھا کہ وہ شخص ہوٹل سے نکل رہا تھا، کھاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، لیکن دوسروں کے سامنے اس طرح بیان کررہا ہے، جیسے خود اس نے کھاتے ہوئے دیکھا تھا اور سو فیصد یقین کے ساتھ دوسروں سے کہہ رہا ہے، کہ یہ شخص روزہ خور ہے، یہ بدگمانی حرام اور ناجائز ہے۔

اس لیے حضرت والا رحمتہ اللہ علیہ فرمارہے ہیں کہ دل میں خود بخود کسی کے بارے میں کوئی گمان پیدا ہوجانا، یہ کچھ گناہ نہیں، لیکن اس گمان پر سو فیصد یقین کر بیٹھنا اور پھر اس یقینی انداز میں اس کا تذکرہ کرنا گناہ ہے، اس لیے حضرت فرماتے ہیں کہ:

''مذموم بدگمانی وہ ہے، جو خود لائی جائے، باقی جو وسوسہ خود آئے، وہ مذموم بدگمانی نہیں، جب تک اس پر عمل نہ ہو اور عمل کی صورت یہ ہے کہ یا دل سے اس پر اعتقاد جازم کرلے (یعنی یقین کرلے پہلے صرف گمان تھا پھر اس گمان کو یقین سے تبدیل کردیا) یا زبان سے کسی کے سامنے اس کا تذکرہ کردے۔''

## بدگمانی کے درجات:

گویا کہ بدگمانی کے دو درجے ہوئے:

۱)...... ایک درجہ غیر اختیاری ہے، وہ یہ کہ اپنے کسی عمل کے بغیر دل میں کسی کی طرف سے کوئی گمان پیدا ہوا، اللہ تعالیٰ کے یہاں اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔

۲)......دوسرا درجہ اختیاری ہے، وہ یہ کہ جو گمان دل میں پیدا ہوا، اس گمان کو لے کر بیٹھ گیا، اس سے مختلف باتیں نکال رہا ہے اور اس پر یقین کر رہا ہے، یا اس کا تذکرہ دوسروں کے سامنے کر رہا ہے، یہ دوسرا درجہ حرام ہے، اس سے بچنا ضروری ہے۔

## بدگمانی کا منشاء اور بنیاد اور اس کا علاج:

آگے حضرت والا نے بدگمانی کا علاج بیان فرمایا کہ:

''جب کسی سے بدگمانی پیدا ہو، جس کا منشا کبر ہے، تو اپنے عیوب کو پیش نظر کرلیا کرو۔(انفاس عیسیٰ ۱۵۳)

یہ اس کا علاج ہے۔ یعنی دوسرے کے بارے میں دل میں برا گمان آیا، دل میں برا خیال آیا، بدگمانی پیدا ہوئی، اگرچہ وہ غیر اختیاری ہونے کی وجہ سے کوئی گناہ نہیں، لیکن یہ غیر اختیاری بدگمانی بھی اگر دل میں زیادہ دیر جمی رہے گی، تو گناہ کے اندر مبتلا کردے گی، یا تو دل میں یقین پیدا کردے گی، یا دوسروں کے سامنے اس کا تذکرہ کرادے گی، اس لیے اس کے علاج کی بھی فکر کرنی چاہیے۔

اس کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک چنگاری آکر گر پڑی اور آپ نے اس کو بجھایا نہیں، تو وہ چنگاری کسی بھی وقت شعلہ بن جائے گی، اسی طرح غیر اختیاری گمان کا بھی علاج کرنا ضروری ہے، وہ علاج یہ ہے کہ اپنے عیوب کو پیش نظر کرلے، کہ میرے اندر تو فلاں فلاں عیب ہیں، تو دوسرے کو کیا دیکھوں اور اس کے بارے میں کیا گمان کروں، میری حالت خود خراب ہے، میرے اندر فلاں عیب ہے، میرے اندر فلاں عیب ہے، لہذا اپنے عیوب کے استحضار کرنے سے یہ بیماری رفتہ رفتہ ختم ہوجائے گی۔

## تجسس اور بدگمانی کی انتہاء ''غیبت'' ہے:

آگے حضرت والا نے فرمایا:

| ''بدگمانی'' تجسس ان سب کا منشا کبر ہے بلکہ متکبر کی غرض پوری طرح غیبت ہی سے حاصل ہوتی ہے بدگمانی اور تجسس سب اسی کے مقدمات ہیں۔ اگر کوئی شخص |
|---|

تجسس اور بدگمانی کرے مگر غیبت نہ کرے تو اس کا مقصود حاصل نہ ہوگا اس لیے بدگمانی اور تجسس کو بھی ترک کردے گا۔ پس غیبت سب سے اشد ہے۔ (ایضاً)

یعنی یہ تینوں بیماریاں بدگمانی، تجسس اور غیبت یہ سب ایک اور بیماری سے پیدا ہوتی ہے، وہ ہے اپنے آپ کو بڑا سمجھنا، جب آدمی اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے، تب ہی وہ دوسرے سے بدگمان ہوتا ہے اور تب ہی دوسرے کی ٹوہ میں لگتا ہے کہ اس کا کوئی عیب میرے ہاتھ میں آجائے اور تب ہی اس کی غیبت کرتا ہے اور اصل ان تینوں میں سے غیبت ہے اور متکبر کو اصل مزہ تو غیب کرنے میں آتا ہے، لیکن غیبت کی تمہید کے طور پر وہ متکبر بدگمانی اور تجسس کو استعمال کرتا ہے کہ جب میں بدگمانی اور تجسس کروں گا، تو اس کے نتیجے میں غیبت کرنے کا موقع ملے گا، لہذا بدگمانی اور تجسس غیبت کے مقدمات ہیں، کیونکہ تجسس کے نتیجے میں کوئی عیب ظاہر ہوگا، تو اس کو لوگوں کے سامنے بیان کروں گا اور بدگمانی کے نتیجے میں کوئی عیب دل میں آئے گا، تو اس کو لوگوں کے سامنے بیان کروں گا، لہذا آخری نتیجہ تو غیبت ہے، جو متکبر کی اصل غرض ہے، ایسا آدمی ملنا مشکل ہے، جو بدگمانی کرے اور تجسس بھی کرے، لیکن پھر آگے غیبت نہ کرے، کیونکہ وہ بدگمانی اور تجسس اسی لیے کررہا ہے کہ وہ غیبت کا مزہ لینا چاہتا ہے، اصل مقصود تو غیبت ہے، یہ بدگمانی اور تجسس تو درمیان کے آلے اور واسطے ہیں، لہذا ان سب بیماریوں میں سب سے زیادہ اشد اور قابل توجہ بیماری ''غیبت'' ہے، اگر غیبت چھوٹ گئی، تو پھر بدگمانی اور تجسس باآسانی چھوٹ جائیں گی۔

## بدگمانی میں گناہ کا درجہ

آگے حضرت والا نے فرمایا کہ

''بدگمانی میں گناہ کا درجہ تو وہ ہے جس کا ذہن میں اعتقاد راسخ ہو اگر راسخ نہ ہو تو مضر نہیں مگر علاج اس کا بھی ضروری ہے وہ یہ کہ اپنے عیوب کو پیش نظر رکھے پھر اگر علاج کے بعد کچھ اثر رہے تو وہ مذموم نہیں۔'' (انفاس عیسیٰ ص ۱۵۴)

یعنی بدگمانی میں گناہ اس وقت ہے، جب اس بدگمانی پر یقین کرلے، لیکن اگر یقین نہ کرے، بلکہ محض احتمال کے درجے میں دل کے اندر موجود ہے، کہ شاید اس نے یہ کام کیا

ہو، تو وہ مضر نہیں اور اس غیر اختیاری احتمال پر گناہ بھی نہیں، مثلاً رمضان میں کسی کو دن میں ہوٹل سے نکلتا ہوا دیکھا، تو دل میں یہ خیال آیا کہ شاید اس نے روزہ توڑ دیا ہو، لیکن اس پر یقین نہیں کیا، یہ مضر تو نہیں، لیکن علاج اس کا بھی ضروری ہے، کیونکہ یہ خیال ابھی چنگاری کے درجے میں ہے، ابھی شعلہ نہیں بنی، لیکن کسی بھی وقت شعلہ بن کر تمہیں خاکستر کردے گی، لہٰذا اس کا علاج بھی کرے، وہ یہ کہ اپنے عیوب کو پیش نظر رکھے، البتہ علاج کے بعد اب بھی تھوڑا بہت بدگمانی کا خیال دل میں آتا ہے، تو وہ مذموم نہیں، کیونکہ یہ اختیار سے باہر ہے۔

☆ ........ ☆ ........ ☆ ........ ☆

## بدگمانی اور تجسس سے بچنے کے تین علاج:

حضرت والا نے فرمایا کہ

> ''بدگمانی'' تجسس اور غیبت کا علاج یہ ہے کہ تواضع اختیار کرو، تکبر کو دل سے نکالو، اور جب تک اصلی مرض زائل نہ ہو اس وقت تک غیبت کا فوری علاج یہ کرو کہ (۱) فکر و تامل سے کام لو (۲) اور کوتاہی پر جرمانہ مقرر کرو (۳) اور وسوسہ بدگمانی کے وقت توجہ کو ذکر اللہ وغیرہ کی طرف منعطف کرو۔'' (انفاس عیسیٰ ص ۱۵۴)

اس ملفوظ میں حضرت والا نے دو علاج تجویز فرمائے ہیں، ایک علاج پائیدار، دوسرا علاج وقتی اور فوری، پھر فوری اور وقتی علاج کی بھی تین صورتیں بیان فرمائیں، پہلا علاج یہ ہے کہ فکر و تامل سے کام لو، یعنی بات کرنے سے پہلے سوچو، کہ یہ بات زبان سے نکالوں یا نہ نکالوں، پہلے تولو پھر بولو۔

## امام شافعی کا سکوت:

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے جب کوئی شخص سوال کرتا، تو آپ خاموش رہتے، فوراً جواب نہیں دیتے تھے، کسی نے ان سے پوچھا کہ حضرت لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں، لیکن آپ کچھ دیر تک خاموش بیٹھے رہتے ہیں، جواب میں فرمایا

حَتّٰی اَعْرِفَ اَنَّ الْفَضْلَ فِی السُّکُوْتِ اَوْفِی الْکَلَام

یعنی میں اس وقت تک خاموش رہتا ہوں، جب تک میرے سامنے یہ واضح نہ ہو جائے کہ بہتری بولنے میں ہے، یا خاموش رہنے میں ہے۔

یہ درحقیقت اس مقولے پر عمل ہو رہا تھا کہ ''پہلے تو لو پھر بولو''

## حضرت صدیق اکبرؓ کا زبان کو سزا دینا

روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت صدیق اکبرؓ اپنی زبان کو بیٹھے ہوئے مروڑ رہے تھے، لوگوں نے پوچھا کہ حضرت آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ جواب دیا کہ

ان ھذا اوردنی الموارد۔ اس زبان نے مجھے ہلاکت کی جگہوں میں ڈالا ہے۔

یہ کون کہہ رہا ہے؟ صدیق اکبرؓ ''صدیق'' کون ہوتا ہے؟ نبی کا آئینہ، وہ یہ کہہ رہے ہیں، کہ اس زبان نے مجھے ہلاکت میں ڈال دیا ہے، جن کو اللہ تعالیٰ فکر عطا فرماتے ہیں اور وہ اس طرح زبان کو استعمال کرنے میں احتیاط اور اس کا استحضار رکھنے کی تدبیر کرتے ہیں۔ لہٰذا اگر انسان زبان کو صحیح استعمال کرے، تو بڑی اچھی چیز ہے اور اگر اس کو غلط استعمال کرے، تو یہ بڑی خراب چیز ہے، یہی زبان جنت میں لے جانے والی ہے اور یہی زبان جہنم میں ڈالنے والی ہے، اگر دل کے یقین کے ساتھ زبان سے یہ کلمہ

اَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰہِ''

پڑھ لیا، تو کافر جہنم سے جنت میں پہنچ جائے گا اور اگر کسی مسلمان نے اس زبان سے کفر بول دیا، تو وہ مسلمان سیدھا جہنم میں پہنچ جائے گا۔

حدیث شریف میں ہے کہ لوگ اپنی زبان کے کرتوت کی وجہ سے جہنم کے اندر اوندھے منہ ڈالے جائیں گے، اس زبان کا بے محابا استعمال کہ جو منہ میں آیا بک دیا، جو سمجھ میں آیا کہہ گزرے، اس کو چھوڑو اور بولنے سے پہلے سوچنے کی عادت ڈالو، کہ یہ زبان سے جو کلمہ نکال رہا ہوں، یہ کہیں مجھے ہلاکت میں تو نہیں ڈال دے گا؟

## خاموش رہنے کا مجاہدہ کیجئے!

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک صاحب آیا کرتے تھے، وہ بہت بولتے

تھے، آتے ہی بولنا شروع کر دیتے اور پھر کوئی انتہاء نہیں ہوتی تھی، والد صاحب برداشت کرتے تھے، چند روز کے بعد ان صاحب نے کہا کہ حضرت میں آپ سے بیعت ہونا چاہتا ہوں اور اصلاحی تعلق قائم کرنا چاہتا ہوں، حضرت والد صاحب نے ان سے فرمایا کہ اگر تم اصلاحی تعلق قائم کرنا چاہتے ہو، تو پہلا کام یہ کرو کہ اس زبان پر تالا لگاؤ، یہ زبان جو قینچی کی طرح چل رہی ہے، اس کو روکو، بس، یہی تمہارا وظیفہ اور علاج ہے، چنانچہ اس کے بعد جب وہ مجلس میں آتے، تو خاموش بیٹھے رہتے اور اسی علاج کے ذریعے ان کی اصلاح ہوگئی۔

## غیبت ہونے پر جرمانہ مقرر کیجئے!

اس لیے بولنے میں فکر اور تامل سے کام لو، میں جو بول رہا ہوں، یہ غیبت ہے یا جھوٹ ہے؟ جائز ہے یا ناجائز ہے؟ حرام ہے یا حلال ہے؟ اس کو پہلے سوچو اور اگر تامل اور غور وفکر کرنے کے باوجود اور توبہ استغفار کرنے کے باوجود پھر بھی کوتاہی ہو جائے اور غیبت سرزد ہو جائے، تو پھر اپنے اوپر جرمانہ مقرر کرو، کہ آئندہ جب کبھی غیبت ہوگی، تو اتنے پیسے ادا کروں گا، لیکن پیسے اتنے ہونے چاہئیں، جن کو نکالنے میں تھوڑی سی تکلیف ہو، اتنا کم نہ ہو جیسے علی گڑھ کالج میں تھا۔

## علیگڑھ کالج میں نماز چھوڑنے پر جرمانے کا فلسفہ:

علی گڑھ کالج میں تمام طلبہ کو مسجد میں نماز پڑھنا ضروری تھا، اگر کوئی حاضر نہ ہوتا، تو فی نماز چار آنے ادا کرنا ضروری ہوتا، چنانچہ جو طلبہ بڑے بڑے رئیسوں کے بیٹے ہوتے، وہ مہینے کے شروع میں ہی پورے مہینے کا جرمانہ کرا دیتے، لہذا جرمانہ ایسا ہونا چاہیے، جس کے ادا کرنے میں تھوڑی سی مشقت بھی ہو، اور یا یہ جرمانہ مقرر کرو کہ جب کبھی غیبت ہوگی تو چار رکعتیں نفل پڑھوں گا، اس کے نتیجے میں انشاء اللہ تعالیٰ اس گناہ سے بچنے کی توفیق عطا فرما دیں گے۔

## بدگمانی کے وقت اللہ کے ذکر کی طرف متوجہ ہو جاؤ:

ایک علاج تو یہ بھی ہے کہ جب کبھی دوسرے کی طرف سے بدگمانی کا خیال آئے، تو

اپنی توجہ کو ذکر اللہ کی طرف منعطف کر دو، مثلاً استغفر اللہ پڑھنا شروع کر دو، کلمہ پڑھنا شروع کر دو، کوئی تسبیح پڑھنا شروع کر دو اور اپنی توجہ اس طرف سے پھیر لو۔

## بدگمانی کا مستقل علاج: تواضع پیدا کرو:

یہ تو وقتی علاج تھے، مستقل علاج یہ ہے کہ اپنے اندر تواضع پیدا کرو، کیونکہ جیسا کہ پہلے عرض کیا تھا کہ یہ ساری بیماریاں تکبر ہونے سے اور تواضع نہ ہونے سے پیدا ہوتی ہیں، دل میں اپنی بڑائی ہے کہ جو میں سوچتا اور سمجھتا ہوں، وہ درست ہے، میں بڑا عقل مند ہوں، میں بڑا عالم ہوں، میں بڑا پارسا ہوں، یہ سب تکبر کے خیالات ہیں، جو انسان کے اندر غیبت، بدگمانی اور تجسس کا داعیہ پیدا کرتے ہیں، ان سب کا علاج یہ ہے کہ اپنے اندر تواضع پیدا کرو۔

## تواضع پیدا کرنے کا طریقہ:

اب تواضع کیسے پیدا ہو؟ اس کا طریقہ یہ ہے کہ کسی شیخ کا دامن پکڑ لو، کیونکہ شیخ کے سامنے رگڑے کھائے بغیر کام نہیں بنتا، اس کی چپت کھاؤ، اس کی ڈانٹ کھاؤ، اس کے ساتھ لگے لپٹے رہو، اس کی نگاہوں کو برداشت کرو، اس کے خلاف طبع امور کو برداشت کرو، تو انشاء اللہ رفتہ رفتہ تواضع پیدا ہو جائے گی اور جب تک شیخ نہ ملے یا شیخ سے تعلق قائم نہ ہو، اس وقت تک کم از کم اتنا کرو کہ اپنی حقیقت کو سوچا کرو کہ میری حقیقت کیا ہے؟ میری ذات میں کوئی کمال ہے؟ جو کچھ میرے اندر ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، اگر صحت ہے، وہ بھی اللہ کی عطا ہے، اگر میرے اندر حسن ہے، تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، اگر علم میرے پاس ہے، تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، اگر پیسہ ہے، تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، اور وہ جب چاہے، ان کو واپس لے لے، ایک آدمی بڑا صحت مند اور تندرست ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ چاہیں، اس کی صحت کو واپس لے لیں۔

## انسان کا کچھ بھی اپنا نہیں محض عطاءِ ربانی ہے:

میرے ایک عزیز تھے، جن کا انتقال ہو گیا، اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی قوت دی تھی کہ

برف کی سل کو ایک مکا مار کر توڑ دیتے تھے، تربوز کو کبھی چھری سے نہیں کاٹتے تھے، بس ہاتھ مارا اور توڑ دیا، آخر عمر میں جب بیمار ہوئے، تو میں ان کی عیادت کے لیے گیا، دیکھا کہ بستر پر لیٹے ہوئے ہیں اور ہاتھ اوپر اٹھانے کی طاقت بھی نہیں تھی، جب مجھے دیکھا اور ملاقات ہوئی، تو میں نے دل میں کہا کہ یہ وہی "حامد" ہے، جو برف کی سل اپنے ہاتھ سے توڑ دیا کرتا تھا اور اب یہ حالت ہے کہ ہاتھ خود سے نہیں اٹھا سکتا، لہذا انسان کس بات پر ناز اور فخر کرے۔

## علم پر ہرگز ناز وفخر نہ کرو:

مولوی کو علم کا بہت ناز ہوتا ہے، کہ میں بڑا عالم ہوں، مجھے بہت کچھ آتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ جب چاہیں، اس علم کو سلب فرمالیں، چنانچہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ دکھا دیتے ہیں کہ کاغذ قلم لے کر لکھنے بیٹھے، تو اب سمجھ میں نہیں آتا، کیا لکھیں؟ جب کہ ہمیں اپنے لکھنے پر ناز ہے، ہم بڑے اچھے اہل قلم ہیں، بعض اوقات اپنے نام کے ہجے نہیں آتے کہ کس طرح اپنا نام لکھیں، لہذا انسان کس چیز پر ناز کرے؟ کس چیز پر اکڑے؟ کس چیز پر بھروسہ کرے؟ جو کچھ حاصل ہے، وہ سب ان کی عطا ہے، وہ جب چاہیں سلب کرلیں، جس دن یہ بات دل میں بیٹھ گئی اور اپنی بڑائی کا احساس دل سے نکل گیا کہ میں تو کچھ نہیں ہوں، ذرہ ناچیز ہوں، بے مقدار ہوں، ہیچ در ہیچ ہوں، بس اس دن انشاء اللہ تواضع پیدا ہو جائے گی۔



## آڑ میں بیٹھ کر کسی کی باتیں سننے کا حکم:

آگے ارشاد فرمایا

> آڑ میں بیٹھ کر کسی کی باتیں سننا بھی تجسس میں داخل ہے جس کو آڑ میں بیٹھنا ہے تو زبان سے کہہ دینا چاہیے کہ میں بیٹھا ہوں یا اس کے سامنے بیٹھنا چاہیے غرض کسی طرح اپنے بیٹھنے کی اطلاع کر دے۔ (انفاس عیسیٰ ص ۱۵۴)

مثلاً دو آدمی آپس میں باتیں کر رہے ہیں؟ آپ نے آڑ میں جا کر ان کی باتیں سننا شروع کر دیں، یہ گناہ اور حرام ہے اور تجسس کے اندر داخل ہے، لہذا جو شخص آڑ میں بیٹھا ہو، وہ باتیں کرنے والوں کو بتا دے کہ میں یہاں پردے میں بیٹھا ہوں، تا کہ اگر وہ راز

کی باتیں کرنا چاہتے ہیں، تو نہ کریں یا ان کے سامنے آ کر بیٹھ جائے۔

## ہمارا طریقہ کار:

آج ہمارے معاشرے میں سب کام الٹے ہو رہے ہیں، ایسے موقع پر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اپنے آپ کو چھپالیں اور باتیں کرنے والوں پر یہ ظاہر نہ کریں کہ میں یہاں پر موجود ہوں اور آرام سے بیٹھ کر ان کی باتیں سنوں۔ یاد رکھئے یہ سب تجسس میں داخل ہیں اور حرام ہے، ناجائز ہے، دیانت کا تقاضا یہ تھا کہ تم اپنے وجود کو ان پر ظاہر کر دیتے، تاکہ وہ لوگ سوچ سمجھ کر باتیں کرتے۔

## لڑائی جھگڑے کی اصل بنیاد اور نبوی تعلیمات:



ہماری شریعت نے ہمیں ایسی ایسی باتیں بتائی ہیں کہ اگر واقعۃً ہم لوگ اس پر عمل کرلیں، تو آپس میں کوئی جھگڑا پیدا ہی نہ ہو اور معاشرے میں کوئی فساد رونما ہی نہ ہو، جہاں کہیں فتنہ وفساد اور جھگڑا ہوتا ہے، وہ شریعت کی کسی نہ کسی تعلیم کو چھوڑنے کے نتیجے میں ہوتا ہے، شریعت نے فتنہ اور فساد اور جھگڑے کے راستے پر ایسے پہرے بٹھائے ہیں کہ اگر ہم ان پر عمل کرلیں، تو پھر کوئی جھگڑا ہی نہ ہو، چنانچہ ایک طرف تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث شریف میں یہ حکم دیا کہ:

لَا يَتَنَاجَى اثْنَانِ دُوْنَ ثَالِثٍ

یعنی اگر محفل میں تین آدمی ہوں، تو ان میں سے دو آدمیوں کو یہ نہیں کرنا چاہیے کہ آپس میں علیحدہ ہو کر اس طرح باتیں کرنے لگیں کہ تیسرا آدمی اکیلا رہ جائے، ایسا کرنا جائز نہیں، کیوں؟ اس لیے کہ تیسرے کو یہ احساس اور خیال ہوگا کہ انہوں نے مجھے اکیلا کر دیا اور میرے بارے میں کوئی بات کر رہے ہیں اور مجھ سے وہ بات چھپانا چاہتے ہیں، اس سے دل شکنی ہوگی، اس لیے دو آدمی علیحدہ ہو کر سرگوشی نہ کریں۔

اور دوسری طرف یہ حکم دیا کہ پہلے سے دو آدمی سرگوشی کر رہے ہیں، تو تیسرے کو چاہیے کہ وہ وہاں نہ جائے، تاکہ ان کی باتوں میں خلل واقع نہ ہو، ان کو اپنی باتیں کرنے دو، تم بیچ میں جا کر کیوں گھستے ہو؟ یہ ساری باتیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

ہمیں بتادیں، لیکن ہم نے بس چند چیزوں کا نام دین رکھ لیا، نماز پڑھ لی، روزہ رکھ لیا، بس قصہ ختم، دین کو اسی پر منحصر سمجھ لیا، زندگی گزارنے کے جو آداب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں بتائے ہیں، ان کو قطعی طور پر دین سے خارج ہی کردیا، حالانکہ یہ بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم ہے۔

## فون پر دوسروں کی باتیں سننا تجسس ہے:

یا مثلاً ٹیلی فون ہے، اب آپ نے ٹیلی فون کرنے کے لیے ریسیور اٹھایا اور جب کان سے لگایا، تو اس میں دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں، کسی دوسرے کی لائن آپ کے فون سے مل گئی تھی، آپ نے ان کی باتیں سننا شروع کردیں، حالانکہ آپ کے لیے فون پر ان کی باتیں سننا جائز نہیں، بلکہ آپ فون بند کردیں، اگر آپ ان کی باتیں سنیں گے، تو وہ تجسس میں داخل ہے، جو جائز اور حرام ہے۔

## دوسروں کے خط پڑھنا تجسس ہے:

یا مثلاً دوسرے کا خط آپ کے ہاتھ لگ گیا، تو آپ کے لیے اس کی اجازت کے بغیر اس کا خط پڑھنا جائز نہیں، یہ بھی تجسس کے اندر داخل ہے اور گناہ ہے۔

## تجسس کی ایک جائز صورت:

بعض اوقات انتظامی طور پر تجسس ضروری ہو جاتا ہے، اگر کوئی شخص کسی ادارے کا سربراہ اور ذمہ دار ہے، وہ اگر تجسس نہ کرے، تو ادارے میں فساد پھیل جائے، مثلاً ذمہ دار کا تجسس کرنا کہ کہیں ہمارے زیر انتظام ادارے میں کوئی ایسا جرم تو نہیں ہورہا ہے، جو خطرناک قسم کا ہو، اس حد تک تجسس کرنے میں کوئی حرج نہیں، اب پولیس کے محکمے کو دیکھ لیں، وہ تو تجسس ہی کے کام کے لیے بنایا گیا ہے۔

## حضرت فاروق اعظمؓ کا ایک واقعہ

حضرت فاروق اعظمؓ رات کو مدینہ کی گلیوں میں گشت کیا کرتے تھے، ایک مرتبہ گشت

کے دوران دیکھا کہ ایک گھر سے گانے کی آواز آرہی ہے، کچھ گلاسوں کے کھڑکنے کی بھی آواز آئی، ان کو خیال ہوا کہ شاید یہاں پینے پلانے کا شغل ہورہا ہے اور گانا بجانا بھی ہورہا ہے، تھوڑی دیر تو آپ سب سنتے رہے، پھر دیوار پھاند کر اندر داخل ہوگئے اور دیکھا کہ وہاں شراب پی جارہی ہے اور گانا بجانا ہورہا ہے، آپ نے رنگے ہاتھوں ان کو پکڑلیا، ان کا جو سربراہ تھا وہ بڑا ہوشیار تھا، اس نے پوچھا کہ آپ نے ہمیں کیوں پکڑا؟ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ تم شراب پی رہے تھے اور گانا بجا کررہے تھے، تم مجرم ہو، اس لیے تمہیں پکڑلیا، ان کے سربراہ نے کہا کہ ہم نے تو ایک ہی گناہ کیا تھا اور آپ نے کئی گناہ کیے:

ایک گناہ تو آپ نے یہ کیا کہ آپ نے تجسس کیا اور ہماری ٹوہ میں لگے کہ اندر کیا ہورہا ہے؟

دوسرا گناہ یہ کیا کہ اجازت کے بغیر ہمارے گھر میں داخل ہوئے اور اجازت کے بغیر دوسرے کے گھر میں داخل ہونا جائز نہیں۔

تیسرا گناہ یہ کیا کہ دیوار پھاند کر داخل ہوئے حالانکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

واتوا البیوت من ابوابھا ...... یعنی گھروں میں دروازے کے ذریعہ آؤ

لہٰذا ہم نے تو صرف ایک گناہ کیا تھا اور آپ نے تین گناہ کیے۔

حضرت فاروق اعظمؓ نے اس کی یہ بات سن کر تینوں گناہوں کا استغفار کیا کہ کہیں واقعی مجھ سے یہ گناہ سرزد ہوگئے ہوں، اس لیے میں اللہ تعالیٰ سے مغفرت چاہتا ہوں، ہم جیسا ہوتا تو اس شخص کو دو تھپڑ مارتا کہ کم بخت ایک طرف تو یہ گناہ کرتا ہے اور دوسری طرف میرے اوپر یہ اعتراض کرتا ہے، چوری اور سینہ زوری، لیکن چونکہ یہ حضرات ساتھ ساتھ اپنے نفس کا بھی علاج کیا کرتے تھے، اس لیے انہوں نے یہ سوچا کہ چونکہ میری ذات پر اعتراض کیا ہے، تو اس کی مدافعت نہ کرنی چاہیے، بلکہ اس کے اندر جس خرابی کا احتمال ہے، اس کا تدارک کرنا چاہیے، اس لیے فوراً استغفار کیا۔

پھر یہ مسئلہ صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت کے سامنے پیش کیا گیا، کہ یہ شخص مجھے یہ کہہ رہا ہے کہ میں نے تین گناہ کیے،

آیا واقعتاً میں نے تجسس کا گناہ کیا؟ اور یہ تجسس کرنا میرے لیے گناہ تھا یا نہیں تھا؟

اور میرا اس طرح دوسرے کے گھر میں داخل ہونا جائز تھا یا نہیں تھا؟

صحابہ کرام کی اس جماعت نے مشورہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ دیا کہ جو ذمہ دار آدمی ہے، اگر اس کو یہ اندیشہ ہو کہ یہ فساد ایسا ہے، جو معاشرے میں پھیل جائے گا اور لوگوں کے اندر اس کے برے اثرات مرتب ہوں گے، تو اس صورت میں اس ذمہ دار کے لیے تجسس کرنا بھی جائز ہے اور اجازت کے بغیر اندر داخل ہونا بھی اس کے لیے جائز ہے اور دیوار پھاندنا بھی جائز ہے، لیکن اگر متعدی خرابی کا اندیشہ نہ ہو، مثلاً ایک آدمی اپنے گھر میں کوئی ایسا عمل کر رہا ہے، جس کا فساد اس کی ذات تک محدود ہے، اس کے برے اثرات دوسروں تک متعدی نہیں ہوں گے، تو اس صورت میں ذمہ دار اور سربراہ کو بھی تجسس کرنا جائز نہیں، چنانچہ فقہا کرامؒ نے اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے کہ کن حالات میں تجسس جائز ہے اور کن حالات میں تجسس جائز نہیں؟

## فقہاء کا قول فیصل

امام خصاف رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''ادب القضاء'' ہے، اس کی شرح علامہ صدر الشہید رحمۃ اللہ علیہ نے لکھی ہے، اس میں اس موضوع پر بہت طویل بحث کی ہے اور فقہا کرام کا اختلاف نقل کیا ہے کہ کس حالت میں تجسس جائز ہے اور کس حالت میں جائز نہیں؟ اس اختلاف میں قول فیصل یہ ہے کہ جہاں کسی متعدی برائی کا اندیشہ ہو، تو وہاں سربراہ کے لیے سب کچھ کرنا جائز ہے، تجسس کرنا بھی جائز اور دیوار پھاندنا بھی جائز، اجازت کے بغیر اندر گھسنا بھی جائز اور جہاں متعدی برائی کا اندیشہ نہ ہو، بلکہ ایک شخص کا ذاتی عمل ہے، وہ اپنے گھر میں بیٹھا کر رہا ہے، تو اس وقت سربراہ کے لیے بھی تجسس کرنا جائز نہیں۔

دارالعلوم کراچی کی تھوڑی سی ذمہ داری ہمارے سپرد بھی ہے، اس کی وجہ سے ہمیں یہ تجسس کرنا پڑتا ہے، کہ دارالاقامہ میں کیا ہو رہا ہے؟ طلبہ کن سرگرمیوں میں دلچسپی لے رہے ہیں؟ یہ اس وقت جائز ہے، جب کسی متعدی خرابی کا اندیشہ ہو، ورنہ سکوت افضل ہے۔

## بظاہر سویا ہوا شخص اپنے جاگنے کی اطلاع کر دے:

آگے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

> اسی طرح ایک آدمی سونے کو لیٹ گیا، اور دوسروں کو یہ خیال ہوا کہ یہ سو گیا ہے اور وہ آپس میں باتیں کرنے لگیں، مگر یہ جاگ رہا تھا، تو اس کو چاہیے کہ ان کو اطلاع کر دے کہ میں جاگ رہا ہوں، البتہ اگر وہ لوگ اسی کے متعلق باتیں کر رہے ہوں اور اس کو ضرر پہنچانا چاہتے ہوں، تو تجسس کے ساتھ ان کی گفتگو سننا جائز ہے۔ (انفاس عیسیٰ ص ۱۵۴)

آج کل الٹا معاملہ ہوتا ہے کہ جاگنے والا اپنے آپ کو اور زیادہ سوتا ہوا ظاہر کرتا ہے، تاکہ ان کی گفتگو کے ذریعہ تمام رازوں کا پتہ چل جائے اور بعد میں وہ اپنی مہارت اور استادی دکھائے کہ تم نے جو جو باتیں کیں، اس کا ہمیں پتہ چل گیا ہے، حالانکہ شرعاً ایسا کرنا جائز نہیں، جاگنے والا بتا دے کہ میں جاگ رہا ہوں، یہ بھی شریعت کا حکم ہے، البتہ اگر وہ گفتگو کرنے والے اسی کے متعلق گفتگو کر رہے ہوں اور اس کو نقصان پہنچانا چاہتے ہوں، تو پھر اس طرح چپکے چپکے باتیں سننا جائز ہے، تاکہ ان کے شر سے اپنے آپ کو بچا سکے۔

## غیر زبان والا شخص زبان دانی کی اطلاع کر دے:

آگے حضرت والا فرماتے ہیں کہ

> نیز اگر وہ شخص انگریزی یا عربی میں گفتگو کر رہے ہوں اور تیسرا شخص بھی ان زبانوں کو سمجھتا ہو مگر ان دونوں کو خبر نہ ہو تو اس کو چاہیے کہ ان دونوں کو مطلع کر دے کہ میں عربی یا انگریزی سمجھتا ہوں۔ (انفاس عیسیٰ ۱۵۴)

تاکہ دھوکہ میں آکر اپنا راز فاش نہ کر دیں، مقصد یہ ہے کہ نہ تو انسان خود تجسس کرے اور نہ ہی تجسس کے اسباب پیدا کرے اور نہ ہی دوسرے کو ایسی غلط فہمی میں مبتلا کرے، جس سے وہ یہ سمجھے کہ یہ بے خبر ہے اور تم اس کو نادانستگی میں اس کے کسی راز پر مطلع ہو جاؤ۔

## انگریزی سمجھنے والے ایک بزرگ کا واقعہ:

حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کے متعلقین میں ایک بزرگ تھے، انگریزی تعلیم یافتہ تھے، مگر حضرت والا کی صحبت نصیب ہوئی، تو ان کی وضع قطع بھی ایسی ہو گئی، جیسے دیندار لوگوں کی اور مولویوں کی ہوتی ہے، چہرے پر ڈاڑھی، لمبا کرتا وغیرہ، وہ ایک مرتبہ ریل

میں سفر کر رہے تھے، ان کے قریب ہی دو آدمی اور بیٹھے تھے، وہ بھی انگریزی دان تھے، وہ دونوں ان کا حلیہ دیکھ کر یہ سمجھے کہ یہ کوئی مولوی ہے، ان کو انگریزی کیا آتی ہوگی، چنانچہ ان دونوں نے بیٹھ کر انہی کے بارے میں انگریزی میں باتیں کرنا شروع کردیں، انگریزی میں باتیں کرنے کا مقصد ان سے چھپانا تھا کہ ملا آدمی ہے، انگریزی کیا سمجھے گا، ابھی گفتگو شروع ہی کی تھی کہ یہ بزرگ سمجھ گئے کہ یہ دونوں صاحب مجھ سے چھپ کر باتیں کرنا چاہتے ہیں، اس لیے انگریزی میں باتیں کر رہے ہیں، انہوں نے سوچا کہ یہ بات دیانت کے خلاف ہے کہ میں اسی طرح بیٹھ کر ان کی باتیں سنتا رہوں، چنانچہ ان بزرگ نے ان دونوں سے کہہ دیا کہ میں انگریزی جانتا ہوں، اگر آپ کو مجھ سے چھپ کر باتیں کرنی ہیں، تو کوئی اور طریقہ اختیار کریں، اس دھوکے میں نہ رہیں، کہ میں انگریزی نہیں جانتا، اگر آپ کہیں تو میں اٹھ کر چلا جاتا ہوں، تاکہ آپ علیحدگی میں باتیں کرلیں۔

بہرحال ان بزرگ کا یہ جو خیال آیا کہ یہ دونوں یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں زبان نہیں جانتا اور مجھ سے چھپ کر باتیں کرنا چاہتے ہیں، اب اگر میں خاموش بیٹھا رہوں، تو یہ تجسس میں داخل ہو جائے گا، یہ خیال ان کے ذہن میں کیوں پیدا ہوا؟ اس لیے کہ تھانہ بھون میں کچھ دن گزار لیے تھے اور حضرت والا کی صحبت نصیب ہوگئی تھی، ورنہ آج کیا کسی کے دل میں یہ خیال آئے گا کہ میں بتادوں کہ جس زبان میں تم باتیں کر رہے ہو، میں تو یہ زبان جانتا ہوں، آج اگر کوئی یہ بات بتائے گا تو بھی اپنا علم جتانے کے لیے بتائے گا کہ ہمیں جاہل مت سمجھنا، ہمیں بھی زبان آتی ہے، اس لیے نہیں بتائے گا کہ کہیں تجسس کے گناہ میں مبتلا نہ ہو جاؤں، بلکہ آج کل تو اس کو کمال سمجھا جائے گا کہ چپکے چپکے سے بات سنتے رہیں اور بعد میں اس کا اظہار کریں گے، کہ تم نے تو ہم سے چھپانے کی کوشش کی، لیکن ہم کو سب پتہ چل گیا کہ آپ نے کیا کیا باتیں کیں۔

بات یہ ہے کہ ان سب باتوں کا خیال کرنا دین کا ایک حصہ ہے، آج ہم نے ان کو دین سے خارج کر دیا ہے، اگر اللہ تعالیٰ فکر عطا فرمادیں، تو پھر یہ سب باتیں سمجھ میں آنے لگتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ان سب باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

روح کی بیماریاں اوران کا علاج

# باب......(۷)

## وعدہ خلافی اور اس کی مروجہ صورتیں

## عہد اور وعدہ کی اہمیت

باب ہفتم کا پہلا بیان:

# وعدہ خلافی اور اس کی مروجہ صورتیں

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَ نُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَ نَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا. اَمَّا بَعْدُ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَاِذَا اُؤْتُمِنَ خَانَ وَفِيْ رِوَايَةٍ وَاِنْ صَامَ وَصَلّٰى وَزَعَمَ اَنَّهٗ مُسْلِمٌ.

(صحيح بخاری كتاب الايمان باب علامات المنافق)

## حتی الامکان وعدہ نبھانے کی کوشش کی جائے:

پچھلے جمعہ کو اس حدیث میں بیان کی گئیں تین علامات میں سے ایک یعنی جھوٹ پر الحمدللہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوگیا تھا، منافق کی دوسری علامت جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بیان فرمائی، وہ یہ ہے کہ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ. کہ جب وہ وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے۔

## وعدہ پورا نہ کرسکنے کی صورت میں دستبرداری کا طریقہ:

مومن کا کام یہ ہے کہ جب وہ وعدہ کرتا ہے، تو اس کو نبھاتا ہے، اس کو پورا کرتا ہے، چنانچہ شریعت کا قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی وعدہ کیا اور بعد میں اس وعدہ کو پورا کرنے میں کوئی شدید عذر پیش آیا، یا کوئی رکاوٹ پیش آگئی، جس کی وجہ سے اس کے لیے اس وعدہ کو پورا کرنا ممکن نہیں رہا، تو اس صورت میں یہ وعدہ کرنے والا شخص اس

دوسرے شخص کو بتا دے کہ اب میرے لیے اس وعدہ کو پورا کرنا ممکن نہیں رہا، اس لیے میں اس وعدہ سے دستبردار ہوتا ہوں، مثلاً ایک شخص نے وعدہ کیا کہ میں تم کو فلاں تاریخ کو ایک ہزار روپے دوں گا، بعد میں اس وعدہ کرنے والے کے پاس پیسے ختم ہو گئے اور اب وہ اس قابل نہیں رہا کہ اس کی مدد کر سکے اور اس کو ایک ہزار روپے دے سکے، تو اس صورت میں اس کو بتا دے کہ میں نے ایک ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا تھا، لیکن اب میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ اس وعدے کو پورا کر سکوں، لیکن جب تک اس وعدہ کو پورا کرنے کی قدرت ہے اور کوئی شرعی عذر نہیں ہے، اس وقت تک اس وعدہ کو پورا کرے۔

## عذر نہ ہونے کی صورت میں وعدہ پورا کرنا ضروری ہے:

مثلاً کسی شخص نے منگنی کر لی اور کسی سے رشتہ کرنے کے بارے میں طے کر لیا، تو یہ منگنی ایک وعدہ ہے، اس لیے حتی الامکان اس کو نبھانا چاہیے، لیکن اگر کوئی عذر پیش آ جائے، مثلاً منگنی کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ ان دونوں کے درمیان اتفاق واتحاد قائم نہیں رہے گا، طبیعتوں اور مزاجوں میں فرق ہے اور کچھ حالات ایسے سامنے آئے، جو پہلے معلوم نہیں تھے، اس صورت میں اس کو بتا دے کہ ہم نے آپ سے شادی کا وعدہ اور منگنی کی تھی، لیکن اب فلاں عذر کی وجہ سے ہم اس کو پورا نہیں کر سکتے، لیکن جب تک عذر نہ ہو، اس وقت تک وعدہ کو نبھانا اور اس وعدہ کو پورا کرنا شرعاً واجب ہے اور اگر عذر پورا نہیں کرے گا، تو اس حدیث کا مصداق بن جائے گا۔

## حضرت حذیفہؓ کا ابوجہل سے وعدہ کا تفصیلی واقعہ:

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ایسے وعدوں کو نبھایا کہ (اللہ اکبر) آج اس کی نظیر پیش نہیں کی جا سکتی، حضرت حذیفہؓ مشہور صحابی ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے راز دار ہیں، جب یہ اور ان کے والد یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسلمان ہوئے، تو مسلمان ہونے کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ طیبہ آ رہے تھے، راستے میں ان کی ملاقات ابوجہل اور اس کے لشکر سے ہو گئی، اس وقت ابوجہل اپنے لشکر کے ساتھ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑنے کے لیے جا رہا تھا، جب حضرت حذیفہؓ کی ملاقات

ابوجہل سے ہوئی، تو اس نے پکڑ لیا اور پوچھا کہاں جا رہے ہو؟ انہوں نے بتایا کہ ہم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ طیبہ جا رہے ہیں، ابوجہل نے کہا کہ پھر تو ہم تمہیں نہیں چھوڑیں گے، اس لیے کہ تم مدینہ جا کر ہمارے خلاف جنگ میں حصہ لو گے، انہوں نے کہا کہ ہمارا مقصد تو صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات اور زیارت ہے، ہم جنگ میں حصہ نہیں لیں گے، ابوجہل نے کہا کہ اچھا ہم سے وعدہ کرو کہ وہاں جا کر صرف ملاقات کرو گے، لیکن جنگ میں حصہ نہیں لو گے، انہوں نے وعدہ کر لیا، چنانچہ ابوجہل نے آپ کو چھوڑ دیا، آپ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کرامؓ کے ساتھ غزوہ بدر کے لیے مدینہ منورہ سے روانہ ہو چکے تھے اور راستے میں ملاقات ہوگئی۔

اب اندازہ لگائیے کہ اسلام کا پہلا حق و باطل کا معرکہ (غزوہ بدر) ہو رہا ہے اور یہ وہ معرکہ ہے جس کو قرآن کریم نے یوم الفرقان فرمایا، یعنی حق و باطل کے درمیان فیصلہ کر دینے والا معرکہ، وہ معرکہ ہو رہا ہے، جس میں جو شخص شامل ہو گیا وہ بدری کہلایا اور صحابہ کرام میں بدری صحابہ کا بہت اونچا مقام ہے اور اسمائے بدرین بطور وظیفے کے پڑھے جاتے ہیں، ان کے نام پڑھنے سے اللہ تعالیٰ دعائیں قبول فرماتے ہیں، وہ بدرین جن کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیشن گوئی فرما دی کہ اللہ تعالیٰ نے سارے اہل بدر کی (جنہوں نے بدر کی لڑائی میں حصہ لیا) بخشش فرما دی، ایسا معرکہ ہونے والا ہے۔

بہر حال جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوئی، تو حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سارا قصہ سنا دیا کہ اس طرح راستے میں ہمیں ابوجہل نے پکڑ لیا تھا اور ہم نے یہ وعدہ کر کے بمشکل جان بچائی کہ ہم لڑائی میں حصہ نہیں لیں گے اور پھر درخواست کی کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ بدر کا معرکہ ہونے والا ہے، آپ اس میں تشریف لے جا رہے ہیں، ہماری بڑی خواہش ہے کہ ہم بھی اس میں شریک ہو جائیں اور جہاں تک اس وعدہ کا تعلق ہے، وہ تو انہوں نے ہماری گردن پر تلوار رکھ کر ہم سے یہ وعدہ لیا تھا کہ ہم جنگ میں حصہ نہیں لیں گے اور اگر ہم وعدہ نہ کرتے، تو وہ ہمیں نہ چھوڑتے، اس لیے ہم نے وعدہ کر لیا، لیکن آپ ہمیں اجازت دے دیں کہ ہم اس جنگ میں حصہ لے لیں اور فضیلت اور سعادت ہمیں حاصل ہو جائے۔ (الاصابۃ: ۱/۳۱۶)

لیکن سرکاردوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا کہ نہیں تم وعدہ کرکے آئے ہو اور زبان دے کر آئے ہو اور اسی شرط پر تمہیں رہا کیا گیا ہے کہ تم وہاں جا کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زیارت کروگے، لیکن ان کے ساتھ جنگ میں حصہ نہیں لوگے، اس لیے میں تم کو جنگ میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دیتا۔

## امتحان اور مشکل وقت میں وعدہ کی پاسداری کی تعلیم:

یہ وہ مواقع ہیں جہاں انسان کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ اپنی زبان اور اپنے وعدے کا کتنا پاس کرتا ہے؟ اگر ہم جیسا آدمی ہوتا، تو ہزار تاویلیں کرلیتا، مثلاً یہ تاویل کرلیتا کہ ان کے ساتھ جو وعدہ کیا تھا وہ سے دل سے تو نہیں کیا تھا، وہ تو ہم سے زبردستی کرلیا گیا تھا اور اللہ جانے کیا کیا تاویلیں ہمارے ذہنوں میں آجاتیں یا یہ تاویل کرلیتا کہ یہ حالت عذر ہے، اس لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد میں شامل ہونا ہے اور کفر کا مقابلہ کرنا ہے، جبکہ وہاں ایک ایک آدمی کی بڑی قیمت ہے، اس لیے مسلمانوں کے لشکر میں صرف ۳۱۳ نہتے افراد ہیں، جن کے پاس صرف ۷۰ اونٹ ۲ گھوڑے اور ۸ تلواریں ہیں، باقی افراد میں کسی نے لاٹھی اٹھائی ہے، کسی نے ڈنڈے اور کسی نے پتھر اٹھائے ہیں، یہ لشکر ایک ہزار مسلح سورماؤں کا مقابلہ کرنے کے لیے جارہا ہے، اس لیے ایک ایک آدمی کی جان قیمتی ہے، لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو بات کہہ دی گئی ہے اور جو وعدہ کرلیا گیا ہے، اس وعدہ کی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔

## خلاف شریعت کام کرکے نفاذِ شریعت کا کیا مطلب؟

یہ جہاد کوئی ملک حاصل کرنے کے لیے نہیں ہورہا ہے، کوئی اقتدار حاصل کرنے کے لیے نہیں ہورہا ہے، بلکہ یہ جہاد حق کی سربلندی کے لیے ہورہا ہے اور حق کو پامال کرکے جہاد کیا جائے؟ گناہ کا ارتکاب کرکے اللہ تعالیٰ کے دین کا کام کیا جائے؟ یہ نہیں ہوسکتا، آج ہم لوگوں کی یہ ساری کوششیں بیکار جارہی ہیں اور ساری کوششیں بے اثر ہورہی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ گناہ کرکے اسلام کی تبلیغ کریں، گناہ کرکے اسلام کو نافذ کریں، ہمارے دل ودماغ پر ہر وقت ہزاروں تاویلیں مسلط رہتی ہیں، چنانچہ کہا جاتا

ہے کہ اس وقت مصلحت کا یہ تقاضہ ہے، چلو شریعت کے اس حکم کو نظر انداز کردو اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت مصلحت اس کام کے کرنے میں ہے، چلو یہ کام کرلو۔

## فضیلت سے محرومی برداشت مگر وعدہ خلافی برداشت نہیں:

لیکن وہاں تو ایک ہی مقصود تھا یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہونا، نہ مال مقصود ہے، نہ فتح مقصود ہے، نہ بہادر کہلانا مقصود ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہوجائے اور اللہ تعالیٰ کی رضا اس میں ہے کہ جو وعدہ کرلیا گیا ہے، اس کو نبھاؤ، چنانچہ حضرت حذیفہ اور ان کے والد حضرت یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہما دونوں کو غزوہ بدر جیسی فضیلت سے محروم رکھا گیا، اس لیے کہ یہ دونوں جنگ میں شرکت نہ کرنے پر زبان دے کر آئے تھے، یہ ہے وعدہ کا ایفاء

## فتح حاصل کرنے کیلئے جنگی تدبیر پر حضرت معاویہ کا واقعہ:

اگر آج اس کی مثال تلاش کریں، تو اس دنیا میں ایسی مثالیں کہاں ملیں گی؟ ہاں! محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں میں ایسی مثالیں مل جائیں گی، انہوں نے یہ مثالیں قائم کیں، حضرت معاویہؓ ان صحابہ کرام میں سے ہیں، جن کے بارے میں لوگوں نے معلوم نہیں کیا کیا غلط قسم کے پروپیگنڈے کیے ہیں؟ اللہ تعالیٰ بچائے۔ (آمین) لوگ ان کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں، ان کا ایک قصہ سن لیجئے

حضرت معاویہؓ چونکہ شام میں تھے، اس لیے روم کی حکومت سے ان کی ہر وقت جنگ رہتی تھی، ان کے ساتھ برسرپیکار رہتے تھے اور روم اس وقت کی سپر پاور سمجھی جاتی تھی اور بڑی عظیم الشان عالمی طاقت تھی، ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ نے ان کے ساتھ جنگ بندی کا معاہدہ کرلیا اور تاریخ متعین کرلی کہ اس تاریخ تک ہم ایک دوسرے سے جنگ نہیں کریں گے، ابھی جنگ بندی کے معاہدے کی مدت ختم نہیں ہوئی تھی، اس وقت حضرت معاویہؓ کے دل میں خیال آیا کہ جنگ بندی کی مدت تو درست ہے، لیکن اس مدت کے اندر میں اپنی فوجیں رومیوں کی سرحد پر لیجا کر ڈال دوں، تاکہ جس وقت جنگ بندی کی مدت ختم ہو، اس وقت میں فوراً حملہ کردوں، اس لیے کہ دشمن کے ذہن میں تو یہ ہوگا کہ جب جنگ بندی کی مدت ختم ہوگی، پھر کہیں جاکر لشکر روانہ ہوگا اور یہاں آنے میں وقت لگے گا، اس

لیے معاہدہ کی مدت ختم ہوتے ہی فوراً مسلمانوں کا لشکر حملہ آور نہیں ہوگا، اس لیے وہ اس حملے کے لیے تیار نہیں ہوں گے، لہٰذا اگر میں اپنا لشکر سرحد پر ڈال دوں گا اور مدت ختم ہوتے ہی فوراً حملہ کر دوں گا تو جلدی فتح ہو جائے گی۔

چنانچہ حضرت معاویہؓ نے اپنی فوجیں سرحد پر ڈال دیں اور فوج کا کچھ حصہ سرحد کے اندران کے علاقے میں ڈال دیا اور حملہ کے لیے تیار ہو گئے اور جیسے ہی جنگ بندی کے معاہدے کی آخری تاریخ کا سورج غروب ہوا، فوراً حضرت معاویہؓ نے لشکر کو پیش قدمی کا حکم دے دیا، چنانچہ جب لشکر نے پیش قدمی کی، تو یہ چال بڑی کامیاب ثابت ہوئی، اس لیے کہ وہ لوگ اس حملے کے لیے تیار نہیں تھے اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا شکر شہر کے شہر، بستیاں کی بستیاں فتح کرتا ہوا چلا جارہا تھا، اب فتح کے نشے کے اندر پورا لشکر آگے بڑھتا جارہا تھا کہ اچانک دیکھا کہ کہ اب پیچھے سے ایک گھوڑا سوار دوڑتا چلا آرہا ہے، اس کو دیکھ کر حضرت معاویہؓ اس کے انتظار میں رک گئے، کہ شاید یہ امیر المومنین کا کوئی نیا پیغام لے کر آیا اور جب وہ گھوڑا سوار قریب آیا، تو اس نے آوازیں دینا شروع کر دیں۔

اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ قِفُوْا عِبَادَ اللّٰهِ قِفُوْا عِبَادَ اللّٰهِ.

اللہ کے بندو ٹھہر جاؤ، اللہ کے بندو ٹھہر جاؤ، جب وہ اور قریب آیا، تو حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دیکھا کہ وہ حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ: وَفَاءٌ لَا غَدَرَ، وَفَاءٌ لَا غَدَرَ۔ مومن کا شیوہ وفاداری ہے، غداری نہیں ہے، عہد شکنی نہیں ہے، حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں نے تو کوئی عہد شکنی نہیں کی ہے، میں نے تو اس وقت حملہ کیا، جب جنگ بندی کی مدت ختم ہو گئی تھی، حضرت عمر بن عبسہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اگر چہ جنگ بندی کی مدت ختم ہو گئی تھی، لیکن آپ نے اپنی فوجیں جنگ بندی کی مدت کے دوران ہی سرحد پر ڈال دیں اور فوج کا کچھ حصہ سرحد سے اندر بھی داخل کر دیا تھا اور یہ جنگ بندی کے معاہدے کی خلاف ورزی تھی اور میں نے اپنے ان کانوں سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ۔

مَنْ كَانَ بَيْنَهُ وَ بَيْنَ قَوْمٍ عَهْدٌ فَلَا يَحُلَّنَّهُ وَلَا يَشُدَّنَّهُ اِلٰى اَنْ يَمْضِيَ اَجَلٌ لَهُ اَوْ ينبذالهم علی سواء۔ (ترمذی کتاب الجہاد باب فی الغدر)

یعنی جب تمہارا کسی قوم کے ساتھ معاہدہ ہو، تو اس وقت تک عہد نہ کھولے اور نہ باندھے، یہاں تک کہ اس کی مدت نہ گزر جائے یا ان کے سامنے پہلے کھلم کھلا یہ اعلان کردے کہ ہم نے وہ عہد ختم کردیا، مدت گزرنے سے پہلے، یا عہد کے ختم کرنے کا اعلان کیے بغیر ان کے علاقے کے پاس لے جاکر فوجوں کو ڈال دینا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے مطابق آپ کے لیے جائز نہیں تھا۔

اب آپ اندازہ لگایئے کہ ایک فاتح لشکر جو دشمن کا علاقہ فتح کرتا ہوا جارہا ہے اور بہت بڑا علاقہ فتح کر چکا ہے اور فتح کے نشے میں چور ہے، لیکن جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کان میں پڑا کہ اپنے عہد کی پابندی مسلمان کے ذمے لازم ہے، اسی وقت حضرت معاویہؓ نے حکم دے دیا کہ جتنا علاقہ فتح کیا ہے، وہ سب واپس کردو، چنانچہ پورا علاقہ واپس کردیا اور اپنی سرحد میں دوبارہ واپس آگئے، پوری دنیا کی تاریخ میں کوئی قوم اس کی نظیر پیش نہیں کرسکتی، اس نے صرف عہد شکنی کی بناء پر اپنا مفتوحہ علاقہ اس طرح واپس کردیا ہو، لیکن یہاں پر چونکہ کوئی زمین کا حصہ پیش نظر نہیں تھا، کوئی اقتدار اور سلطنت مقصود نہیں تھی، بلکہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا تھا، اس لیے جب اللہ تعالیٰ کا حکم معلوم ہوگیا کہ وعدہ کی خلاف ورزی درست نہیں ہے اور چونکہ یہاں وعدہ کی خلاف ورزی کا تھوڑا سا شائبہ پیدا ہورہا تھا، اس لیے واپس لوٹ گئے، یہ ہے وعدہ کہ جب زبان سے بات نکل گئی، تو اب اس کی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔

## حضرت فاروق اعظمؓ کی طرف سے عہد کی پاسداری کا واقعہ:

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جب بیت المقدس فتح کیا، تو اس وقت وہاں پر جو عیسائی اور یہودی تھے، ان سے یہ معاہدہ ہوا کہ ہم تمہاری حفاظت کریں گے، تمہارے جان و مال کی حفاظت کریں گے اور اس کے معاوضے سے تم ہمیں جزیہ ادا کروگے، جزیہ ایک ٹیکس ہوتا ہے، جو غیر مسلموں سے وصول کیا جاتا ہے، چنانچہ جب معاہدہ ہوگیا، وہ لوگ ہر سال جزیہ ادا کرتے تھے، ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ مسلمانوں کا دوسرے دشمنوں سے معرکہ پیش آگیا، جس کے نتیجے میں وہ فوج جو بیت المقدس میں متعین تھی، ان کی ضرورت پیش آئی، کسی نے یہ مشورہ دیا کہ اگر فوج کی کمی ہے، تو بیت المقدس میں فوجیں بہت زیادہ

ہیں، اس لیے وہاں سے ان کو محاذ پر بھیج دیا جائے، حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا کہ یہ مشورہ اور تجویز تو بہت اچھی ہے اور فوجیں وہاں سے اٹھا کر محاذ پر بھیج دو، لیکن اس کے ساتھ ایک کام اور بھی کرو، وہ یہ کہ بیت المقدس کے جتنے عیسائی یہودی ہیں، ان سب کو ایک جگہ جمع کرواور ان سے کہو کہ ہم نے آپ کی جان و مال کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا اور یہ معاہدہ کیا تھا کہ آپ کے جان و مال کی حفاظت کریں گے اور اس کام کے لیے ہم نے وہاں فوج ڈالی ہوئی تھی، لیکن اب ہمیں دوسری جگہ فوج کی ضرورت پیش آ گئی ہے، اس لیے ہم آپ کی حفاظت نہیں کر سکتے، لہٰذا اس سال آپ سے ہمیں جزیہ بطور ٹیکس ادا کیا ہے، وہ ہم آپ کو واپس کر رہے ہیں اور اس کے بعد ہم اپنی فوجوں کو یہاں سے لے جائیں گے اور اب آپ اپنی حفاظت کا انتظام خود کریں۔ یہ مثالیں ہیں اور میں کسی تردید کے خوف کے بغیر کہہ سکتا ہوں کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی مثال پیش نہیں کر سکتی، کہ جس نے اپنے مخالف مذہب والوں کے ساتھ اس طرح کا معاملہ کیا ہو۔

## وعدہ خلافی کی مروجہ صورتیں:

بہر حال منافق کی دوسری علامت جو اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہے کہ وہ یہ کہ وعدہ کی خلاف ورزی اور وعدہ کو توڑنا، ایک منافق کی نشانی ہے اس سے ہر مسلمان کو بچنا چاہیے، لیکن جیسے میں نے جھوٹ کے بارے میں پچھلے جمعہ کو عرض کیا تھا کہ جھوٹ کی بہت سی صورتیں ایسی ہیں جن کو ہم اور آپ نے بالکل شیر مادر سمجھ لیا ہے اور ان کو جھوٹ کی فہرست میں سے خارج کر دیا ہے، ان کو جھوٹ سمجھتے ہی نہیں ہے، اسی طرح وعدہ خلافی کی بھی بعض صورتیں وہ ہیں، جن کو وعدہ خلافی کی فہرست سے خارج کر دیا ہے، چنانچہ اگر کسی سے پوچھا جائے کہ وعدہ خلافی اچھی چیز ہے؟ تو جواب میں وہ یہی کہے گا کہ یہ تو بہت بری چیز ہے، لیکن عملی زندگی میں جب موقع آتا ہے، تو اس وقت وہ وعدہ خلافی کر لیتا ہے اور اس کو وعدہ خلافی سمجھتا ہی نہیں، کہ یہ وعدہ خلافی ہے۔

## ملکی قوانین کی پابندی نہ کرنا وعدہ خلافی ہے:

مثلاً ایک بات عرض کرتا ہوں، جس کی طرف عام لوگوں کی توجہ نہیں ہے اور اس کو دین

کا معاملہ نہیں سمجھتے، میرے والد ماجد حضرت مفتی شفیع صاحب قدس اللہ سرہ اللہ تعالی ان کے درجات بلند فرمائے۔ (آمین) وہ فرمایا کرتے تھے کہ وعدہ صرف زبانی نہیں ہوتا، بلکہ وعدہ عملی بھی ہوتا ہے، مثلا ایک شخص ایک ملک میں بطور باشندے کے رہتا ہے، تو وہ شخص عملاً اس حکومت سے وعدہ کرتا ہے کہ میں آپ کے ملک کے قوانین کی پابندی کروں گا، لہذا اب اس شخص پر اس وعدہ کی پابندی کرنا واجب ہے، جب تک اس ملک کا قانون اس کو کسی گناہ کے کرنے پر مجبور نہ کرے، اس لیے کہ اگر قانون اس کو گناہ کرنے پر مجبور کررہا ہے، تو پھر اس قانون پر عمل کرنا جائز نہیں، اس لیے کہ اس کے بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا صاف ارشاد ہے کہ:

لاَ طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ

یعنی خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں۔ (مصنف ابن ابی شیبہ: ۱۲/ ۵۴۶)

لہذا ایسے قانون کی پابندی نہ صرف یہ کہ واجب نہیں، بلکہ جائز بھی نہیں، لیکن اگر کوئی قانون ایسا ہے، جو آپ کو گناہ اور معصیت پر مجبور نہیں کررہا ہے، اس قانون کی پابندی اس کے لیے واجب ہے کیونکہ اپ نے عملاً اس بات کا وعدہ کررکھا ہے کہ میں اس ملک کے قانون کی پابندی کروں گا۔

## حضرت موسی علیہ السلام اور فرعون کا قانون:

اس کی مثال میں حضرت والد صاحب رحمتہ اللہ علیہ حضرت موسی علیہ السلام کا قصہ سنایا کرتے تھے کہ حضرت موسی علیہ السلام فرعون کے ملک میں رہتے تھے اور نبی بننے سے پہلے اس قبطی کو مکا مار کر قتل کردیا تھا، جس کا واقعہ مشہور ہے اور قرآن کریم نے بھی اس واقعہ کو ذکر کیا ہے اور حضرت موسی علیہ السلام اس قتل پر استغفار کیا کرتے تھے اور فرماتے کہ

﴿لَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ﴾ (سورۃ الشعراء ۱۴)

یعنی میرے اوپر ان کا ایک گناہ ہے اور میں نے ان کا ایک جرم کیا ہے، حضرت موسی علیہ السلام اس کو جرم اور گناہ قرار دیتے تھے اور اس پر استغفار فرمایا کرتے تھے، اگرچہ حضرت موسی علیہ السلام نے یہ قتل جان بوجھ کر نہیں کیا تھا، بلکہ ایک مظلوم کی مدد فرمائی تھی اور یہ اندازہ نہیں تھا کہ مکا مارنے سے وہ مرجائے گا، اس لیے یہ حقیقتا گناہ نہیں تھا اور

حضرت موسی علیہ السلام کی عصمت کے منافی بھی نہیں تھا، لیکن چونکہ صورت گناہ کی سی تھی، اس لیے آپ نے اسے گناہ سے تعبیر فرمایا، اب سوال پیدا ہوتا تھا کہ وہ قبطی جس کو موسی علیہ السلام نے قتل کیا تھا، وہ تو کافر تھا اور کافر بھی حربی تھا، لہذا اگر اسے جان بوجھ کر قتل کرتے، تو اس حربی کو قتل کرنے میں کیا گناہ ہوا؟ حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ اس لیے گناہ ہوا، کہ جب حضرت موسی علیہ السلام ان کے شہر میں رہ رہے ہیں، تو عملاً اس بات کا وعدہ کر رکھا ہے کہ ہم آپ کے ملک کے قوانین کی پابندی کریں گے اور ان کا قانون یہ تھا کہ کسی کو قتل کرنا جائز نہیں، اس لیے حضرت موسی علیہ السلام نے جو قتل کیا، وہ اس قانون کی خلاف ورزی میں کیا، لہذا ہر حکومت کا ہر شہری، چاہے حکومت مسلمانوں کی ہو یا غیر مسلم حکومت ہو، عملاً اس بات کا وعدہ کرتا ہے کہ وہ اس ملک کے قانون کی پابندی کرے گا، جب تک وہ قانون کسی گناہ پر مجبور نہ کرے۔

## ''ویزا'' لینا بھی ایک عملی وعدہ ہے:

اسی طرح جب آپ ویزہ لے کر دوسرے ملک جاتے ہیں، چاہے وہ غیر مسلم ملک ہو، مثلاً ہندوستان، امریکہ یا یورپ ویزہ لے کر چلے گئے، یہ ویزہ عملاً ایک وعدہ ہے کہ ہم حتی الامکان اس ملک کے قوانین کی پابندی کریں گے، جب تک وہ قانون کسی گناہ پر مجبور نہ کرے، ہاں اگر وہ قانون گناہ پر مجبور کرے، تو پھر اس قانون کی پابندی جائز نہیں، لہذا جو قوانین ایسے ہیں، جو انسان کو کسی گناہ پر مجبور نہیں کرتے، یا نا قابل برداشت ظلم کا سبب نہیں بنتے، ان قوانین کی پابندی بھی وعدہ کی پابندی میں داخل ہے۔

## ٹریفک کے قانون کی پابندی وعدہ میں داخل ہے:

مثلاً ٹریفک کا قانون ہے کہ دائیں طرف چلو، یا بائیں طرف چلو، یا یہ قانون ہے کہ جب سگنل کی لال بتی جلے، تو رک جاؤ اور جب سبز بتی جلے تو چل پڑو، اب ایک شہری ہونے کی حیثیت سے آپ نے اس بات کا وعدہ کیا ہے کہ ان قوانین کی پابندی کروں گا، لہذا اگر کوئی شخص ان قوانین کی پابندی نہ کرے، تو وہ وعدہ خلافی ہے اور گناہ ہے، لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ٹریفک کے قانون کی خلاف ورزی کرلی، تو اس میں گناہ کی کیا بات ہے؟

یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ آدمی اپنے کو بڑا سیانہ اور ہوشیار جتانے کے لیے خلاف ورزی بھی کرر ہا ہے اور قانون کی گرفت میں بھی نہیں آرہا ہے۔

## ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کئی اعتبار سے گناہ ہے:

یاد رکھئے! یہ کئی اعتبار سے گناہ ہے: ایک تو اس حیثیت سے گناہ ہے کہ یہ وعدہ کی خلاف ورزی ہے۔ دوسرے اس حیثیت سے بھی گناہ ہے یہ قوانین تو اس لیے بنائے گئے ہیں، تا کہ نظم و ضبط پیدا ہو اور اس کے ذریعہ سے ایک دوسرے کو نقصان اور تکلیف پہنچانے کے راستے بند ہوں، لہٰذا اگر آپ نے قانون کی خلاف ورزی کی اور اس سے کسی کو نقصان پہنچ گیا، تو اس نقصان کی دنیا و آخرت کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔

## جائز قوانین کی پابندی دین کا حصہ ہے:

یہ سب باتیں اس لیے بتارہا ہوں کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان باتوں کا دین سے کیا تعلق ہے؟ یہ تو دنیاداری کی باتیں ہیں، ان کی پابندی کی کیا ضرورت ہے؟ خوب سمجھ لیجئے! یہ اللہ تبارک تعالیٰ کا دین ہے، جو ہماری زندگی کے ہر شعبے میں داخل ہے اور دینداری صرف ایک شعبے کی حد تک محدود نہیں ہے، خلاصہ یہ ہے کہ جو قانون کسی گناہ پر مجبور کرے اس کی تو کسی حال میں بھی اطاعت جائز نہیں اور جو قانون نا قابل برداشت ظلم کرے، اس کی بھی پابندی نہیں کرنی ہے، لیکن اس کے علاوہ جتنے قوانین ہیں، ان کی پابندی شرعاً بھی ہمارے ذمے واجب ہے، اگر ان کی پابندی نہیں کریں گے، تو وعدہ خلافی کا گناہ ہوگا۔ لہٰذا بہت سی چیزیں ایسی ہیں، جن کو ہم وعدہ خلافی سمجھتے ہیں اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کو ہم وعدہ خلافی نہیں سمجھتے، مگر وہ وعدہ خلافی اور گناہ کے اندر داخل ہیں، ان سے پرہیز کرنے کی ضرورت ہے، دین ہماری زندگی کے ہر شعبے کے اندر داخل ہے، ان تمام چیزوں کا لحاظ نہ کرنا دین کے خلاف ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

(اصلاحی خطبات: جلد سوم)

باب ہفتم کا دوسرا بیان:

# عہد اور وعدہ کی اہمیت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَ نُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَ نَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا. اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ﴾ (سورۃ المؤمنون:۱تا۸)

آمَنْتُ بِاللّٰهِ وَصَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ وَصَدَقَ رَسُوْلُهُ النَّبِيُّ الْكَرِيْمُ وَنَحْنُ عَلٰى ذٰلِكَ لَمِنَ الشَّاهِدِيْنَ وَالشَّاكِرِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ .

## تمہید:

بزرگان محترم اور برادران عزیز سورۃ المومنون کی ابتدائی آیات میں نے آپ کے سامنے تلاوت کیں، ان کی تشریح کا سلسلہ کافی عرصہ سے چل رہا ہے اور ہم اس آیت کریمہ تک پہنچے ہیں، جس میں اللہ تعالیٰ نے فلاح پانے والے مومنوں کی صفات بیان کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ﴾

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی امانتوں کا لحاظ کرتے ہیں اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں، امانتوں کی رعایتوں سے متعلق میں نے گذشتہ دو جمعوں میں قدرے تفصیل کے ساتھ اس کی مختلف صورتیں بیان کی تھیں کہ امانت میں کیا کیا چیزیں داخل ہوتی ہیں؟ اور امانت میں خیانت کرنا اور امانت کے پاس نہ رکھنے کی کیا کیا صورتیں ہمارے معاشرے میں رائج ہو چکی ہیں؟ اور ان سب سے بچنے کی ضرورت ہے۔

## قرآن وحدیث میں عہد کی اہمیت:

دوسری چیز جو اس آیت کریمہ میں بیان کی گئی ہے، وہ عہد کا لحاظ رکھنا، یعنی مومن کا کام یہ ہے کہ وہ جو عہد کرتا ہے یا جو وعدہ کر لیتا ہے، وہ اس کا پورا پاس کرتا ہے، پورا لحاظ کرتا ہے، اس کی خلاف ورزی نہیں کرتا، قرآن کریم کی بہت سی آیات میں اللہ تعالیٰ نے وعدہ اور عہد کی پاسداری کا حکم دیا ہے، ایک آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ﴾ (بنی اسرائیل ۳۴)

یعنی جو عہد کرو، اس کو پورا کرو، کیونکہ اس عہد کے بارے میں تم سے آخرت میں سوال ہوگا، کہ تم نے فلاں وعدہ کیا تھا، اس کو پورا کیا یا نہیں کیا؟ فلاں عہد کیا تھا پورا کیا یا نہیں کیا؟ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ﴾ (المائدہ ۱)

اے ایمان والو! تم آپس میں کسی کے ساتھ عہد و پیمان باندھ لو، تو اس کو پورا کرو، بہرحال قرآن کریم میں جگہ جگہ اس کی تاکید آئی ہے اور یہ بھی مسلمان کے مسلمان ہونے کی علامت قرار دی گئی کہ مسلمان کبھی عہد شکنی نہیں کرتا، جو وعدہ کرتا ہے، اس کو پورا کرتا ہے اور وعدہ کو پورا نہ کرنا یہ منافق کی علامت قرار دی گئی ہے۔

ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ، اِذَا حَدَّثَ كَذِبَ، وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ، وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ.

منافق کی تین علامتیں ہیں: جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو وعدے کی خلاف ورزی کرے اور جب اس کے پاس کوئی امانت رکھوائی جائے تو اس

میں خیانت کرے۔ (بخاری کتاب الایمان باب علامات المنافق)

## وعدہ کرنے سے پہلے سوچ لو:

اس سے معلوم ہوا کہ ان تینوں میں سے کوئی کام بھی مومن کا کام نہیں، مسلمان کا کام نہیں کہ وہ جھوٹ بولے یا وعدہ خلافی کرے یا امانت میں خیانت کرے، آدمی وعدہ کرنے سے پہلے سو مرتبہ سوچ لے کہ میں اس وعدے کو پورا کرسکوں گا یا نہیں؟ وعدہ میں جلدی کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن جب سوچ سمجھ کر مشورہ کر کے تمام نتائج کو سامنے رکھنے کے بعد جب ایک وعدہ کرلیا، تو اب مسلمان کا کام یہ ہے کہ اس وعدے پر قائم رہے، صرف ایک صورت ہے، جو شریعت نے جائز قرار دی ہے، وہ یہ ہے کہ کسی کام کے کرنے کا وعدہ کیا تھا، لیکن کوئی حقیقی عذر پیش آ گیا اور عذر کی حالت اللہ تعالیٰ نے مستثنیٰ فرمائی ہے، اس صورت میں دوسرے آدمی کو بتا دے کہ میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا، لیکن مجھے کچھ عذر پیش آ گیا ہے، جس کی وجہ سے یہ وعدہ پورا کرنے سے قاصر ہوں۔

## عذر کی صورت میں اطلاع دینا ضروری ہے:

مثلاً فرض کریں کہ آپ نے کسی سے وعدہ کرلیا کہ میں کل تمہارے گھر آؤں گا اور ارادہ بھی تھا کہ کل اس کے گھر جائیں گے، لیکن بعد میں تم بیمار ہوگئے، یا گھر میں کوئی اور بیمار ہوگیا اور اس کی دیکھ بھال کے لیے اس کے پاس رہنا ضروری ہے اور جانا ممکن نہیں ہے، تو یہ ایک عذر ہے اور عذر کی صورت میں اگر کوئی شخص وعدہ پورا نہ کرے، تو شریعت میں اس کی گنجائش ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرما دیتے ہیں، البتہ اس صورت میں حتی الامکان اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ سامنے والے کو ایسے وقت میں بتا دیا جائے کہ وہ کسی الجھن اور پریشانی میں مبتلا نہ ہو، بہر حال وعدہ پورا کرنا ایمان کی علامت ہے اور وعدے کی خلاف ورزی کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے نفاق کی علامت قرار دیا ہے۔

## بچوں کیساتھ بھی وعدہ خلافی جائز نہیں:

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک

صحابی کسی بچے کو اپنے پاس بلانا چاہتے تھے اور وہ بچہ ان کے پاس نہیں آرہا تھا اور آنے سے انکار کررہا تھا، ان صحابی نے اس بچے کو ترغیب دینے کے لیے یہ کہہ دیا کہ آؤ بیٹا ہمارے پاس آجاؤ، ہم تمہیں ایک چیز دیں گے، جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے یہ الفاظ سنے کہ ہم تم کو ایک چیز دیں گے، تو آپ نے ان صحابی سے پوچھا کہ یہ بتاؤ کہ تمہارا واقعی اس بچے کو چیز دینے کا ارادہ تھا یا ویسے ہی بہلانے کے لیے آپ نے اس سے یہ کہہ دیا تھا؟ ان صحابی نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس ایک کھجور تھی اور میرا ارادہ تھا کہ جب وہ آئے گا، تو اس کو کھجور دے دوں گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر واقعی تمہارا کھجور دینے کا ارادہ تھا، تو ٹھیک، لیکن اگر تمہارا دل میں اس کو کچھ دینے کا اردہ نہیں تھا، بلکہ محض اس کو اپنے پاس بلانے کے لیے اس کو یہ کہہ دیا کہ ہم تمہیں ایک چیز دیں گے، تو یہ تمہاری طرف سے وعدہ خلافی ہوگی۔

## بچے کے ساتھ وعدہ کرکے پورا کرنا ضروری ہے:

اور بچے کے ساتھ وعدہ خلافی کرنے میں دہرا نقصان ہے، ایک نقصان تو وعدہ خلافی کے گناہ کا ہے اور دوسرا نقصان یہ ہے کہ پہلے دن سے ہی بچے کے ذہن میں آپ یہ بات ڈال رہے ہیں کہ وعدہ کرکے مکر جانا کوئی خرابی کی بات نہیں، بچہ کا ذہن ایسا صاف ہوتا ہے کہ جیسے سادہ اس پر جو چیز نقش کردی جائے تو ہمیشہ کے لیے وہ چیز نقش ہو جاتی ہے، گویا کہ پہلے دن سے آپ نے جو وعدہ خلافی کا بیج بچے کے ذہن میں بو دیا، اب اگر وہ بچہ آئندہ کبھی بھی وعدہ خلافی کرے گا، تو اس وعدہ خلافیوں کے گناہ میں آپ بھی حصہ دار ہوں گے، اس لیے کہ آپ نے اپنے طرز عمل سے اس کو وعدہ خلاف بنا دیا، اس لیے بچے کے ساتھ خاص طور پر اس بات کا اہتمام کرنا چاہیے کہ یا تو بچہ سے وعدہ کرو نہیں، اگر وعدہ کرو، تو اس کو پورا کردو، تاکہ بچے کو یہ احساس ہو کہ جب کوئی وعدہ کیا جاتا ہے، تو اس کو پورا کیا جاتا ہے۔

## بچے کے اخلاق بگاڑنے میں والدین مجرم ہیں:

ہمارے معاشرے میں اس معاملے کے اندر غفلت اور بے احتیاطی بہت عام ہے کہ

بچے کو تعلیم دلانے کے لیے اچھے اسکول میں داخل کر دیا، لیکن گھر کا ماحول ایسا بنایا ہوا ہے، جس سے اس بچے کا مزاج و مذاق، اس کے اخلاق و کردار خراب ہو رہے ہیں، مثلاً گھر سے باہر کہیں جا رہے ہیں اور بچہ ضد کر رہا ہے کہ میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا، اب آپ نے اس بچے سے جان چھڑانے کی خاطر کوئی وعدہ کر لیا کہ میں تمہارے لیے ایک چیز لے کر آتا ہوں، یہ کہہ کر آپ چلے گئے، آپ نے اس بچے کو بہلا تو دیا، لیکن جو وعدہ آپ نے اس بچے کے ساتھ کیا، وہ پورا نہیں کیا، تو ایک طرف تو آپ وعدہ خلافی کے مجرم بنے، دوسرے یہ کہ اس بچے کی تربیت خراب کرنے کے مجرم بنے، اس بچے کا ذہن پہلے دن سے آپ نے خراب کر دیا، لہٰذا بچے کے ساتھ معاملات کرنے میں بہت احتیاط کرنی چاہیے۔

## بچوں کے ذریعے جھوٹ بلوانے کا خطرناک معاملہ:



ہمارے معاشرے میں یہ بات بھی بکثرت عام ہے کہ ایک شخص آپ کے گھر پر آپ سے ملنے کے لیے آیا، یا کسی کا فون آیا اور بچے نے آ کر آپ کو اطلاع دی کہ فلاں صاحب آپ سے ملنے کے لیے آئے ہیں، یا فلاں صاحب آپ سے فون پر بات کرنا چاہتے ہیں، اب آپ کا ان صاحب سے بات کرنے کو اور ملنے کو دل نہیں چاہ رہا ہے، اس لیے آپ نے بچے سے کہہ دیا کہ جاؤ، ان سے کہہ دو کہ ابو گھر پر نہیں ہیں، اب بچہ تو یہ دیکھ رہا ہے کہ ابا جان گھر پر موجود ہیں، لیکن میرے ابا گھر میں موجود ہونے کے باوجود مجھ سے کہلوا رہے ہیں کہ جا کر جھوٹ بول دو، کہ گھر پر موجود نہیں ہیں، تو آج جب آپ اس سے جھوٹ بلوائیں گے، تو کل جب وہ جھوٹ بولے گا، تو کس منہ سے آپ اس کو جھوٹ بولنے سے روکیں گے؟ اس لیے کہ آپ نے خود اس کو جھوٹ بولنے کا عادی بنا دیا، اپنے ذرا سے مفاد کی خاطر جھوٹ کی سنگینی اس بچے کے دماغ سے مٹا دی، تو اب اگر وہ بچہ جھوٹ بولے گا اور اس بچے کو جھوٹ کی عادت پڑ جائے گی، تو اس گناہ میں آپ بھی برابر کے شریک ہوں گے اور آپ نے اس بچے کی زندگی تباہ کر دی، اس لیے کہ جو آدمی جھوٹ بولنے کا عادی ہوتا ہے، تو دنیا میں کہیں بھی اس پر اعتماد نہیں کیا جاتا، اس پر بھروسہ نہیں ہوتا، اس لیے بچوں کے ساتھ معاملات کرنے میں خاص طور پر بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، بچوں کو سچائی سکھائی جائے، ان کو امانت داری سکھائی جائے، ان کو وعدے کی

پابندی سکھائی جائے۔

## حضور کا وعدے کی پاسداری کی خاطر تین دن انتظار کرنا:

روایات میں ایک واقعہ آتا ہے کہ جو نبوت کے عطا ہونے سے پہلے کا واقعہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی شخص کے ساتھ معاملہ ہوا اور آپس میں یہ طے ہوا کہ فلاں جگہ پر کل کو آپس میں ملاقات کریں گے، دن، جگہ اور وقت سب طے ہوگیا، جب وقت مقررہ آیا، تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس جگہ پر پہنچ گئے، اب آپ وہاں کھڑے ہوگئے، مگر وہ شخص نہیں آیا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم وہاں کھڑے رہے، روایات میں آتا ہے کہ تین دن تک متواتر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کا انتظار کیا، صرف ضرورت کے لیے گھر جاتے، پھر واپس اس جگہ آجاتے، تین دن بعد جب وہ صاحب آئے، تو آپ نے صرف اتنا کہا کہ تم نے وعدے پر نہ آکر مجھے تکلیف پہنچائی، تو صرف وعدے کو پورا کرنے کے لیے کہ کہیں اس وعدے کی خلاف ورزی نہ ہوجائے، تین دن تک متواتر آپ نے وہاں انتظار فرمایا۔

(یہاں تکرار تھا اس لئے کچھ حصہ بیان کا حذف کردیا گیا پچھلے بیان میں قصے بیان ہوچکے)

بہرحال مومن کا کام یہ ہے کہ وہ عہد اور وعدے کی پابندی کرے اللہ تعالی ہمیں وعدے کی پابندی کی توفیق عطا فرمائے اور ہر طرح کی عہد شکنی اور خلاف ورزی سے محفوظ رکھے، اس کی مزید تفصیل اگر اللہ تعالی نے زندگی دی تو اگلے جمعہ کو عرض کروں گا۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.

(اصلاحی خطبات: جلد: ۱۵)

روح کی بیماریاں اور ان کا علاج

# باب ...... (۸)



## امانت کی اہمیت

## امانت میں خیانت اور اس کی مروجہ صورتیں

باب ہشتم کا پہلا بیان:

# امانت کی اہمیت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَ نُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَ نَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا. اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ ﴾ (سورۃ المؤمنون: ا تا ۸)
آمَنْتُ بِاللّٰهِ وَصَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ وَصَدَقَ رَسُوْلُهُ النَّبِيُّ الْكَرِيْمُ وَنَحْنُ عَلٰى ذٰلِكَ لَمِنَ الشَّاهِدِيْنَ وَالشَّاكِرِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ .

## تمہید:

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز سورۃ المومنون کی ابتدائی آیتوں کا بیان کئی مہینوں سے چل رہا ہے، یہ وہ آیتیں ہیں جن میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے فلاح پانے والے مومنوں کی صفات بیان فرمائی ہیں:

۱)...... پہلی صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرنے والے ہیں

۲)...... دوسری صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ لغو اور بے ہودہ کاموں اور باتوں سے

اعراض کرنے والے ہیں۔

۳)...... تیسری صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ زکوۃ انجام دیتے ہیں، اس کے دو معنی عرض کیے تھے کہ ایک یہ کہ وہ لوگ زکوۃ کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ اپنے اخلاق کا تزکیہ کرتے ہیں۔

۴)...... چوتھی صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، یعنی اپنی عفت اور عصمت کا تحفظ کرنے والے ہیں اس صفت کا بیان پچھلے پانچ چھ جمعوں میں ہوتا رہا ہے۔

## امانت اور عہد کی پاسداری رکھنا:



اس سے اگلی صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ لوگ اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس رکھنے والے ہیں، آج اس آیت کریمہ کا بیان اللہ تعالی کے فضل وکرم سے شروع کرنے کا ارادہ ہے، یعنی ایک مومن کی دنیا وآخرت دونوں کی فلاح کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی امانت کا پاس رکھے اور اپنے عہد کا پاس رکھے، قرآن کریم میں یہ دونوں چیزیں الگ الگ بیان فرمائی ہیں، ایک امانت اور ایک عہد، مومن کی علامت یہ ہے کہ وہ امانتوں کا پاس رکھنے والا ہے اور اپنے عہد کو پورا کرنے ولا ہے۔

## امانت قرآن وحدیث کی روشنی میں:

ان میں پہلی چیز امانت ہے اور فلاح کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا کہ انسان امانت میں کوئی خیانت نہ کرے، بلکہ امانت کو ٹھیک ٹھیک اس کے اہل تک پہنچائے، قرآن کریم میں اللہ تعالی فرماتے ہیں:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰى اَهْلِهَا﴾(النساء :۵۸)

یعنی اللہ تعالی تمہیں حکم دیتے ہیں کہ امانتوں کو ان کے مستحق لوگوں تک پہنچاؤ، قرآن وحدیث میں اس کی بڑی تاکید وارد ہوئی ہے، ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا، اِذَا حَدَّثَ كَذِبَ وَاِذَا وَعَدَ

أَخْلَفَ وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ. (بخاری۔ کتاب الایمان باب علامات المنافق)

یعنی تین چیزیں ایسی ہیں کہ اگر وہ کسی انسان میں پائی جائیں، تو وہ خالص منافق ہے:

۱)......پہلی یہ ہے کہ جب وہ بات کرے تو جھوٹ بولے۔

۲)......دوسری یہ کہ جب وہ کسی سے وعدہ کرے، تو وعدہ کی خلاف ورزی کرے۔

۳)......اور (تیسری یہ کہ) جب اس کے پاس کوئی امانت رکھوائی جائے یا جب اس کو کسی چیز کا امانت دار بنایا جائے، تو وہ اس میں خیانت کرے۔

یہ منافق کی علامات ہیں، مومن کا کام نہیں، اس لیے اس کی بڑی تاکید وارد ہوئی ہے۔

## امانت اٹھ چکی اور ہر طرف خیانت پھیل چکی:

آج ہمارے معاشرے میں خیانت پھیل گئی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد ہمارے اس دور پر صادق آرہا ہے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ایک وقت ایسا آجائے گا کہ امانت دنیا سے اٹھ جائے گی اور لوگ کہا کریں گے کہ فلاں ملک میں، فلاں شہر میں، فلاں بستی میں ایک شخص رہتا ہے، وہ امانتدار ہے، یعنی امانت دار لوگ ختم ہو جائیں گے، سب خائن ہو جائیں گے اور اکا دکا لوگ ہوں گے، جو امانت کا پاس رکھنے والے ہوں گے، ایک مومن کی خاصیت یہ ہے کہ وہ خیانت نہیں کرتا۔

## حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امانت داری ملاحظہ فرمایئے!

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے پہلے بھی پورے مکہ میں صادق اور امین کے لقب سے مشہور تھے، یعنی آپ سچے تھے، آپ کی زبان پر کبھی جھوٹ نہیں آتا تھا، آپ امانت دار تھے، جو لوگ آپ کے پاس امانت رکھواتے تھے، ان کو پورا پورا بھروسہ ہوتا تھا، کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس امانت کا حق ادا کریں گے، چنانچہ جب آپ مکہ مکرمہ سے ہجرت فرما رہے تھے، اس وقت یہ عالم تھا کہ کفار نے ظلم وستم کے پہاڑ توڑے ہوئے تھے، آپ کے خلاف قتل کے منصوبے بنائے جا رہے تھے، اس حالت میں رات کے وقت آپ کو اپنے شہر مکہ مکرمہ سے نکلنا پڑا، اس وقت بھی آپ کو یہ فکر تھی کہ میرے پاس لوگوں کی جو

امانتیں رکھی ہوئی ہیں، ان کو اگر پہنچاؤں گا، تو یہ راز کھل جائے گا کہ میں یہاں سے جا رہا ہوں، تو آپ نے حضرت علیؓ کو ساری امانتیں سپرد فرمائیں، تم یہ امانتیں ان کے مالکوں تک پہنچاؤ اور جب اس کام سے فارغ ہو جاؤ، تو پھر ہجرت کر کے مدینہ منورہ آجانا اور وہ امانتیں صرف مسلمانوں کی نہیں تھیں، بلکہ کافروں کی بھی تھیں، وہ کافر جو آپ کے خون کے پیاسے تھے، جو آپ کے ساتھ دشمنی کا معاملہ کر رہے تھے، ان کی امانتوں کو بھی ان تک پہنچانے کا انتظام فرمایا۔

## غزوہ خیبر کے موقع پر اسود چرواہے کا واقعہ:

غزوہ خیبر کے موقع پر جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے قلعوں کا محاصرہ کیا ہوا تھا، خیبر میں یہودی آباد تھے اور ان کی خصلت شروع ہی سے سازشی ہے، مسلمانوں کے خلاف سازشوں کے جال بنتے رہتے تھے اور خیبر ان کی سازشوں کا مرکز بنا ہوا تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی سازشوں سے امت مسلمہ کو بچانے کے لیے خیبر شہر کا محاصرہ کیا، یہ شہر کئی قلعوں پر مشتمل تھا، یہودی اس محاصرے کے دوران شہر کے اندر بند تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فوجوں نے ان کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔

جب محاصرے کو چند دن گزر گئے، تو ایک چرواہا جس کا نام روایتوں میں اسود آتا ہے، جو لوگوں کی بکریں چرایا کرتا تھا، وہ بکریاں چرانے کی خاطر قلعے سے باہر نکلا، باہر نکل کر اس نے دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا لشکر محاصرہ کیے ہوئے ہے، اس چرواہے کے دل میں یہ خیال آیا کہ میں جا کر دیکھوں کہ یہ کون لوگ ہیں اور ان کا پیغام کیا ہے؟ یہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ ان کی دعوت کیا ہے؟ چنانچہ وہ اپنی بکریوں کو چراتے ہوئے لشکر کے قریب آ گیا اور لشکر والوں سے پوچھنے لگا کہ آپ کا بادشاہ کہاں ہے؟ صحابہ کرامؓ نے جواب دیا کہ ہمارے یہاں بادشاہ تو کوئی نہیں ہے، البتہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالی کے رسول ہیں اور ان کی قیادت میں ہم لوگ یہاں آئے ہیں، وہ ہمارے قائد ہیں، اس چرواہے نے کہا کہ کیا میں ان کو دیکھ سکتا ہوں؟ صحابہ کرامؓ نے فرمایا کہ کیوں نہیں دیکھ سکتے؟ چرواہے نے پوچھا کہ ان کا محل کہاں ہے؟ صحابہ کرامؓ نے فرمایا کہ ان کا کوئی محل

نہیں ہے، وہ سامنے کھجوروں کے پتوں کا چھپر ہے، اس کے اندر تشریف فرما ہیں، جاؤ اور جا کر ان سے مل لو، اس چرواہے نے کہا کہ میں جا کر بادشاہ سے مل لوں؟ میں تو ایک غلام آدمی ہوں، سیاہ فام ہوں، میری رنگت کالی ہے، بکریاں چراتا ہوں، میں کسی بادشاہ سے کیسے مل سکتا ہوں؟ صحابہ کرامؓ نے جواب میں کہا کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی سے ملنے میں کوئی عار نہیں ہے، چاہے وہ کیسا بھی آدمی ہو۔

چنانچہ چرواہا حیرت کے عالم میں حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خیمے میں پہنچ گیا اور اندر جا کر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی سعادت حاصل کی، اس چرواہے نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا آپ کیوں آئے ہیں؟ آپ کی دعوت کیا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اللہ کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں اور اللہ تعالی کی طرف سے توحید کا پیغام لے کر آیا ہوں، کہ اس کائنات میں اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اس لیے صرف اللہ کی عبادت کی جائے، یہی میری بنیادی دعوت ہے، اس چرواہے نے کہا اگر میں اس دعوت کو قبول کرلوں اور اللہ کے سوا ہر معبود کا انکار کردوں، تو میرا انجام کیا ہوگا؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مرنے کے بعد ایک دوسری زندگی آنے والی ہے اور یہ موجودہ زندگی تو عارضی ہے، ناپائیدار ہے، ہر ایک کو اس دنیا سے جانا ہے اور مرنے کے بعد جو زندگی ملے گی، وہ دائمی اور ابدی ہوگی اور اس کی کوئی انتہا نہیں، اس ابدی زندگی میں اللہ تعالیٰ تمہیں بہت اعلی مقام عطا فرمائیں گے۔

پھر چرواہے نے سوال کیا کہ اچھا اگر میں مسلمان ہوگیا، تو یہ مسلمان مجھے کیا سمجھیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ تمہیں اپنا بھائی سمجھیں گے اور تمہیں اپنے سینے سے لگائیں گے، اس چرواہے نے حیرت سے پوچھا کہ مجھے سینے سے لگائیں گے، جبکہ میں سیاہ فام آدمی ہوں اور میرے سینے سے بدبو اٹھ رہی ہے، اس حالت میں کوئی مالدار آدمی مجھے سینے سے لگانے کے لیے تیار نہیں، آپ فرما رہے ہیں کہ یہ مسلمان مجھے گلے لگائیں گے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اگر تم اللہ کی وحدانیت پر ایمان لے آتے ہو، تو اللہ تمہاری بدبو کو خوشبو میں تبدیل کردیں گے اور تمہارے چہرے کی سیاہی کو تابناکی میں تبدیل کردیں گے، اس اللہ کے بندے کے دل پر

اتنا اثر پڑا کہ اس نے پورا کلمہ پڑھا۔

اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ ۔

اور ایمان لے آیا۔ ایمان لانے کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں ایمان لے آیا ہوں اور اب آپ کے ہاتھ میں ہوں، جو آپ حکم دیں گے، اس کو بجا لاؤں گا، لہٰذا اب آپ مجھے بتائیں کہ میں کیا کروں؟ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پہلا کام یہ کرو گے کہ یہ بکریاں جو تم لے کر آئے ہو، یہ تمہارے پاس ان مالکوں کی امانتیں ہیں، تم اس معاہدے کے تحت یہ بکریاں لائے ہو کہ تم ان کو چراؤ گے اور چرنے کے بعد ان کو واپس کردو گے، لہٰذا پہلا کام یہ کرو کہ ان بکریوں کو واپس لے جاؤ اور خیبر کے اندر لے جا کر ان کے مالکوں تک پہنچادو۔

## سخت حالات میں امانت کی پاسداری کا حکم:

ذرا اندازہ لگایئے کہ حالت جنگ ہے اور دشمن کے قلعے کا محاصرہ کیا ہوا ہے اور جنگ کی حالت میں نہ صرف یہ کہ دشمن کی جان لینا جائز ہوتا ہے، بلکہ جنگ کی حالت میں اس کے مال پر بھی قبضہ کرلینا جائز ہوتا ہے، ساری دنیا کا یہی قانون ہے اور اس وقت مسلمانوں کے پاس کھانے کی کمی تھی اور کھانے کی کمی کا یہ عالم تھا کہ اس غزوہ خیبر کے موقع پر بعض صحابہ کرامؓ نے مجبور ہو کر گدھے ذبح کر کے ان کا گوشت پکا کر کھانے کی کوشش کی، بعد میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ گدھے کا گوشت کھانا جائز نہیں ہے، چنانچہ گدھے کے گوشت کی پکی ہوئی دیگیں الٹی گئیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کس حالت میں تھے؟ لیکن چونکہ وہ چرواہا ایک معاہدے کے تحت وہ بکریاں لے کر آیا تھا، اس لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پہلے وہ بکریاں واپس کردو اس کے بعد میرے پاس آنا۔

## تلوار کے سائے میں عبادت:

چنانچہ وہ چرواہا قلعے کے اندر گیا اور قلعے کے اندر بکریاں چھوڑیں اور پھر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کیا کہ یارسول اللہ! اب کیا کروں؟ اب صورت

حال یہ تھی کہ نہ تو اس وقت کسی نماز کا وقت تھا کہ آپ اس کو نماز کا حکم دیتے، نہ رمضان کا مہینہ تھا کہ آپ اس کو روزے کا حکم دیتے اور نہ وہ اتنا مالدار تھا کہ اس کو زکوۃ کا حکم دیتے، نہ حج کا موسم تھا کہ اس سے حج کرایا جاتا، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس وقت تو ایک عبادت ہو رہی ہے جو تلواروں کے سائے میں انجام دی جا رہی ہے، وہ ہے جہاد فی سبیل اللہ، لہذا تم اس جہاد میں شامل ہو جاؤ، اس چرواہے نے کہا کہ اگر میں جہاد میں شامل ہو گیا، تو اس میں امکان یہ بھی ہے کہ میں مر جاؤں، اگر میں مر گیا تو میرا کیا ہوگا؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم شہید ہو گئے، تو اللہ تعالی تمہارے چہرے کی سیاہی کو سفیدی میں تبدیل فرما دیں گے اور تمہارے بدن کی بدبو کو خوشبو سے تبدیل کر دیں گے، چنانچہ وہ اللہ کا بندہ جہاد میں شامل ہو گیا اور مسلمانوں کی طرف سے لڑا اور شہید ہو گیا۔

## نماز، روزہ، زکوۃ اور حج کئے بغیر جنت میں پہنچ گیا:

جب غزوہ خیبر ختم ہوا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میدان جنگ کا جائزہ لینے کے لیے باہر نکلے ہوئے تھے، ایک جگہ دیکھا کہ صحابہ کرام کا ہجوم ہے، آپ قریب پہنچے اور پوچھا کیا بات ہے؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ جو لوگ جہاد میں شہید ہوئے ہیں، اس میں ہمیں ایک لاش نظر آ رہی ہے، جو ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھی، اس آدمی سے ہم لوگ واقف نہیں ہیں، اس لیے سب آپس میں رائے زنی کر رہے ہیں کہ یہ کون آدمی ہے؟ اور کس طرح شہید ہوا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے دکھاؤ، آپ نے دیکھا، تو یہ وہی چرواہا تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ تم اس کو نہیں پہچانتے، لیکن میں اس کو پہچانتا ہوں، یہ وہ شخص ہے جس نے اپنی زندگی میں اللہ کے واسطے ایک سجدہ بھی نہیں کیا اور جس نے اپنی زندگی میں اللہ کے واسطے ایک پیسہ خرچ نہیں کیا، لیکن میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ اللہ تعالی نے اس کو سیدھا جنت میں پہنچا دیا ہے اور میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ اللہ تبارک وتعالی اس کے جسم کی سیاہی کو سفیدی میں تبدیل فرما رہے ہیں اور اس کے جسم کی بدبو کو مشک وعنبر سے زیادہ حسین خوشبو سے تبدیل کر دیا ہے۔

## مشکل وقت میں امانت کی اہمیت کا اندازہ لگائیں:

اب دیکھئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عین حالت جنگ میں جہاں میدان کارزار کھلا ہوا، جہاں لوگ ایک دوسرے کے خلاف جانیں لینے کے لیے تیار ہیں، وہاں پر بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو گوارنہیں فرمایا کہ یہ چرواہا امانت میں خیانت کرے اور مسلمان ان بکریوں پر قبضہ کرلیں، بلکہ ان بکریوں کو واپس فرمایا، یہ ہے امانت کی اہمیت اواس کی پاسداری، جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مبارک عمل سے ثابت کیا، لہذا امانت میں خیانت کرنا یہ مومن کا کام نہیں، اسی لیے حدیث شریف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ جب وہ کسی شخص میں پائی جائی جائیں وہ پکا منافق ہے:

۱)......ایک یہ کہ جب بات کرے تو جھوٹ بولے

۲)......اور جب وعدہ کرے تو اس وعدہ کی خلاف ورزی کرے

۳)......اور جب اس کے پاس کوئی چیز امانت رکھوائی جائے تو وہ اس میں خیانت کرے۔

یہ تین اوصاف جس انسان میں پائے جائیں گے، تو وہ مومن نہیں کہلائے گا، بلکہ وہ منافق ہے۔

اللہ تعالی ہم سب کو امانت کا پاس رکھنے کی توفیق عطا فرمائے

اور خیانت سے ہر مسلمان کو بچائے آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین.

(اصلاحی خطبات: جلد:۱۵)

باب ہشتم کا دوسرا بیان:

# امانت میں خیانت اور اس کی مروجہ صورتیں

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا. اَمَّا بَعْدُ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ آیَۃُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ اِذَا حَدَّثَ کَذِبَ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَاِذَا اُؤْتُمِنَ خَانَ وَفِیْ رِوَایَۃٍ وَاِنْ صَامَ وَصَلّٰی وَزَعَمَ اَنَّہٗ مُسْلِمٌ.

(صحیح بخاری کتاب الایمان باب علامات المنافق)

## تمہید:

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منافق کی تین نشانیاں بیان فرمائیں ہیں اور ارشارہ اس بات کی طرف فرمادیا کہ یہ تین کام مومن کے کام نہیں ہیں اور جس میں یہ تین باتیں پائی جائیں، وہ صحیح معنی میں مسلمان اور مومن کہلانے کا مستحق نہیں، ان میں سے دو کا بیان پچھلے دو جمعوں میں الحمدللہ قدرے تفصیل کے ساتھ ہوگیا تھا، اللہ تعالیٰ ہمیں اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

## امانت کی تاکید:

منافق کی تیسری علامت جو بیان فرمائی وہ ہے، امانت میں خیانت، یعنی مسلمان کا کام نہیں ہے کہ وہ امانت میں خیانت کرے، بلکہ یہ منافق کا کام ہے، بہت سی آیات اور

احادیث میں امانت پر زور دیا گیا ہے اور امانت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی تاکید فرمائی گئی ہے، چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰى اَهْلِهَا﴾ (۵۸ سورہ النساء)

یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتے ہیں کہ امانتوں کو ان کے اہل تک اور ان کے مستحقین تک پہنچاؤ اور اس کی اتنی تاکید فرمائی گئی ہے کہ ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَةَ لَهٗ. (مسند احمد: ۳/ ۱۳۵)

یعنی جس کے اندر امانت نہیں، اس کے اندر ایمان بھی نہیں، گویا کہ ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ آدمی امین ہو، امانت میں خیانت نہ کرتا ہو۔

## امانت کا صحیح تصور اور اس کی حقیقت:

لیکن آج کی مجلس میں جس بات کی طرف توجہ دلائی، یہ وہ یہ ہے کہ ہم نے لوگوں نے ان تمام چیزوں کا مطلب اور مفہوم بہت محدود سمجھا ہوا ہے، ہمارے ذہنوں میں امانت کا تصور صرف اتنا ہے کہ کوئی شخص پیسے لے کر آئے اور یہ کہے کہ یہ پیسے بطور امانت اپنے پاس رکھ لیجئے، جب ضرورت ہوگی، اس وقت میں آپ سے واپس لے لوں گا، تو یہ امانت ہے اور اگر کوئی شخص امانت میں خیانت کرتے ہوئے ان پیسوں کو کھا کر ختم کردے، یا جب وہ شخص اپنے پیسے مانگنے آئے، تو اس کو دینے سے انکار کردے، تو یہ خیانت ہوئی، ہمارے ذہنوں میں امانت اور خیانت کا بس اتنا ہی تصور ہے، اس سے آگے نہیں ہے۔

بے شک یہ بھی امانت میں خیانت کا حصہ ہے، لیکن قرآن وحدیث کی اصطلاح میں امانت اس حد تک محدود نہیں، بلکہ امانت کا مفہوم بہت وسیع ہے اور بہت ساری چیزیں امانت میں داخل ہیں، جن کے بارے میں اکثر وبیشتر ہمارے ذہنوں میں یہ خیال بھی نہیں آتا کہ یہ بھی امانت ہے اور اس کے ساتھ امانت جیسا سلوک کرنا چاہیے۔

## امانت کا معنی ومفہوم:

عربی زبان میں امانت کے معنی یہ ہیں کہ کسی شخص پر کسی معاملے میں بھروسہ کرنا، لہٰذا ہر وہ

چیز جو دوسرے کو اس طرح سپرد کی گئی ہو کہ سپرد کرنے والے نے اس پر بھروسہ کیا ہو کہ یہ اس کا حق ادا کرے گا، یہ ہے امانت کی حقیقت، لہذا کوئی شخص کوئی کام یا کوئی چیز یا کوئی مال جو دوسرے کے سپرد کرے اور سپرد کرنے والا اس بھروسے پر سپرد کرے، کہ یہ شخص اس سلسلے میں اپنے فریضے کو صحیح طور پر بجالائے گا اور اس میں کوتاہی نہیں کرے گا، یہ امانت ہے، لہذا امانت کی اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے، تو بے شمار چیزیں اس میں داخل ہو جاتی ہیں۔

## یوم اَلَسْتُ میں اقرار اور عہد:

اللہ تعالیٰ نے یوم اَلَسْتُ میں انسانوں سے جو عہد لیا تھا کہ میں تمہارا پروردگار ہوں یا نہیں؟ اور تم میری اطاعت کرو گے یا نہیں؟ تمام انسانوں نے اقرار کیا تھا کہ ہم آپ کی اطاعت کریں گے، اس عہد کو قرآن کریم نے سورۃ احزاب کے آخری رکوع میں امانت سے تعبیر فرمایا کہ

﴿ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ﴾

یعنی ہم نے زمین پر امانت پیش کی اور اس سے پوچھا کہ تم اس امانت کے بوجھ کو اٹھاؤ گی؟ تو اس نے اس امانت کے اٹھانے سے انکار کر دیا، پھر آسمانوں پر پیش کی کہ تم یہ امانت اٹھاؤ گے؟ انہوں نے بھی انکار کر دیا اور پھر پہاڑوں پر یہ امانت پیش کی کہ تم اس امانت کے بوجھ کو اٹھاؤ گے؟ انہوں نے بھی امانت اٹھانے سے انکار کر دیا، سب اس امانت کو اٹھانے سے ڈر گئے، لیکن جب یہ امانت اس حضرت انسان پر پیش کی گئی، تو بڑے بہادر بن کر آگے بڑھ کر اقرار کر لیا کہ میں اس امانت کو اٹھاؤں گا، چنانچہ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ انسان بڑا ظالم اور جاہل تھا کہ اتنے بڑے بوجھ کو اٹھانے کے لیے بڑھ گیا اور یہ نہ سوچا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اس امانت کے بوجھ کو اٹھانے سے عاجز رہ جاؤں، جس کی وجہ سے میرا انجام خراب ہو جائے۔

## آیت قرآنی میں امانت سے کیا مراد ہے؟

بہر حال اس بوجھ کو اللہ تعالیٰ نے امانت کے لفظ سے تعبیر فرمایا، یہ امانت کیا چیز تھی؟ جو

انسان پر پیش کی جا رہی تھی؟ چنانچہ مفسرین نے فرمایا کہ یہاں امانت کے معنی یہ ہیں کہ اس انسان سے یہ کہا جا رہا تھا کہ تمہیں ایک زندگی دی جا رہی ہے اور اس میں تمہیں اچھے کام کرنے کا بھی اختیار دیا جائے گا اور برے کام کرنے کا بھی اور جب اچھے کام کرو گے، تو ہماری خوشنودی حاصل ہوگی اور جنت کی ابدی اور دائمی نعمتیں تمہیں حاصل ہوں گی اور اگر برے کام کرو گے، تو اس کے نتیجے میں تم پر ہمارا غضب ہوگا اور جہنم کا ابدی عذاب تم پر ہوگا، اب بتاؤ تمہیں ایسی زندگی منظور ہے یا نہیں؟ چنانچہ اور سب نے انکار کر دیا، لیکن انسان اس کے لیے تیار ہو گیا۔ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ اسی کو بیان فرماتے ہیں:

آسمان بار امانت نتواند کشید
قرعہ فال بنام من دیوانہ زد

یعنی آسمان نے تو یہ بوجھ نہیں اٹھا، اس نے تو انکار کر دیا، کہ یہ میرے بس بات نہیں ہے، لیکن یہ حضرت انسان مشقت استخوان نے یہ بوجھ اٹھا لیا اور قرعہ فال میرے نام پر پڑ گیا، بہر حال قرآن کریم نے اس کو امانت سے تعبیر فرمایا ہے۔

## انسان کا وجود اور انسان کی زندگی امانت ہے:

یہ پوری زندگی ہمارے پاس امانت ہے اور اس امانت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس زندگی کو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے مطابق گزار دیں، لہذا سب سے بڑی امانت جو ہر انسان کے پاس ہے، جس سے کوئی انسان بھی مستثنیٰ نہیں ہے، وہ امانت خود اس کا وجود اور اس کی زندگی اور اس کے اعضاء و جوارح، اس کے اوقات، اس کی توانائیاں ہیں، یہ سب کی سب امانت ہیں، کیا کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ جو اپنے اس ہاتھ کا مالک ہوں، یہ آنکھ جو مجھے ملی ہوئی ہے، اس کا مالک ہوں، ایسا نہیں، بلکہ یہ سارے اعضاء ہمارے پاس امانت ہیں، ہم اس کے مالک نہیں ہیں، کہ جس طرح چاہیں ان کو استعمال کریں، بلکہ اعضاء کی یہ نعمتیں اللہ تعالیٰ نے ہمیں استعمال کے لیے عطا فرمائی ہیں، لہذا اس امانت کا تقاضہ یہ ہے کہ ان اعضاء کو، اپنے اس وجود کو، اپنی صلاحیتوں کو اور اپنی توانائیوں کو اسی کام میں صرف کریں، جس کام کے لیے دی گئی ہیں، اس کے علاوہ دوسرے کاموں میں صرف کریں، تو یہ امانت میں خیانت ہوگی۔

## آنکھ ایک نعمت:

مثلاً آنکھ اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے، جو اس نے ہمیں عطا فرمائی ہے اور یہ ایسی نعمت ہے کہ ساری دنیا کی مال و دولت خرچ کر کے اس کو حاصل کرنا چاہے، تو حاصل نہیں ہو سکتی ،لیکن اس کی قدر اس لیے نہیں ہے کہ پیدائش کے وقت سے یہ سرکاری مشین لگی ہوئی اور کام کر رہی ہے، اس کے حاصل کرنے میں نہ تو کوئی پیسہ لگتا ہے اور نہ محنت کرنی پڑتی ہے، لیکن جس دن اللہ نہ کرے، اس کی آنکھ کی بینائی پر ادنی سا نقص آجائے اور اس بات کا اندیشہ ہو کہ کہیں میری بینائی نہ چلی جائے، اس وقت اس کی قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے اور اس وقت آدمی ساری دولت ایک آنکھ کی بینائی کے لیے خرچ کرنے پر تیار ہو جاتا ہے اور یہ ایسی سرکاری مشین ہے کہ نہ اس کی سروس کی ضرورت ہے، نہ اس کی اور ہالنگ کی ضرورت، نہ اس کا ماہانہ خرچ، نہ ٹیکس، نہ کرایہ بلکہ مفت ملی ہوئی ہے۔

## آنکھ ایک امانت ہے:

لیکن یہ مشین اللہ تعالیٰ نے بطور امانت کے دے رکھی ہے اور یہ فرما دیا ہے کہ مشین کو استعمال کرو، اس کے ذریعہ دنیا کو دیکھو، دنیا کا نظارہ کرو، دنیا کے مناظر سے لطف اٹھاؤ، سب کچھ کرو، لیکن صرف چند چیزوں کو دیکھنے سے منع کر دیا کہ اس سرکاری مشین کو ان کاموں میں استعمال نہ کریں، مثلاً حکم دے دیا کہ اس کے ذریعہ نامحرم پر نگاہ نہ ڈالی جائے ،اب اگر اس کے ذریعہ ہم نے نامحرم کی طرف نگاہ ڈالی، تو یہ اللہ تعالیٰ کی امانت میں خیانت ہوگی، اسی لیے قرآن کریم نے نامحرم کی طرف نگاہ کرنے کو خیانت سے تعبیر فرمایا ،چنانچہ فرمایا کہ۔

﴿يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ﴾ (۹۔غافر)

یعنی آنکھوں کی خیانت کو اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ تم نے اس کو ایسی جگہ استعمال کیا، جہاں استعمال کرنے سے اللہ تعالیٰ نے منع فرما دیا تھا، یہ ایسا ہے، جیسا کہ کسی شخص نے دوسرے کے پاس اپنا مال بطور امانت رکھوایا اور اب وہ چوری چھپے آنکھ بچا کر اس کا مال استعمال کرنا چاہتا ہے، وہی معاملہ وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کے ساتھ بھی کرتا ہے اور

بے وقوف کو یہ پتہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کوئی عمل چھپ نہیں سکتا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آنکھوں کی خیانت کو بڑا گناہ اور جرم قرار دیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر وعیدیں بیان فرمائیں۔

اور اگر آنکھ کی امانت اور نعمت کو صحیح جگہ استعمال کرو، تو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا نزول ہوتا ہے، حدیث شریف میں ہے کہ اگر ایک شخص باہر سے گھر کے اندر داخل ہوا اور اس نے اپنی بیوی کو محبت کی نگاہ سے دیکھا اور بیوی نے شوہر کو محبت کی نگاہ سے دیکھا، تو اس وقت اللہ تعالیٰ دونوں کو محبت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اس لیے کہ اس نے اس امانت کو صحیح جگہ پر استعمال کیا، اگرچہ اپنی ذاتی لذت کے لیے اپنے فائدے کے لیے کیا، مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق کیا، اس لیے ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت نازل ہوئی۔

## کان ایک امانت ہے:

اللہ تبارک تعالیٰ نے کان سننے کے لیے عطا فرمایا ہے اور پھر ہر چیز سننے کی اجازت دے دی، صرف چند چیزوں پر پابندی لگا دی کہ تم گانا بجانا مت سننا، موسیقی مت سننا، غیبت مت سننا، غلط اور جھوٹی باتیں مت سننا، لہذا اگر کان ان چیزوں کے سننے میں استعمال ہو رہا ہے، تو یہ امانت میں خیانت ہے۔

## زبان ایک امانت ہے:

زبان اللہ تعالیٰ کی ایک ایسی نعمت ہے، جو پیدائش کے وقت سے چل رہی ہے اور مرتے دم تک چلتی رہتی ہے، زبان کی ذرا سی حرکت سے نہ جانے کیا کیا کام انسان لے رہا ہے، یہ زبان اتنی بڑی نعمت ہے، کہ اگر ایک مرتبہ زبان کو حرکت دے کر یہ کہہ دو، سبحان اللہ الحمد للہ۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے میزان عمل کا آدھا پلڑا ابھر جاتا ہے، اس لیے اس کے ذریعہ آخرت کی تیاری کرنی چاہیے، لیکن اگر اس زبان کو جھوٹ بولنے میں استعمال کیا، غیبت کرنے میں استعمال کیا، مسلمان کی دل آزاری کرنے میں استعمال کیا، دوسروں کو تکلیف پہنچانے میں استعمال کیا، تو یہ امانت میں خیانت ہے۔

## انسان کا پورا جسم امانت ہے:

یہ تو صرف اعضاء کی بات تھی، ہمارا یہ پورا وجود، پورا جسم اللہ تعالیٰ کی امانت ہے، بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ جسم ہمارا اپنا ہے، لہٰذا اس کے ساتھ ہم جو چاہیں کریں، حالانکہ ایسا نہیں ہے، بلکہ یہ جسم اللہ تعالیٰ کی امانت ہے، اسی لیے شریعت میں خودکشی کرنا حرام ہے، اگر یہ جسم ہمارا اپنا ہوتا، تو خودکشی کیوں حرام ہوتی؟ وہ اس لیے حرام ہے کہ یہ جان، یہ جسم، یہ وجود، یہ اعضاء حقیقت میں ہماری ملکیت نہیں ہے، بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ملکیت ہیں۔

مثلاً یہ کتاب میری ملکیت ہے، اب اگر میں کسی شخص سے کہوں کہ یہ کتاب تم لے جاؤ، میرے لیے ایسا کرنا جائز ہے، لیکن اگر کوئی شخص دوسرے سے کہے کہ مجھے قتل کر دو، میری جان لے لے، اب اس نے قتل کرنے کی اجازت دیدی، اسٹام پیپر پر لکھ دیا، دستخط کر دیئے، مہر بھی لگا دی ہے، سب کچھ کر دیا، لیکن اس کے باوجود جس کو قتل کی اجازت دی گئی ہے، اس کے لیے قتل کرنا جائز نہیں، کیوں؟ اس لیے کہ یہ جان اس کی ملکیت ہی نہیں، اگر اس کی ملکیت ہوتی، تب وہ دوسرے کو اس کے لینے کی اجازت دے سکتا تھا، لہٰذا جب ملکیت نہیں، تو پھر دوسرے کو اجازت دینے کا بھی حق حاصل نہیں ہے۔



## گناہ کرنا خیانت ہے:

اللہ تعالیٰ نے یہ پورا وجود، پوری جان، یہ صلاحیتیں اور توانائیاں یہ سب ہمیں امانت کے طور پر عطا فرمائیں، لہٰذا اگر غور سے دیکھا جائے، تو یہ پوری زندگی امانت ہے، اس لیے زندگی کا کوئی کام اور ان اعضاء سے کیا جانے والا کوئی عمل، کوئی قول، کوئی فعل ایسا نہ ہو، جو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اس امانت میں خیانت کا سبب بنے، لہٰذا امانت کا جو محدود تصور ہمارے ذہنوں میں ہے کوئی شخص آ کر پیسے رکھوائے گا اور ہم صندوقچی کھول کر اس کے وہ پیسے رکھیں گے اور تالہ لگا دیں گے، اب اگر ان پیسوں کو نکال کر خرچ کر لیا، تو یہ خیانت ہوگی، امانت کا اتنا محدود تصور غلط ہے، بلکہ یہ پوری زندگی ایک امانت ہے اور زندگی کا ایک ایک قول و فعل امانت ہے۔

لہٰذا یہ جو فرمایا کہ امانت میں خیانت کرنا نفاق کی علامت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جتنے بھی گناہ ہیں، چاہے وہ آنکھ کا گناہ ہو، یا کان کا گناہ ہو، یا زبان کا گناہ ہو، یا کسی اور عضو کا گناہ ہو، وہ سارے امانت میں خیانت کے اندر داخل ہیں اور وہ مومن کے کام نہیں ہیں، بلکہ منافق کے کام ہیں۔

## عاریت کی چیز بھی امانت ہے:

یہ تو امانت کے بارے میں عام باتیں تھیں، لیکن امانت کے کچھ خاص شعبے بھی ہیں، بعض اوقات ہم ان کو امانت نہیں سمجھتے اور امانت جیسی حفاظت نہیں کرتے، مثلاً عاریت کی چیز ہے، عاریت اس کو کہتے ہیں کہ ایک آدمی کو ایک چیز کی ضرورت تھی، وہ چیز اس کے پاس نہیں تھی، اس لیے اس نے وہ چیز استعمال کرنے کے لیے دوسرے سے مانگ لی، کہ مجھے فلاں چیز کی ضرورت ہے، تھوڑی دیر کے لیے دے دو، اب یہ عاریت کی چیز امانت ہے، مثلاً ایک کتاب پڑھنے کو میرا دل چاہ رہا ہے، لیکن وہ کتاب میرے پاس نہیں تھی، اس لیے میں نے دوسرے شخص سے پڑھنے کے لیے وہ کتاب مانگ لی، کہ میں پڑھ کر واپس کر دوں گا، اب یہ کتاب میرے پاس عاریت ہے، شریعت کی اصطلاح اس کو عاریت کہا جاتا ہے اور یہ عاریت کی چیز امانت ہوتی ہے، لہٰذا اس لینے والے شخص کے لیے جائز نہیں کہ وہ اس چیز کو مالک کی مرضی کے خلاف استعمال کرے، بلکہ اسے چاہیے کہ اس عاریت کی چیز کو اس طرح استعمال نہ کرے، جس سے مالک کو تکلیف ہو اور دوسرے یہ کہ اس کو بروقت مالک کے پاس لوٹانے کی فکر کرے۔

## بھیجے گئے کھانے کے برتن امانت ہیں:

حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ نے بے شمار مواعظ میں اس بات پر تنبیہ فرمائی ہے کہ لوگ بکثرت ایسا کرتے ہیں، کہ جب ان کے گھر کسی نے کھانا بھیج دیا، اس بے چارے بھیجنے والے سے یہ غلطی ہوگئی، کہ اس نے آپ کے گھر کھانا بھیج دیا، اب صحیح طریقہ تو یہ تھا کہ وہ کھانا تم دوسرے برتن میں نکال لو اور وہ برتن اس کو فوراً واپس کر دو، مگر ہوتا یہ ہے کہ وہ بے چارہ کھانا بھیجنے والا برتن سے بھی محروم ہو گیا، چنانچہ وہ برتن گھر میں

پڑے ہوئے ہیں، واپس پہنچانے کی فکر نہیں، بلکہ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ ان برتنوں کو خود اپنے استعمال میں لانا شروع کر دیتے ہیں، یہ امانت میں خیانت ہے، اس لیے کہ وہ برتن آپ کے پاس بطور عاریت کے آئے تھے، آپ کو ان کا مالک نہیں بنایا گیا تھا، لہذا ان برتنوں کو استعمال کرنا اور ان کو واپس پہنچانے کی فکر نہ کرنا امانت میں خیانت ہے۔

## عاریت پر لی گئی کتاب امانت ہے:

یا مثلاً آپ نے کسی سے کتاب پڑھنے کے لیے لے لی اور کتاب پڑھ کر اس کو مالک کے پاس واپس نہیں پہنچائی، یہ امانت میں خیانت ہے، حتی کہ اب تو لوگوں میں یہ مقولہ بھی مشہور ہو گیا کہ کتاب کی چوری جائز ہے اور جب کتاب کی چوری جائز ہوگئی، تو امانت میں خیانت بطریق اولی جائز ہوگی، اگر کسی نے کوئی کتاب پڑھنے کے لیے دیدی، تو اب لوٹانے کا کوئی سوال نہیں، حالانکہ یہ باتیں امانت میں خیانت کے اندر داخل ہیں، اسی طرح جتنی عاریت کی چیزیں ہیں، جو آپ کے پاس کسی بھی طریقے سے آئی ہوں، ان کو حفاظت سے رکھنا اور ان کو مالک کی مرضی کے خلاف استعمال نہ کرنا واجب اور فرض ہے، اس کی خلاف ورزی کرنا جائز نہیں۔

## ملازمت کے اوقات امانت ہیں:

اسی طرح ایک شخص نے کہیں ملازمت کر لی اور ملازمت میں آٹھ گھنٹے ڈیوٹی دینے کا معاہدہ ہو گیا، یہ آٹھ گھنٹے آپ نے اس کے ہاتھ فروخت کر دیئے، لہذا آٹھ گھنٹے کے اوقات آپ کے پاس امانت ہے، جس کے یہاں آپ نے ملازمت کی ہے، لہذا اگر ان آٹھ گھنٹوں میں سے ایک منٹ بھی آپ نے کسی ایسے کام میں صرف کر دیا، جس میں صرف کرنے کی مالک کی طرف سے اجازت نہیں تھی، تو یہ امانت میں خیانت ہے، مثلاً ڈیوٹی کے اوقات میں دوست احباب ملنے کے لیے آ گئے، اب ان کے ساتھ ہوٹل میں بیٹھ کر باتیں ہو رہی ہیں، یہ وقت اس میں صرف ہو رہا ہے، حالانکہ یہ وقت تمہارا بکا ہوا تھا، تمہارے پاس امانت تھا، تم نے اس وقت کو باتوں میں اور ہنسی مذاق میں گزار دیا، تو یہ امانت میں خیانت ہے۔ اب بتائیے ہم لوگ کتنے غافل ہیں کہ جو اوقات ہمارے بکے

ہوئے ہیں، ہم ان کو دوسرے کاموں میں صرف کررہے ہیں، یہ امانت میں خیانت ہو رہی ہے اوراس کا نتیجہ یہ ہے کہ مہینے کے آخر میں جو تنخواہ مل رہی ہے، وہ پوری طرح حلال نہیں ہوئی، اس لیے کہ وقت پورا نہیں دیا۔

## دارالعلوم دیو بند کے اساتذہ کا معمول:

دارالعلوم دیو بند کے حضرات اساتذہ کو دیکھئے، حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ صحابہ کرام کے دور کی یادیں تازہ کرائیں، ان حضرات اساتذہ کرام کی تنخواہ دس روپے ماہانہ یا پندرہ روپے ماہانہ ہوتی تھی، لیکن چونکہ جب تنخواہ مقرر ہوگئی اور اپنے اوقات مدرسے کے ہاتھ فروخت کردیئے، اس لیے ان حضرات اساتذہ کا یہ معمول تھا کہ اگر مدرسے کے اوقات کے دوران مہمان یا دوست احباب ملنے کے لیے آتے، تو جس وقت وہ مہمان آتے، فوراً گھڑی دیکھ کر وقت نوٹ کر لیتے اور پھر ان کو جلد از جلد نمٹانے کی فکر کرتے اور جس وقت وہ مہمان چلے جاتے اس وقت گھڑی دیکھ کر وقت نوٹ کر لیتے پورا مہینہ اسی طرح نوٹ کرتے رہتے، پھر جب مہینہ پورا ہو جاتا، تو وہ اساتذہ باقاعدہ درخواست دیتے کہ اس ماہ کے دوران ہم نے اتنا وقت مدرسے کے کام کے علاوہ دوسرے کاموں میں صرف کیا ہے، لہٰذا براہ کرم میری تنخواہ سے اتنے وقت کے پیسے کاٹ لیے جائیں، وہ حضرات اساتذہ اس لیے ایسا کرتے تھے کہ اگر ہم نے اس وقت کی تنخواہ لے لی، وہ تنخواہ ہمارے لیے حرام ہوگئی۔ اس لیے واپس کر دیتے، آج تنخواہ لینے کے لیے تو درخواستیں دی جاتی ہیں، تنخواہ کٹوانے کے درخواست دینے کا آج تصور بھی مشکل ہے۔

## حضرت شیخ الہندؒ کی تنخواہ:

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہ جو دارالعلوم دیو بند کے پہلے طالب علم ہیں، جن کے ذریعہ دارالعلوم دیو بند کا آغاز ہوا، اللہ تعالیٰ نے ان کو علم میں، تقوی میں، معرفت میں بہت اونچا مقام بخشا تھا، جس زمانے میں آپ دارالعلوم دیو بند میں شیخ الحدیث تھے، اس وقت آپ کی تنخواہ دس روپے تھی، پھر جب آپ کی عمر زیادہ ہوگئی اور تجربہ بھی زیادہ ہوگیا، تو اس وقت دارالعلوم دیو بند کی مجلس شوریٰ نے یہ طے کیا کہ

حضرت والا کی تنخواہ بہت کم ہے، جبکہ آپ کی عمر زیادہ ہوگئی ہے، ضروریات بھی زیادہ ہیں، مشاغل بھی زیادہ ہیں، اس لیے تنخواہ بڑھانی چاہیے، چنانچہ مجلس شوری نے یہ طے کیا کہ اب آپ کی تنخواہ دس روپے کی بجائے پندرہ روپے ماہانہ کردی جائے، جب تنخواہ تقسیم ہوئی، تو حضرت والا نے دیکھا کہ اب دس کے بجائے پندرہ روپے ملے ہیں، حضرت والا نے پوچھا کہ یہ پندرہ روپے مجھے کیوں دیئے گئے؟ لوگوں نے بتایا کہ مجلس شوری نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آپ کی تنخواہ دس روپے کی بجائے پندرہ روپے کردی جائے، آپ نے وہ تنخواہ لینے سے انکار کردیا اور دارالعلوم دیوبند کے مہتمم صاحب کے نام ایک درخواست لکھی کہ حضرت آپ نے میری تنخواہ دس روپے کی بجائے پندرہ روپے کردی ہے، حالانکہ اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں، پہلے تو میں نشاط کے ساتھ دو تین گھنٹے سبق پڑھا لیتا تھا اور اب تو میں کم پڑھاتا ہوں، وقت کم دیتا ہوں، لہذا میری تنخواہ میں اضافے کا کوئی جواز نہیں، لہذا جو اضافہ آپ حضرات نے کیا ہے، یہ واپس لے لیا جائے اور میری تنخواہ اسی طرح دس روپے کردی جائے۔

لوگوں نے آکر حضرت والا سے منت سماجت شروع کردی کہ حضرت آپ تو اپنے تقوی اور ورع کی وجہ سے اضافہ واپس کررہے ہیں، لیکن دوسرے لوگوں کے لیے یہ مشکل ہو جائے گی، مگر انہوں نے اپنے لیے اس کو گوارا نہ کیا، کیوں؟ اس لیے کہ ہر وقت یہ فکر لگی ہوئی تھی کہ یہ دنیا تو چند روز کی ہے، اللہ جانے آج ختم ہو جائے، یا کل ختم ہو جائے، لیکن یہ پیسہ جو میرے پاس آرہا ہے، کہیں یہ پیسہ اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو کر وہاں شرمندگی سبب نہ بن جائے۔

دارالعلوم دیوبند عام یونیورسٹی کی طرح نہیں تھا کہ استاذ نے سبق پڑھا دیا اور طالب علم نے سبق پڑھ لیا بلکہ وہ ان اداؤں سے دارالعلوم دیوبند بنا ہے، اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کی فکر سے بنا ہے، اس ورع اور تقوی سے بنا ہے، لہذا یہ اوقات جو ہم نے بیچ دیئے ہیں، یہ امانت ہیں، اس میں خیانت نہ ہونی چاہیے۔

## آج حقوق کے مطالبے کا دور ہے:

آج سارا زور حقوق کے حاصل کرنے پر ہے، حقوق حاصل کرنے کے لیے جلوس اور

جلسے ہو رہے ہیں، نعرے لگائے جا رہے ہیں اور اس بات پر احتجاج ہو رہا ہے کہ ہمیں ہمارا حق دو، ہر شخص یہ مطالبہ کر رہا ہے کہ مجھے میرا حق دو، لیکن کسی کو یہ فکر نہیں کہ دوسروں کے حقوق جو مجھ پر عائد ہو رہے ہیں، وہ میں ادا کر رہا ہوں یا نہیں؟ آج یہ مطالبہ تو ہر شخص کر رہا ہے کہ میری تنخواہ بڑھنی چاہیے، مجھے ترقی ملنی چاہیے، یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ مجھے اتنی چھٹیاں ملنی چاہئیں، مجھے اتنا الاؤنس ملنا چاہیے، لیکن جو فرائض مجھے سونپے گئے ہیں، وہ میں ادا کر رہا ہوں یا نہیں؟ اس کی کوئی فکر نہیں۔

## ہر شخص اپنے فرائض کی نگرانی کرے:

حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ جب تک ہماری یہ ذہنیت برقرار رہے گی کہ میں دوسرے سے حقوق کا مطالبہ کرتا رہوں اور مجھ سے کوئی حقوق کا مطالبہ نہ کرے، میں اپنے فرائض سے غافل رہوں اور دوسروں سے حقوق کا مطالبہ کرتا ہوں، یاد رکھو اس وقت تک دنیا میں کسی کا حق ادا نہیں ہوگا، حق ادا ہونے کا صرف ایک راستہ ہے، جو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتایا ہے، وہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے فرائض کی نگرانی کرے، میرے ذمہ جو فریضہ ہے، میں اس کو ادا کر رہا ہوں یا نہیں؟ جب اس بات کا احساس دل میں ہوگا، تو پھر سب کے حقوق ادا ہو جائیں گے، اگر شوہر کے دل میں یہ احساس ہو کہ میرے ذمے بیوی کے جو فرائض ہیں، میں ان کو ادا کردوں، بس بیوی کا حق ادا ہوگیا، بیوی کے دل میں یہ احساس ہو کہ میرے ذمے شوہر کے جو فرائض ہیں، میں ان کو ادا کردوں، بس شوہر کا حق ادا ہوگیا، مزدور کے دل میں یہ احساس ہو کہ مالک کے میرے ذمے جو فرائض ہیں، میں ان کو ادا کردوں، مالک کا حق ادا ہوگیا اور مالک کے دل میں یہ احساس ہو کہ مزدور کے میرے ذمے جو حقوق ہیں، وہ میں ادا کردوں، مزدور کا حق ادا ہوگیا، جب تک دلوں میں یہ احساس پیدا نہیں ہوگا، اس وقت تک حقوق کے مطالبے کے صرف نعرے ہی لگتے رہیں گے اور تحفظ حقوق کی انجمنیں ہی قائم ہوتی رہیں گی اور جلسے جلوس نکلتے رہیں گے، لیکن اس وقت تک کسی کا حق ادا نہ ہوگا، جب تک اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا احساس نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے مجھے اس کے حقوق کا جواب دینا ہے، بس دنیا میں امن وسکون کا یہی راستہ ہے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

## اوقات میں خیانت کرنا بھی ناپ تول میں کمی میں داخل ہے:

لہذا یہ اوقات ہمارے پاس امانت ہیں، قرآن کریم نے فرمایا کہ:

﴿ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ☆ الَّذِيْنَ إِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ☆ وَإِذَا كَالُوْهُمْ أَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ☆ ﴾ (المطففین ۳)

فرمایا کہ ان لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے، جو ناپ تول میں کمی کرتے ہیں اور جب دوسروں سے وصول کرنے کا وقت آتا ہے، تو پورا پورا وصول کرتے ہیں، تاکہ ذرا بھی کمی نہ ہو جائے، لیکن جب دوسروں کو دینے کا وقت آتا ہے، تو اس میں کم دیتے ہیں اور ڈنڈی مارتے ہیں، ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے، اب لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ناپ تول میں کمی اس وقت ہوتی ہے، جب آدمی کوئی سودا بیچے اور اس میں ڈنڈے مار جائے، حالانکہ علماء نے فرمایا کہ۔ التطفیف فی کل شی۔ یعنی ناپ تول میں کمی ہر چیز میں ہے، لہذا اگر کوئی شخص آٹھ گھنٹے کا ملازم ہے اور وہ پورے آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی نہیں دے رہا ہے، وہ بھی ناپ تول میں کمی کر رہا ہے اور اس عذاب کا مستحق ہو رہا ہے اس کا لحاظ کرنا چاہیے۔

## منصب اور عہدہ کی ذمہ داری کا پھندا:

آج ہم پر یہ بلا جو مسلط ہے کہ اگر کسی کو سرکاری دفتر میں کوئی کام پڑ جائے، تو اس پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے، اس کا کام آسانی سے نہیں ہوتا، بار بار دفتروں کے چکر لگانے پڑتے ہیں، کبھی افسر صاحب سیٹ پر موجود نہیں ہیں، کبھی کہا جاتا ہے کہ آج کام نہیں ہو سکتا، کل کو آنا، جب دوسرے دن پہنچے، تو کہا کہ پرسوں آنا، چکر پر چکر لگوائے جا رہے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنے فرض کا احساس اور امانت کا احساس ختم ہو گیا ہے، اگر کسی کے پاس کوئی منصب ہے، تو وہ کوئی منفعت نہیں ہے، وہ کوئی پھولوں کی سیج نہیں ہے، بلکہ وہ ذمہ داری کا ایک پھندا ہے، حکومت، اقتدار، منصب، عہدہ یہ سب ذمہ داری کے پھندے ہیں، یہ ایسی ذمہ داری ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ فرماتے ہیں کہ اگر دریائے فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا پیاسا مر جائے، تو مجھے ڈر لگتا ہے کہ قیامت کے روز

مجھ سے سوال نہ ہو جائے کہ اے عمر! تیرے عہد خلافت میں فلاں کتا بھوکا پیاسا مر گیا تھا۔

## کیا ایسے شخص کو خلیفہ بنا دوں؟

روایت میں آتا ہے کہ جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر قاتلانہ حملہ ہوا اور آپ شدید زخمی ہو گئے، تو کچھ صحابہ کرام آپؓ کی خدمت میں آئے، اور عرض کیا کہ حضرت آپ دنیا سے تشریف لے جا رہے ہیں، آپ اپنے بعد کسی کو خلیفہ اور جانشین نامزد فرما دیں، تاکہ آپ کے بعد وہ حکومت کی باگ دوڑ سنبھال لے اور بعض حضرات نے یہ تجویز پیش کی کہ آپ اپنے صاحبزادے عبداللہ بن عمر کو نامزد فرما دیں تاکہ آپ کی وفات کے بعد وہ خلیفہ بن جائیں، حضرت عمر فاروقؓ نے پہلے تو جواب میں فرمایا کہ نہیں، تم مجھ سے ایسے شخص کو خلیفہ بنوانا چاہتے ہو، جسے اپنی بیوی کو طلاق دینی نہیں آتی۔

(تاریخ الخلفاء للسیوطی: ۱۱۳)

واقعہ یہ ہوا تھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک مرتبہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی بیوی کو حالت حیض یعنی ماہواری کے ایام میں طلاق دے دی تھی، اور مسئلہ یہ ہے کہ جب عورت ایام کی حالت میں ہو، اس وقت عورت کو طلاق دینا شرعاً ناجائز ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو یہ مسئلہ معلوم نہیں تھا، جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے یہ غلط کیا، اس لیے اب رجوع کرلو اور پھر سے اگر طلاق دینی ہو، تو پاکی کی حالت میں طلاق دینا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس واقعہ کی طرف اشارہ فرمایا کہ تم ایسے شخص کو خلیفہ بنانا چاہتے ہو، جسے اپنی بیوی کو طلاق دینی بھی نہیں آتی۔

(تاریخ الخلفاء للسیوطی: ۱۱۳ تاریخ الطبری ۲۹۲/۳)

## حضرت عمر کا احساس ذمہ داری:

اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان حضرات کو دوسرا جواب یہ دیا کہ بات دراصل یہ ہے کہ خلافت کے بوجھ کا پھندا خطاب کی اولاد میں سے ایک شخص کے گلے میں پڑ گیا تو یہ بھی کافی ہے۔ مراد اپنی ذات تھی کہ بارہ سال تک یہ پھندا میرے گلے میں پڑا

رہا، وہی کافی ہے، اب اس خاندان کے کسی اور فرد کے گلے میں یہ پھندا میں نہیں ڈالنا چاہتا، اس واسطے کہ کچھ پتہ نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کے سامنے مجھے اس ذمہ داری کا حساب دینا ہوگا، اس وقت میرا کیا حال ہوگا؟ حضرت عمر فاروقؓ وہ شخص ہیں، جو خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زبانی یہ خوشخبری سن چکے ہیں، عمر فی الجنۃ کہ عمر جنت میں جائے گا اس بشارت کے بعد اس بات کا کوئی احتمال باقی نہیں رہتا کہ جنت میں نہ جائیں، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کے سامنے حساب و کتاب کا ڈر اور اس امانت کا اتنا احساس ہے۔

(تاریخ الطبری: ۳/۲۹۲)

ایک موقع پر آپ نے فرمایا کہ قیامت کے روز اگر میں اس امانت کے حساب کے نتیجے میں برابر سرابر بھی چھوٹ جاؤں کہ میرے اوپر نہ کوئی گناہ اور نہ ثواب ہو اور مجھے اعراف میں بھیج دیا جائے (جو جنت اور جہنم کے درمیان ایک علاقہ ہے، جس میں ان لوگوں کو رکھا جائے گا، جن کے گناہ اور ثواب برابر ہوں گے) تو میرے لیے یہ بھی کافی اور میں خلاصی پا جاؤں گا، حقیقت یہ ہے کہ اس امانت کا احساس، جو اللہ تبارک تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے، اگر اس احساس کا تھوڑا ذرہ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں پیدا فرما دے، تو ہمارے سارے مسئلے حل ہو جائیں۔

## مسائل کی جڑ امانت میں خیانت ہے:

ایک زمانے میں یہ بحث چلی تھی کہ پاکستان کا مسئلہ نمبر ایک کیا ہے؟ یعنی سب سے بڑی مشکل کیا ہے؟ جس کو حل کرنے میں اولیت دی جائے، حقیقت میں مسئلہ نمبر ایک خیانت ہے، آج امانت کا تصور ہمارے ذہنوں میں موجود نہیں، اپنے فرائض ادا کرنے کا احساس دل سے اتر گیا، اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا احساس باقی نہیں رہا، زندگی تیزی سے چلی جا رہی ہے، جس کے لئے پیسے کی دوڑ لگی ہوئی ہے، کھانے کی دوڑ لگی ہوئی ہے، اقتدار کی دوڑ ہے، اس دوڑ میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے میں لگے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کی کوئی فکر نہیں، آج سب سے بڑا مسئلہ اور ساری بیماریوں کی جڑ یہی ہے، اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کے اندر یہ احساس پیدا فرما دے، تو مسائل درست ہو جائیں۔

## دفتر کا سامان امانت ہے:

جس دفتر میں آپ کام کر رہے ہیں، اس دفتر کا سامان ہے، وہ سب آپ کے پاس امانت ہے، اس لیے کہ وہ سامان آپ کو اس لیے دیا گیا ہے کہ اس کو دفتری کاموں میں استعمال کریں، لہذا آپ اس کو ذاتی کاموں میں استعمال نہ کریں، اس لیے کہ یہ امانت میں خیانت ہے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر دفتر کی معمولی چیز اپنے ذاتی کام میں استعمال کرلی، تو اس میں کیا حرج ہے؟ یادرکھو! خیانت چھوٹی چیز کی ہو، یا بڑی چیز کی ہو، دونوں حرام ہیں اور گناہ کبیرہ کریں، دونوں میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے، اس لیے ان دونوں سے بچنا ضروری ہے۔

## سرکاری اشیاء امانت ہیں:

جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ "امانت" کے صحیح معنی یہ ہیں کہ کسی شخص نے آپ پر بھروسہ کرکے اپنا کوئی کام آپکے سپرد کیا اور پھر آپ نے وہ کام اس کے بھروسہ کے مطابق انجام نہ دیا، تو یہ خیانت ہوگی، یہ سڑکیں جن پر آپ چلتے ہیں، یہ بسیں جن پر آپ سفر کرتے ہیں، یہ ٹرینیں جن میں آپ سفر کرتے ہیں، یہ سب امانت ہیں، یعنی ان کو جائز طریقے پر استعمال کیا جائے اور اگر ان کو اس جائز طریقے سے ہٹ کر استعمال کیا جارہا ہے، تو وہ خیانت کے اندر داخل ہے، مثلاً اس کو استعمال کرتے وقت گندہ اور خراب کردیا، آج کل تو لوگوں نے سڑکوں کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھ رکھا ہے، کسی نے کھود کر نالی نکال کی اور پانی جانے کا راستہ بنا دیا، کسی نے سڑک گھیر کر شامیانہ لگا دیا، حالانکہ فقہاء کرام نے یہاں تک مسئلہ لکھا ہے کہ اگر ایک شخص نے اپنے گھر کا پرنالہ باہر سڑک کی طرف نکال دیا، تو اس شخص نے ایک ایسی فضا استعمال کی، جو اس کی ملکیت میں نہیں تھی ، اس لیے اس شخص کے لیے سڑک کی طرف پرنالہ نکالنا جائز نہیں، حالانکہ وہ پرنالہ کوئی جگہ نہیں گھیر رہا ہے، بلکہ فضا کے ایک حصے میں وہ پرنالہ نکالا ہوا ہے، اس پر فقہاء کرام نے تفصیلی بحث کی ہے، کہ کہاں پرنالہ نکالنا جائز ہے۔

## مسجد کی طرف گرنے والے حضرت عباسؓ کے پرنالے کا واقعہ:

حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ہیں، ان کے پرنالے کا قصہ مشہور ہے، ان کا گھر مسجد نبوی کے ساتھ بالکل ملا ہوا تھا، ان کے گھر کا ایک پرنالہ مسجد نبوی کے صحن میں آ کر گرتا تھا، ایک مرتبہ حضرت فاروق اعظمؓ کی اس پرنالے پر نظر پڑی تو دیکھا کہ وہ پرنالہ مسجد میں نکلا ہوا ہے، لوگوں سے پوچھا کہ یہ پرنالہ کس کا ہے جو مسجد کے صحن کی طرف لگا ہوا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا پرنالہ ہے، آپ نے حکم دیا کہ اس کو توڑ دو، مسجد کی طرف کسی کو پرنالہ نکالنا جائز نہیں، جب حضرت عباسؓ کو معلوم ہوا، تو ملاقات کے لیے حضرت عمر فاروقؓ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ عمر یہ تم نے کیا کیا؟ انہوں نے فرمایا کہ یہ پرنالہ مسجد نبوی میں نکلا ہوا تھا، اس لیے گرادیا، حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ یہ پرنالہ نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے لگایا تھا، حضرت فاروق اعظمؓ نے جب یہ سنا، تو حضور کی اجازت سے لگایا تھا، تو فوراً فرمایا کہ آپ میرے ساتھ چلیں، چنانچہ مسجد نبوی میں تشریف لا کر خود جھک کر رکوع کی حالت میں کھڑے ہو گئے اور حضرت عباسؓ سے فرمایا کہ اے عباس! اللہ کے لیے میری کمر پر سوار ہو کر اس پرنالے کو دوبارہ لگاؤ، اس لیے کہ خطاب کے بیٹے کی یہ مجال کہ وہ رسول اللہ کے اجازت دیئے ہوئے پرنالے کو توڑ دے، حضرت عباسؓ نے فرمایا کہ میں لگوالوں گا، آپ رہنے دیں، لیکن حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ نہیں، جب میں نے توڑا ہے، لہٰذا اب میں ہی اس کی سزا بھگتوں گا، بہرحال شریعت کا اصل مسئلہ تو یہی تھا کہ حاکم کی اجازت کے بغیر وہ پرنالہ لگانا جائز نہیں تھا، لیکن چونکہ حضرت عباسؓ کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لگانے کی اجازت دے دی تھی، اس لیے اس کو لگانا ان کے لیے جائز ہو گیا۔ (طبقات ابن سعد: ۴/۲۰)

آج یہ حال ہے کہ جس شخص کا جتنی زمین پر قبضہ کرنے کا دل چاہا قبضہ کر لیا۔ اور اس کی کوئی فکر نہیں کہ یہ ہم گناہ کے کام کر رہے ہیں۔ نمازیں بھی ہو رہی ہیں اور یہ خیانت بھی ہو رہی ہے یہ سب کام امانت میں خیانت کے اندر داخل ہیں۔ اس سے پرہیز کرنے کی ضرورت ہے۔

## مجلس کی گفتگو امانت ہے:

ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَةِ (جامع الاصول: ۶/۵۴۵)

یعنی مجلسوں میں جو بات کی گئی ہو، وہ بھی سننے والوں کے پاس امانت ہے، مثلاً دو تین آدمیوں نے آپس میں مل کر باتیں کیں، بے تکلفی میں، باہم اعتماد کی فضا میں راز کی باتیں کرلیں، اب ان باتوں کو ان کی اجازت کے بغیر دوسروں تک پہنچانا بھی خیانت کے اندر داخل ہے اور ناجائز ہے، جیسے بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ ادھر کی بات ادھر لگادی اور ادھر کی بات ادھر لگادی، یہ سارا فتنہ فساد اسی طرح پھیلتا ہے، البتہ اگر مجلس میں کوئی ایسی بات کہی گئی ہو، جس سے دوسروں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے، مثلاً دو تین آدمیوں نے مل کر یہ سازش کی کہ فلاں وقت پر فلاں شخص کے گھر پر حملہ کردیں گے، اب ظاہر ہے کہ یہ بات ایسی نہیں ہے کہ جس کو چھپایا جائے، بلکہ اس شخص کو بتادیا جائے کہ تمہارے خلاف یہ سازش ہو رہی ہے، لیکن جہاں اس قسم کی بات نہ ہوئی ہو، وہاں کسی کے راز کی بات دوسروں تک پہنچانا ناجائز ہے۔

## راز کی باتیں امانت ہیں:

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ راز کی بات مجلس میں ایک شخص نے سنی، اس نے جاکر دوسرے کو یہ تاکید کرکے سنادی کہ یہ راز کی بات بتا رہا ہوں، تمہیں تو بتادی، لیکن کسی اور سے مت کہنا، اب وہ سمجھ رہا ہے کہ یہ تاکید کرکے میں نے راز کا تحفظ کرلیا، کہ آگے یہ بات کسی اور کو مت بتانا، اب وہ سننے والا آگے تیسرے شخص کو وہ راز کی بات اس تاکید کے ساتھ بتادیتا ہے کہ یہ راز کی بات ہے، تم آگے کسی اور سے مت کہنا، یہ سلسلہ آگے اسی طرح چلتا رہتا ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہم نے امانت کا خیال کرلیا، حالانکہ جب وہ بات راز تھی اور دوسروں سے کہنے کو منع کیا گیا تھا، تو پھر اس تاکید کے ساتھ کہنا بھی امانت کے خلاف ہے، یہ خیانت ہے اور جائز نہیں۔

یہ وہ چیزیں ہیں جنہوں نے ہمارے معاشرے میں فساد برپا کر رکھا ہے، آپ غور

کر کے دیکھیں گے، تو یہی نظر آئے گا کہ فساد اسی طرح برپا ہوتے ہیں، کہ فلاں شخص تو آپ کے بارے میں یہ کہہ رہا تھا، اب اس کے دل میں اس کے خلاف غصہ اور بغض اور عناد پیدا ہو گیا، اس لیے اس لگائی بجھائی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا۔

## ٹیلی فون پر دوسروں کی باتیں سننا خیانت ہے:

دو آدمی آپ سے علیحدہ ہو کر آپس میں سرگوشی کر رہے ہیں اور آپ چھپ کر ان کی باتوں کو سننے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں کہ میں ان کی باتیں سن لوں کہ کیا باتیں ہو رہی ہیں؟ یہ امانت میں خیانت ہے، یا ٹیلی فون کرتے وقت کسی کی لائن آپ کے فون سے مل گئی، اب آپ نے ان کی باتوں کو سننا شروع کر دیا، یہ سب امانت میں خیانت ہے، تجسس میں داخل ہے اور ناجائز ہے، حالانکہ آج اس پر بڑا فخر کیا جاتا ہے کہ مجھے فلاں کا راز معلوم ہو گیا، اس کو بڑا ہنر اور فن سمجھا جاتا ہے، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ یہ خیانت کے اندر داخل ہے اور ناجائز ہے۔

غرض یہ ہے کہ امانت میں خیانت کے مصداق اتنے ہیں کہ شاید زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے، جس میں ہمیں امانت کا حکم نہ ہو اور خیانت سے ہمیں روکا نہ گیا ہو، یہ ساری باتیں جو میں نے ذکر کیں ہیں، یہ سب امانت کے خلاف ہیں اور نفاق کے اندر داخل ہیں، لہٰذا یہ حدیث ہر وقت مستحضر رہنی چاہیے کہ تین چیزیں منافق کی علامت ہیں:

۱)...... بات کرے تو جھوٹ بولے

۲)...... وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے

۳)...... اور اگر اس کے پاس کوئی امانت آئے تو اس میں خیانت کرے

اللہ تعالیٰ ہماری اور آپ سب کی اس سے حفاظت فرمائے، یہ سب دین کا حصہ ہیں، ہم لوگوں نے دین کو بہت محدود کر رکھا ہے اور اپنی روزمرہ زندگی میں ان باتوں کو فراموش کر رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمارے دلوں میں فکر پیدا فرما دے اور اس کی توفیق عطا فرما دے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے اس طریقے پر عمل کریں۔ آمین

(اصلاحی خطبات: جلد سوم)

روح کی بیماریاں اور ان کا علاج

# باب......(۹)

## جھوٹ اور اس کی مروجہ صورتیں

# جھوٹ اور اس کی مروجہ صورتیں

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا. اَمَّا بَعْدُ عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اٰیَۃُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ اِذَا حَدَّثَ کَذَبَ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ وَفِیْ رِوَایَۃٍ وَاِنْ صَامَ وَصَلّٰی وَزَعَمَ اَنَّہٗ مُسْلِمٌ.

(صحیح بخاری کتاب الایمان باب علامات المنافق حدیث نمبر ۳۳)

## منافق کی تین علامتیں:

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تین خصلتیں ایسی ہیں، جو منافق ہونے کی نشانی ہیں، یعنی کسی مسلمان کا کام نہیں ہے کہ وہ یہ کام کرے، اگر کسی مسلمان میں یہ باتیں پائی جائیں، تو سمجھ لو کہ وہ منافق ہے، وہ تین باتیں یہ ہیں کہ:

۱)...... جب وہ بات کرے تو جھوٹ بولے۔

۲)......اور جب وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے۔

۳)......اور جب اس کے پاس کوئی امانت رکھوائی جائے، تو وہ خیانت کرے۔

ایک روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ چاہے وہ نماز بھی پڑھتا ہے ہو اور روزے بھی رکھتا ہو اور چاہے وہ دعوی کرتا ہو کہ وہ مسلمان ہے، لیکن حقیقت میں وہ مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں، اس لیے کہ مسلمان ہونے کی جو بنیادی صفات ہیں، وہ ان کو چھوڑے ہوئے ہے۔

## اسلام صرف نماز روزے کا نام نہیں:

اللہ جانے یہ بات ہمارے ذہنوں میں کہاں سے بیٹھ گئی ہے اور ہم نے یہ سمجھ لیا کہ دین بس نماز، روزے کا نام ہے، نماز پڑھی، روزہ رکھ لیا اور نماز، روزے کا اہتمام کرلیا، بس مسلمان ہو گئے، اب مزید ہم سے کسی چیز کا مطالبہ نہیں ہے، چنانچہ جب بازار گئے، تو اب وہاں جھوٹ، فریب اور دھوکے سے مال حاصل ہو رہا ہے، حرام اور حلال ایک ہو رہے ہیں، اس کی فکر نہیں، زبان کا بھروسہ نہیں، امانت میں خیانت ہے، وعدہ کا پاس نہیں، لہٰذا اسلام کے بارے میں یہ تصور کہ یہ بس نماز، روزے کا نام ہے، یہ بڑا خطرناک اور غلط تصور ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بتا دیا کہ ایسا شخص چاہے نماز بھی پڑھ رہا ہو اور روزے بھی رکھ رہا ہو، لیکن وہ مسلمان کہلانے کا مستحق نہیں، چاہے اس پر کفر کا فتوی نہ لگاؤ، اس لیے کہ کفر کا فتوی لگانا بڑی سنگین چیز ہے اور فتوی کے اعتبار سے اس کو کافر نہ قرار دو، دائرہ اسلام سے اس کو خارج نہ کرو، لیکن ایسا شخص سارے کام کافروں جیسے اور منافق جیسے کر رہا ہے۔

## جھوٹ، وعدہ اور امانت کی تفصیل:

فرمایا کہ تین چیزیں منافق کی علامات ہیں:

نمبر ایک:...... جھوٹ بولنا۔ دوسرے:...... وعدہ خلافی کرنا۔

تیسرے:...... امانت میں خیانت کرنا

ان تینوں کی تھوڑی سی تفصیل عرض کرنا چاہتا ہوں، اس لیے کہ عام طور پر لوگوں کے ذہنوں میں ان تینوں کا تصور بہت محدود ہے، حالانکہ ان تینوں کا مفہوم بہت وسیع اور عام ہے، اس لیے ان کی تھوڑی سی تفصیل کرنے کی ضرورت ہے۔

## زمانہ جاہلیت میں بھی جھوٹ بری چیز تھی:

چنانچہ فرمایا کہ سب سے پہلی چیز جھوٹ بولنا، یہ جھوٹ بولنا حرام ہے، ایسا حرام ہے کہ

کوئی ملت، کوئی قوم ایسی نہیں گزری، جس میں جھوٹ بولنا حرام نہ ہو، یہاں تک کہ زمانہ جاہلیت کے لوگ بھی جھوٹ بولنے کو برا سمجھتے تھے، واقعہ یاد آیا کہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے روم کے بادشاہ کی طرف اسلام کی دعوت کے لیے خط بھیجا، تو خط پڑھنے کے بعد اس نے درباریوں سے کہا، ہمارے ملک میں اگر ایسے لوگ موجود ہوں، جو ان (حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم) سے واقف ہوں، تو ان کو میرے پاس بھیج دو، تاکہ میں ان سے حالات معلومات کروں، کہ وہ کیسے ہیں؟ اتفاق سے اسی وقت حضرت ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، ایک تجارتی قافلہ لے کر وہاں گئے ہوئے تھے، چنانچہ لوگ ان کو بادشاہ کے پاس لے آئے، یہ بادشاہ کے پاس پہنچے، تو بادشاہ نے ان سے سوالات کرنے شروع کیے، پہلا سوال یہ کیا کہ یہ بتاؤ کہ یہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں؟ وہ کیسا خاندان ہے؟ اس کی شہرت کیسی ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ وہ خاندان تو بڑے اعلیٰ درجے کا ہے، اعلیٰ درجے کے خاندان میں وہ پیدا ہوئے اور سارا عرب اس خاندان کی شرافت کا قائل ہے، اس بادشاہ نے تصدیق کرتے ہوئے کہا، بالکل ٹھیک ہے، جو اللہ کے نبی ہوتے ہیں، وہ اعلیٰ خاندان سے ہوتے ہیں۔

پھر دوسرا سوال بادشاہ نے یہ کیا کہ ان کی پیروی کرنے والے معمولی درجے کے لوگ ہیں یا بڑے بڑے رؤساء ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ ان کے متبعین کی اکثریت کم درجے کے معمولی قسم کے لوگ ہیں۔ بادشاہ نے تصدیق کی، نبی کے متبعین ابتداء ضعیف اور کمزور قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔

پھر سوال کیا کہ تمہاری ان کے ساتھ جب جنگ ہوتی ہے، تو تم جیت جاتے ہو یا وہ جیت جاتے ہیں؟ اس وقت تک چونکہ صرف دو جنگیں ہوئی تھیں، ایک جنگ بدر اور ایک احد اور غزوہ احد میں چونکہ مسلمانوں کو تھوڑی سی شکست ہوئی تھی، اس لیے انہوں نے اس موقع پر جواب دیا کہ کبھی ہم غالب آجاتے ہیں اور کبھی وہ غالب آجاتے ہیں۔

حضرت ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسلمان ہونے کے بعد فرماتے تھے کہ اس وقت تو میں کافر تھا، اس لیے اس فکر میں تھا کہ میں کوئی ایسا جملہ کہہ دوں، جس سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تاثر قائم ہو، لیکن اس بادشاہ نے جتنے سوالات کیے، ان کے جواب

میں اس قسم کی کوئی بات کہنے کا موقع نہیں ملا، اس لیے کہ جو سوال وہ کر رہا تھا، اس کا جواب تو مجھے دینا تھا اور جھوٹ بول نہیں سکتا تھا، اس لیے میں جتنے جوابات دے رہا تھا، وہ سب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں جا رہے تھے، بہر حال جاہلیت کے لوگ ابھی اسلام نہیں لائے تھے، وہ بھی جھوٹ بولنے کو گوارہ نہیں کرتے تھے، چہ جائیکہ مسلمان اسلام لانے کے بعد جھوٹ بولے۔ (صحیح بخاری کتاب بدء الوحی)

## جھوٹا میڈیکل سرٹیفکیٹ بھی جھوٹ کی ایک صورت ہے:

افسوس کہ اب اس جھوٹ میں عام ابتلاء ہے، یہاں تک کہ جو لوگ حرام وحلال اور جائز وناجائز کا اور شریعت پر چلنے کا اہتمام کرتے ہیں، ان میں بھی یہ بات نظر آتی ہے کہ انہوں نے بھی جھوٹ کی بہت سی قسموں کو جھوٹ سے خارج سمجھ رکھا ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ گویا یہ جھوٹ ہی نہیں ہے، حالانکہ جھوٹا کام کر رہے ہیں، غلط بیانی کر رہے ہیں اور اس میں دوہرا جرم ہے، ایک جھوٹ بولنے کا جرم اور دوسرے اس گناہ کو گناہ نہ سمجھنے کا جرم، چنانچہ ایک صاحب جو بڑے نیک تھے، نماز روزے کے پابند، اذکار واشغال کے پابند، بزرگوں سے تعلق رکھنے والے، پاکستان سے باہر قیام تھا، ایک مرتبہ جب پاکستان آئے، تو میرے پاس بھی ملاقات کے کے لیے آ گئے، میں نے ان سے پوچھا کہ آپ واپس کب تشریف لا رہے ہیں، انہوں نے جواب دیا کہ میں ابھی آٹھ دس روز اور ٹھہروں گا، میری چھٹیاں تو ختم ہوگئیں، البتہ کل ہی میں نے مزید چھٹی لینے کے لیے ایک میڈیکل سرٹیفکیٹ بھجوا دیا ہے۔

انہوں نے میڈیکل سرٹیفکیٹ بھجوانے کا ذکر اس انداز سے کیا کہ جس طرح یہ ایک معمولی سی بات ہے، اس میں کوئی پریشانی کی بات ہی نہیں، میں نے ان سے پوچھا کہ میڈیکل سرٹیفکیٹ کیسا؟ انہوں نے جواب دیا کہ مزید چھٹی لینے کے لیے بھیج دیا ہے، ایسے اگر چھٹی لیتا، تو چھٹی نہ ملتی، اس کے ذریعہ چھٹی مل جائے گی، میں نے پھر سوال کیا کہ آپ نے اس میڈیکل سرٹیفکیٹ میں کیا لکھا تھا؟ انہوں نے جواب دیا کہ اس میں یہ لکھا تھا کہ یہ اتنے بیمار ہیں کہ سفر کے لائق نہیں، میں نے کہا کیا دین نماز روزے کا نام ہے؟ ذکر شغل کرنے کا نام ہے؟ آپ کا بزرگوں سے تعلق ہے، پھر یہ میڈیکل سرٹیفکیٹ کیسا جا رہا ہے؟ چونکہ نیک آدمی تھے، اس لیے انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں نے آج پہلی مرتبہ

آپ کے منہ سے یہ بات سنی کہ یہ بھی کوئی غلط کام ہے، میں نے کہا کہ جھوٹ بولنا اور کس کو کہتے ہیں؟ انہوں نے پوچھا کہ مزید چھٹی کس طرح لیں؟ میں نے کہا کہ جتنی چھٹیوں کا استحقاق ہے، اتنی چھٹی لو، مزید چھٹی لینی ضروری ہو، تو بغیر تنخواہ کے لے لو، لیکن یہ جھوٹا سرٹیفکیٹ بھیجنے کا جواز پیدا نہیں ہوتا۔

آج کل لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جھوٹا میڈیکل سرٹیفکیٹ بنوانا جھوٹ میں داخل ہی نہیں ہے اور دین صرف ذکر و شغل کا نام رکھ دیا، باقی زندگی کے میدان میں جا کر جھوٹ بول رہا ہو، تو اس کا کوئی خیال نہیں۔

## جھوٹی سفارش بھی جھوٹ کی ایک صورت ہے:

ایک اچھے خاصے، پڑھے لکھے، نیک اور سمجھدار بزرگ کا میرے پاس سفارشی خط آیا، اس وقت میں جدہ میں تھا، اس خط میں یہ لکھا تھا کہ یہ صاحب جو آپ کے پاس آرہے ہیں، یہ انڈیا کے باشندے ہیں، اب یہ پاکستان جانا چاہتے ہیں، لہذا آپ پاکستانی سفارت خانے سے ان کی سفارش کردیں کہ ان کو ایک پاکستانی پاسپورٹ جاری کردیا جائے، اس بنیاد پر کہ یہ پاکستانی باشندے ہیں اور ان کا پاسپورٹ یہاں سعودی عرب میں گم ہوگیا ہے اور خود انہوں نے پاکستانی سفارت خانے میں درخواست دے رکھی ہے کہ ان کا پاسپورٹ گم ہوگیا ہے، لہذا آپ ان کی سفارش کردیں۔

اب آپ بتائیے وہاں عمرے ہو رہے ہیں، حج بھی ہو رہا ہے، طواف اور سعی بھی ہو رہی ہے اور ساتھ ہی یہ جھوٹ اور فریب بھی ہو رہا ہے گویا کہ دین کا حصہ ہی نہیں، اس کا دین سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے، شاید لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جب قصد اور ارادہ کر کے باقاعدہ جھوٹ کو جھوٹ سمجھ کر بولا جائے، تب جھوٹ ہوتا ہے، لیکن ڈاکٹر سے جھوٹا سرٹیفکیٹ بنوالینا، جھوٹی سفارش لکھوا دینا، یا جھوٹے مقدمات دائر کردینا، یہ کوئی جھوٹ نہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ﴾ (سورۃ ق. ۱۸)

یعنی زبان سے جو لفظ نکل رہا ہے، وہ تمہارے نامہ اعمال میں ریکارڈ ہو رہا ہے۔

## بچوں کو دھوکہ دینا بھی جھوٹ کی ایک صورت ہے:

ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک خاتون ایک بچے کو بلا کر گود میں لینا چاہتی تھی، لیکن وہ بچہ قریب نہیں آ رہا تھا، اس خاتون نے بچے کو بہلانے کے لیے کہا کہ بیٹا یہاں آؤ ہم تمہیں چیز دیں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بات وہ سن لی اور آپ نے خاتون سے پوچھا کہ تمہارا کوئی چیز دینے کا ارادہ ہے یا ویسے ہی اس کو بلانے اور بہلانے کے لیے کہہ رہی ہو؟ اس خاتون نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرا کھجور دینے کا ارادہ ہے کہ جب وہ میرے پاس آئے گا، تو میں اس کو کھجور دوں گی۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تمہارا کھجور دینے کا ارادہ نہ ہوتا، بلکہ محض بہلانے کے لیے کہتی کہ میں تمہیں کھجور دوں گی، تو تمہارے نامہ اعمال میں ایک جھوٹ لکھ دیا جاتا۔ (ابو داؤد کتاب الاداب باب فی التشدید فی الکذب)

اس حدیث سے یہ سبق دیدیا کہ بچے کے ساتھ بھی جھوٹ نہ بولو اور اس کے ساتھ بھی وعدہ خلافی نہ کرو، ورنہ شروع ہی سے جھوٹ کی برائی اس کے دل سے نکل جائے گی۔

## مذاق میں جھوٹ بولنا بھی جھوٹ کی ایک صورت ہے:

ہم لوگ محض مذاق اور تفریح کے لیے زبان سے جھوٹی باتیں نکال دیتے ہیں، حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مذاق میں بھی جھوٹی باتیں زبان سے نکالنے سے منع فرمایا ہے، چنانچہ ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ افسوس ہے اس شخص پر، یا سخت الفاظ میں اس کا صحیح ترجمہ یہ کر سکتے ہیں کہ اس شخص کے لیے دردناک عذاب ہے، جو شخص لوگوں کو ہنسانے کے لیے جھوٹ بولتا ہے۔ (ابو داؤد کتاب الادب باب فی التشدیدفی الکذب)

## حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مذاح کی ایک جھلک:

خوش طبعی کی باتیں اور مذاق حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کیا، لیکن کبھی کوئی ایسا مذاق نہیں کیا، جس میں بات غلط ہو، یا واقعہ کے خلاف ہو، آپ نے کیسا مذاق کیا؟ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک بڑھیا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئی

اور عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں پہنچا دیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی بڑھیا جنت میں نہیں جائے گی اور وہ بڑھیا رونے لگی کہ یہ تو بڑی خطرناک بات ہوگئی کہ بڑھیا جنت میں نہیں جائے گی، پھر آپ نے وضاحت کر کے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی عورت اس حالت میں جنت میں نہیں جائے گی کہ وہ بوڑھی ہو، بلکہ وہ جوان ہو کر جائے گی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا لطیف مذاق فرمایا کہ اس میں کوئی بات نفس الامر کے خلاف اور جھوٹی نہیں تھی۔ (الشمائل للترمذی باب ماجاء فی صفة مزاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)

## حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مذاح کی ایک اور جھلک:

ایک دیہاتی آپ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے ایک اونٹنی دے دیجئے، آپ نے فرمایا کہ ہم تم کو ایک اونٹنی کا بچہ دیں گے، اس نے کہا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بچے کو لے کر کیا کروں گا، مجھے تو سواری کے لیے ضرورت ہے، آپ نے فرمایا کہ تمہیں جو بھی اونٹ دیا جائے گا، وہ کسی اونٹنی کا بچہ ہی تو ہوگا۔

یہ آپ نے اس سے مذاق فرمایا اور ایسا مذاق جس میں خلاف حقیقت اور غلط بات نہیں کہی، تو مذاق کے اندر بھی اس بات کا لحاظ ہے کہ زبان سنبھال کر استعمال کریں اور زبان سے کوئی لفظ نہ نکل جائے اور آج کل ہمارے اندر سچے جھوٹے قصے پھیل گئے ہیں اور خوش گپیوں کے اندر ہم ان کو بطور مذاق بیان کر دیتے ہیں، یہ سب جھوٹ کے اندر داخل ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے۔ آمین

(الشمائل للترمذی باب ما جاء فی مزاح النبی صلی اللہ علیہ وسلم



## جھوٹا کیریکٹر سرٹیفکیٹ بھی جھوٹ کی ایک صورت ہے:

آج کل اس کا عام رواج ہو گیا ہے، اچھے خاصے دین دار اور پڑھے لکھے لوگ بھی اس میں مبتلا ہیں کہ جھوٹے سرٹیفکیٹ حاصل کرتے ہیں، یا دوسروں کے لیے جھوٹے سرٹیفکیٹ جاری کرتے ہیں، مثلاً اگر کسی کو کیریکٹر سرٹیفکیٹ کی ضرورت پیش آ گئی، اب وہ کسی کے پاس گیا اور اس سے کیریکٹر سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا اور جاری کرنے والے نے اس

کے اندر لکھ دیا کہ میں ان کو پانچ سال سے جانتا ہوں، یہ بڑے اچھے آدمی ہیں، ان کا اخلاق وکردار بہت اچھا ہے، کسی کے حاشیہ خیال میں یہ بات نہیں آتی کہ ہم یہ ناجائز کام کررہے ہیں، بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم نیک کام کررہے ہیں، یہ تو باعث ثواب کام ہے، حالانکہ اگر آپ اس کے کیریکٹر سے واقف نہیں ہیں، تو آپ کے لیے ایسا سرٹیفکیٹ جاری کرنا ناجائز ہے، چہ جائیکہ وہ سمجھے کہ میں ایک ثواب کا کام کررہا ہوں اور کسی ایسے شخص سے کیریکٹر سرٹیفکیٹ حاصل کرنا، جو آپ کو نہیں جانتا یہ بھی ناجائز ہے، گویا کہ سرٹیفکیٹ لینے والا بھی گناہ گار ہوگا اور دینے والا بھی گناہ گار ہوگا۔

## کیریکٹر معلوم کرنے کے دو طریقے:

حضرت فاروق اعظمؓ کے سامنے ایک شخص نے کسی تیسرے شخص کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ حضرت وہ تو بڑا اچھا آدمی ہے، حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ تم جو یہ کہہ رہے ہو کہ فلاں شخص بڑے اچھے اخلاق اور کردار کا آدمی ہے، اچھا یہ بتاؤ کہ کیا کبھی تمہارا اس کے ساتھ لین دین کا معاملہ پیش آیا؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں، لین دین کا معاملہ تو کبھی پیش نہیں آیا، پھر آپ نے پوچھا کہ اچھا یہ بتاؤ کہ کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ سفر کیا؟ اس نے کہا نہیں، میں نے کبھی اس کے ساتھ سفر تو نہیں کیا، آپ نے فرمایا کہ پھر تمہیں کیا معلوم کہ وہ اخلاق وکردار کے اعتبار سے کیسا آدمی ہے؟ اس لیے کہ اخلاق وکردار کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے، جب انسان اس کے ساتھ لین دین کرے اور اس میں کھرا ثابت ہو، تب معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کردار اچھا ہے اور اس کے اخلاق معلوم کرنے کا دوسرا راستہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ سفر کرے، اس لیے کہ سفر کے اندر انسان اچھی طرح کھل کر سامنے آجاتا ہے، اس کے اخلاق، اس کے کردار، اس کے حالات، اس کے جذبات، اس کے خیالات یہ ساری چیزیں سفر میں ظاہر ہوجاتی ہیں، لہٰذا اگر تم نے اس کے ساتھ کوئی لین دین کا معاملہ کیا ہوتا، یا اس کے ساتھ سفر کیا ہوتا، تب تو بے شک یہ کہنا درست ہوتا، کہ وہ اچھا آدمی ہے، لیکن جب تم نے اس کے ساتھ نہ تو معاملہ کیا، نہ اس کے ساتھ سفر کیا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس کو جانتے نہیں اور جب تم جانتے نہیں، تو پھر خاموش رہو، نہ برا

کہو، نہ اچھا کہو اور اگر کوئی شخص اس کے بارے پوچھے، تو تم اس حد تک بتا دو، جتنا تمہیں معلوم ہو، مثلاً یہ کہہ دو کہ بھائی مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے تو میں نے دیکھا، باقی آگے کے حالات مجھے معلوم نہیں۔

## سرٹیفکیٹ کی حیثیت ایک گواہی کی حیثیت ہے:

قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ (سورة الزخرف. ۸۶)

یاد رکھئے! یہ سرٹیفکیٹ اور یہ تصدیق نامہ شرعاً گواہی ہے اور جو شخص اس سرٹیفکیٹ پر دستخط کر رہا ہے، وہ حقیقت میں گواہی دے رہا ہے، اس آیت کی رو سے گواہی دینا اس وقت جائز ہے، جب آدمی کو اس بات کا علم ہو اور یقین سے جانتا ہو کہ یہ واقع میں ایسا ہے، تب انسان گواہی دے سکتا ہے، اس کے بغیر انسان گواہی نہیں دے سکتا، آج کل ہوتا یہ ہے کہ آپ کو اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں، لیکن آپ نے کیریکٹر سرٹیفکیٹ جاری کر دیا، تو یہ جھوٹی گواہی کا گناہ ہوا اور جھوٹی گواہی اتنی بری چیز ہے کہ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو شرک کے ساتھ ملا کر ذکر فرمایا۔

## جھوٹی گواہی برائی میں شرک کے برابر ہے:

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تھے، صحابہ کرام سے فرمایا کہ کیا میں تم کو بتاؤں کہ بڑے بڑے گناہ کون کون سے ہیں؟ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ضرور بتایئے، آپ نے فرمایا کہ بڑے گناہ یہ ہیں کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، والدین کی نافرمانی کرنا، اس وقت تک آپ ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے ہوئے تھے، پھر آپ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور پھر فرمایا کہ جھوٹی گواہی دینا اور اس جملے کو تین مرتبہ دھرایا۔

(صحیح مسلم کتاب الایمان باب بیان الکبائر)

اب آپ اس کی شناعت کا اندازہ لگائیں کہ ایک طرف تو آپ نے اس کو شرک کے ساتھ ملا کر ذکر فرمایا، دوسرے یہ کہ اس کو تین مرتبہ ان الفاظ کو اس طرح دھرایا کہ پہلے

آپ ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تھے پھر اس کے بیان کے وقت سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور خود قرآن کریم نے بھی اس کو شرک کے ساتھ ملا کر ذکر فرمایا ہے، چنانچہ فرمایا کہ:

﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ﴾ (سورۃ الحج ۳۰)

یعنی تم بت پرستی کی گندگی سے بھی بچو اور جھوٹی بات سے بچو، اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹی بات اور جھوٹی گواہی کتنی خطرناک چیز ہے۔

## جھوٹے سرٹیفکیٹ اور جھوٹی گواہی کا گناہ کس پر؟

جھوٹی گواہی دینا، جھوٹ بولنے سے بھی زیادہ شنیع اور خطرناک ہے، اس لیے کہ اس میں کئی گناہ مل جاتے ہیں، مثلاً ایک جھوٹ بولنے کا گناہ اور دوسرا دوسرے شخص کو گمراہ کرنے کا گناہ، اس لیے کہ جب آپ نے غلط سرٹیفکیٹ جاری کر کے جھوٹی گواہی دی اور وہ جھوٹا سرٹیفکیٹ جب دوسرے شخص کے پاس پہنچا، تو وہ سمجھے گا کہ یہ آدمی بڑا اچھا ہے اور اچھا سمجھ کر اس سے کوئی معاملہ کرے گا اور اگر اس معاملہ کرنے کے نتیجے میں اس کو کوئی نقصان پہنچے گا، تو اس نقصان کی ذمہ داری بھی آپ پر ہوگی یا آپ نے عدالت میں جھوٹی گواہی دی اور اس گواہی کی بنیاد پر فیصلہ ہوگیا، تو اس فیصلے کے نتیجے میں جو کچھ کسی کا نقصان ہوا، وہ سب آپ کی گردن پر ہوگا، اس لیے یہ جھوٹی گواہی کا گناہ معمولی گناہ نہیں ہے، بڑا سخت گناہ ہے۔



## عدالت میں جھوٹ بولنا بھی جھوٹ ہی ہے:

آج کل تو جھوٹ کا ایسا بازار گرم ہے کہ کوئی شخص دوسری جگہ جھوٹ بولے یا نہ بولے لیکن عدالت میں ضرور جھوٹ بولے گا، بعض لوگوں کو یہاں تک کہتے ہوئے سنا کہ میاں سچی سچی بات کہہ دو، کوئی عدالت میں تھوڑی کھڑے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جھوٹ بولنے کی جگہ تو عدالت ہے، وہاں پر جا کر جھوٹ بولنا، یہاں آپس میں جب بات چیت ہو رہی ہے، تو سچی سچی بات بتا دو، حالانکہ عدالت میں جا کر جھوٹی گواہی دینے کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے شرک کے برابر قرار دیا ہے اور یہ کئی گناہوں کا مجموعہ ہے۔

## مدرسہ کی تصدیق کی حیثیت ایک گواہی کی حیثیت ہے:

لہذا جتنے سرٹیفکیٹ معلومات کے بغیر جاری کیے جا رہے ہیں اور جاری کرنے والا یہ جانتے ہوئے جاری کر رہا ہے کہ میں یہ غلط سرٹیفکیٹ جاری کر رہا ہوں، مثلاً کسی کے بیمار ہونے کا سرٹیفکیٹ دے دیا، یا کسی کے پاس ہونے کا سرٹیفکیٹ دے دیا، یا کسی کو کیریکٹر سرٹیفکیٹ دے دیا، یہ سب جھوٹی گواہی کے اندر داخل ہیں۔

میرے پاس بہت سے لوگ مدرسوں کی تصدیق کرانے کے لیے آتے ہیں، جس میں اس بات کی تصدیق ہوتی ہے، کہ یہ مدرسہ قائم ہے، اس میں اتنی تعلیم ہوتی ہے اور اس تصدیق کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ تاکہ لوگوں کو اطمینان ہو جائے کہ واقعۃً یہ مدرسہ قائم ہے اور امداد کا مستحق ہے اور اب ان مدرسوں کی تصدیق لکھنے کو دل بھی چاہتا ہے، لیکن میں نے والد ماجد حضرت مفتی شفیع صاحب قدس اللہ سرہ کو دیکھا کہ جب کبھی ان کے پاس کوئی شخص مدرسہ کی تصدیق لکھوانے کے لیے آتا تھا، تو آپ یہ عذر فرماتے ہوئے کہتے کہ بھائی یہ ایک گواہی ہے اور جب تک مجھے مدرسہ کے حالات کا علم نہ ہو، اس وقت تک میں یہ تصدیق نامہ جاری نہیں کر سکتا، اس لئے کہ یہ جھوٹی گواہی ہو جائے گی، البتہ اگر کسی مدرسے کے بارے میں علم ہوتا، تو جتنا علم ہوتا، اتنا لکھ دیتے۔

## کتاب کی تقریظ لکھنا گواہی ہے:

بہت سے لوگ کتابوں پر تقریظ لکھوانے آجاتے ہیں کہ ہم نے یہ کتاب لکھی ہے، آپ اس پر تقریظ لکھ دیجئے کہ یہ اچھی کتاب ہے اور صحیح کتاب ہے، حالانکہ جب تک انسان اس کتاب کو پورا نہ پڑھے، اس کا پورا مطالعہ نہ کرے، اس وقت تک یہ کیسے گواہی دیدے کہ یہ کتاب صحیح ہے یا غلط ہے؟ بہت سے لوگ اس خیال سے تقریظ لکھ دیتے ہیں کہ اس تقریظ سے اس کا فائدہ اور بھلا ہو جائے گا، حالانکہ تقریظ لکھنا ایک گواہی ہے اور اس گواہی میں غلط بیانی کو لوگوں نے غلط بیانی سے خارج کر دیا ہے، چنانچہ لوگ کہتے ہیں کہ صاحب ہم تو ایک ذرا سا کام لے کر ان کے پاس گئے تھے، اگر ذرا سا قلم ہلا دیتے اور ایک سرٹیفکیٹ لکھ دیتے تو ان کا کیا بگڑ جاتا، یہ تو بڑے بداخلاق آدمی ہیں کہ کسی کو سرٹیفکیٹ بھی جاری نہیں

کرتے، بھائی بات دراصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ایک ایک لفظ کے بارے میں سوال ہوگا، جو لفظ زبان سے نکل رہا ہے، جو لفظ قلم سے لکھا جا رہا ہے، وہ سب اللہ تعالیٰ کے یہاں ریکارڈ ہو رہا ہے اور اس کے بارے میں سوال ہوگا کہ فلاں لفظ تم نے جو زبان سے نکالا تھا، وہ کس بنیاد پر نکالا تھا، جان بوجھ کر بولا تھا، یا بھول کر بولا تھا؟

## جھوٹ سے بچئے:

بھائی ہمارے معاشرے میں جو جھوٹ کی وبا پھیل گئی ہے، اس میں اچھے خاصے دیندار، پڑھے لکھے، نمازی، بزرگوں سے تعلق رکھنے والے، وظائف اور تسبیح پڑھنے والے بھی مبتلا ہیں، وہ بھی اس کو ناجائز اور برا نہیں سمجھتے کہ یہ جھوٹا سرٹیفکیٹ جاری ہو جائے گا، تو یہ کوئی گناہ ہوگا، حالانکہ حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جو فرمایا کہ ''اذا حدث کذب'' اس میں یہ سب باتیں بھی داخل ہیں اور یہ سب دین کا حصہ ہیں اور ان کو دین سے خارج سمجھنا بدترین گمراہی ہے، اس لیے ان سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔

## جھوٹ جائز ہونے کے مواقع:

البتہ بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں اللہ تعالیٰ نے جھوٹ کی بھی اجازت دیدی ہے، لیکن وہ مواقع ایسے ہیں کہ جہاں انسان اپنی جان بچانے کے لیے جھوٹ بولنے پر مجبور ہو جائے اور جان بچانے کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہ ہو یا کوئی ناقابل برداشت ظلم اور تکلیف کا اندیشہ ہو کہ اگر وہ جھوٹ نہیں بولے گا، تو وہ ایسے ظلم کا شکار ہو جائے گا، جو قابل برداشت نہیں ہے، اس صورت میں شریعت نے جھوٹ بولنے کی اجازت دی ہے، البتہ اس میں بھی حکم یہ ہے کہ پہلے اس بات کی کوشش کرو، کہ صریح جھوٹ نہ بولنا پڑے، بلکہ کوئی ایسا گول مول لفظ بول دو، جس سے وقتی مصیبت ٹل جائے، جس کو شریعت کی اصطلاح میں ''تعریض اور توریہ'' کہا جاتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسا لفظ بول دیا جائے جس کے ظاہری طور پر کچھ اور معنی سمجھ میں آرہے ہیں اور حقیقت میں دل کے اندر آپ نے کچھ اور مراد لیا ہے، ایسا گول مول لفظ بول دو، تاکہ صریح جھوٹ نہ بولنا پڑے۔

## حضرت صدیقؓ کا جھوٹ سے اجتناب

ہجرت کے موقع پر جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ کی طرف ہجرت فرما رہے تھے، تو اس وقت مکہ والوں نے آپ کو پکڑنے کے لیے چاروں طرف اپنے ہرکارے دوڑا رکھے تھے اور یہ اعلان کر رکھا تھا کہ جو شخص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو پکڑ کر لائے گا، اس کو سو اونٹ انعام کے طور پر دیئے جائیں گے، اب اس وقت سارے مکہ کے لوگ آپ کی تلاش میں سرگرداں تھے، راستے میں حضرت صدیق اکبرؓ کے جاننے والا ایک شخص مل گیا، وہ حضرت صدیق اکبرؓ کو جانتا تھا ،مگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں جانتا تھا، اس شخص نے حضرت صدیق اکبرؓ سے پوچھا کہ یہ تمہارے ساتھ کون صاحب ہیں؟ اب صدیق اکبرؓ یہ چاہتے تھے کہ آپ کے بارے میں کسی کو پتہ نہ چلے، اس لیے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دشمنوں تک آپ کے بارے میں اطلاع پہنچ جائے، اب اگر اس شخص کے جواب میں صحیح بات بتاتے ہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کو خطرہ ہے اور اگر نہیں بتاتے، تو جھوٹ بولنا لازم آتا ہے، اب ایسے موقعے پر اللہ تعالیٰ ہی اپنے بندوں کی راہنمائی فرماتے ہیں، چنانچہ حضرت صدیق اکبرؓ نے جواب دیا کہ: هٰذَا الرَّجُلُ يَهْدِيْنِيْ السَّبِيْلَ یہ میرے راہنما ہیں، جو مجھے راستہ دکھاتے ہیں، اب آپ نے ایسا لفظ ادا کیا، جس کو سن کر اس شخص کے دل میں خیال آیا کہ جس طرح عام طور پر سفر کے دوران راستہ بتانے کے لیے کوئی راہنما ساتھ رکھ لیتے ہیں، اس قسم کے رہنما ساتھ جا رہے ہیں، لیکن حضرت صدیق اکبرؓ نے دل میں یہ مراد لیا کہ یہ دین کا راستہ دکھانے والے ہیں، جنت کا راستہ دکھانے والے ہیں، اللہ کا راستہ دکھانے والے ہیں، اب دیکھئے کہ اس موقع پر انہوں نے صریح جھوٹ بولنے سے پرہیز فرمایا، بلکہ ایسا لفظ بول دیا، جس سے وقتی کام بھی نکل گیا اور جھوٹ بھی نہیں بولنا پڑا۔

(صحیح بخاری کتاب مناقب الانصار باب هجرة النبی صلی الله علیه وآله وسلم)

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ یہ فکر عطا فرما دیتے ہیں، کہ زبان سے کوئی کلمہ خلاف واقعہ اور جھوٹ نہ نکلے، پھر اللہ تعالیٰ ان کی اس طرح مدد بھی فرماتے ہیں۔

## جھوٹ سے پرہیز پر حضرت گنگوہیؒ کا واقعہ:

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہ، جنہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کے خلاف جہاد میں بڑا حصہ لیا تھا، آپ کے علاوہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانا توی، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ وغیرہ ان سب حضرات نے اس جہاد میں بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے، اب جولوگ اس جہاد میں شریک تھے، آخر کار انگریزوں نے ان کو پکڑنا شروع کیا، چوراہوں پر پھانسی کے تختے لٹکا دیئے۔

جسے دیکھا حاکم وقت نے
کہا یہ بھی صاحب دار ہے

اور ہر ہر محلے میں مجسٹریٹوں کی مصنوعی عدالتیں قائم کر دی تھیں، جہاں کہیں کسی پر شبہ ہوا، اس کو مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا گیا اور اس نے حکم جاری کر دیا کہ اس کو پھانسی پر چڑھا دو، پھانسی پر اس کو لٹکا دیا گیا اور اسی دوران ایک مقدمہ میرٹھ میں حضرت گنگوہی رحمتہ اللہ علیہ کے خلاف بھی قائم ہوگیا اور مجسٹریٹ کے یہاں پیشی ہوگئی، جب مجسٹریٹ کے پاس پہنچے، تو اس نے پوچھا کہ تمہارے پاس ہتھیار ہیں؟ اس لیے کہ اطلاع ملی تھی کہ ان کے پاس بندوقیں ہیں اور حقیقت میں حضرت کے پاس بندوقیں تھیں، چنانچہ جس وقت مجسٹریٹ نے یہ سوال کیا، اس وقت حضرت کے ہاتھ میں تسبیح تھی، آپ نے وہ تسبیح اس کو دکھاتے ہوئے فرمایا ہمارا ہتھیار یہ ہے، یہ نہیں فرمایا کہ میرے پاس ہتھیار نہیں ہے، اس لیے کہ یہ جھوٹ ہو جاتا، آپ کا حلیہ بھی ایسا تھا کہ بالکل درویش صفت معلوم ہوتے تھے۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی مدد بھی فرماتے ہیں، ابھی سوال جواب ہورہا تھا کہ اتنے میں کوئی دیہاتی وہاں آ گیا، اس نے جب دیکھا کہ حضرت سے اس طرح سوال جواب ہورہے ہیں، تو اس نے کہا کہ ارے اس کو کہاں سے پکڑ لائے، یہ تو ہمارے محلے کا مُؤَ جِنْ (موذن) ہے، اس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کو خلاصی عطا فرمائی۔

## جھوٹ سے پرہیز پر حضرت نانا تویؒ کا واقعہ:

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمتہ اللہ علیہ کے خلاف گرفتاری کے وارنٹ جاری

ہو چکے ہیں، چاروں طرف پولیس تلاش کرتی پھر رہی ہے اور آپ چھتہ کی مسجد میں تشریف فرما ہیں، وہاں پولیس پہنچ گئی، مسجد کے اندر آپ اکیلے تھے، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کا نام سن کر ذہنوں میں تصور آتا تھا کہ آپ بہت بڑے عالم ہیں، تو آپ شاندار قسم کے لباس اور جبہ پہنے ہوں گے، وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا، آپ تو ہر وقت ایک معمولی لنگی، ایک معمولی کرتہ پہنے ہوئے تھے، جب پولیس اندر داخل ہوئی، تو یہ سمجھا کہ مسجد کا کوئی خادم ہے، چنانچہ پولیس نے پوچھا کہ مولانا محمد قاسم صاحب کہاں ہیں؟ آپ فوراً اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر کہا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو یہاں تھے اور اس کے ذریعہ اس کو یہ تاثر دیا کہ اس وقت یہاں موجود نہیں ہیں، لیکن زبان سے یہ جھوٹا کلمہ نہیں نکلا کہ یہاں نہیں ہیں، چنانچہ وہ پولیس واپس چلی گئی۔

اللہ تعالیٰ کے بندوں کو (ایسے وقت میں بھی جب کہ جان پر بنی ہوئی ہو) یہ خیال رہتا ہے کہ زبان سے کوئی غلط لفظ نہ نکلے، زبان سے صریح جھوٹ نہ نکلے اور اگر کبھی مشکل وقت آجائے، تو اس وقت بھی توریہ کرکے اور گول مول بات کرکے کام چل جائے، یہ بہتر ہے، البتہ اگر جان پر بن جائے، جان جانے کا خطرہ ہو، یا شدید ناقابل برداشت ظلم کا اندیشہ ہو اور توریہ سے اور گول مول بات کرنے سے بھی بات نہ بنے، تو اس وقت شریعت نے جھوٹ بولنے کی بھی اجازت دے دی ہے، لیکن اس اجازت کو اتنی کثرت سے استعمال کرنا جس طرح آج اس کا استعمال ہو رہا ہے، یہ سب حرام ہے اور اس میں جھوٹی گواہی کا گناہ ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے حفاظت فرمائے۔ آمین



## بچوں کے دلوں میں جھوٹ کی نفرت پیدا کریں:

بچوں کے دلوں میں جھوٹ کی نفرت پیدا کریں، خود بھی شروع سے جھوٹ سے بچنے کی عادت ڈالیں اور بچوں سے اس طرح بات کریں، کہ ان کے دلوں میں بھی جھوٹ کی نفرت پیدا ہو جائے اور سچائی کی محبت پیدا ہو، اس لیے بچوں کے سامنے کبھی غلط بات، کوئی جھوٹ نہ بولیں، اس لیے کہ جب بچہ یہ دیکھتا ہے کہ باپ جھوٹ بول رہا ہے، ماں جھوٹ بول رہی ہے، تو پھر بچے کے دل سے جھوٹ بولنے کی نفرت ختم ہو جاتی ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ

جھوٹ بولنا تو روزانہ کا معمول ہے، اس لیے بچپن ہی سے بچوں میں اس بات کی عادت ڈالی جائے کہ زبان سے جو بات نکلے، وہ پتھر کی لکیر ہو، اس میں کوئی غلطی نہ ہو اور نفس الامر کے خلاف کوئی بات نہ ہو، دیکھئے نبوت کے بعد سب سے اونچا مقام صدیق کا مقام ہے اور صدیق کے معنی ہیں بہت سچا جس کے قول میں خلاف واقعہ بات کا شبہ بھی نہ ہو۔

## عملی جھوٹ کی ایک صورت:

جھوٹ جس طرح زبان سے ہوتا ہے، بعض اوقات عمل سے بھی ہوتا ہے، اس لیے کہ بعض اوقات انسان ایسا عمل کرتا ہے، جو درحقیقت جھوٹا عمل ہوتا ہے، حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ۔

اَلْمُتَشَبِّعُ بِمَا لَمْ يُعْطَ كَلَابِسِ ثَوْبَىْ زُوْرٍ.

(ابوداؤد کتاب الادب باب فی المتشبع بما لم یعط)

یعنی جو شخص اپنے عمل سے اپنے آپ کو ایسی چیز کا حامل قرار دے، جو اس کے اندر نہیں ہے، تو وہ جھوٹ کا لباس پہننے والا ہے، مطلب اس کا یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے عمل سے اپنے آپ کو ایسا ظاہر کرے جیسا کہ حقیقت میں نہیں ہے، یہ بھی گناہ ہے، مثلاً ایک شخص جو حقیقت میں بہت دولت مند نہیں ہے، لیکن وہ اپنے آپ کو اپنی اداؤں سے، اپنی نشت و برخواست سے، اپنے طریق زندگی سے اپنے آپ کو دولت مند ظاہر کرتا ہے، یہ بھی عملی جھوٹ ہے، یا اس کے برعکس ایک اچھا کھاتا پیتا انسان ہے، لیکن اپنے عمل سے تکلف کر کے اپنے آپ کو ایسا ظاہر کرتا ہے، تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ اس کے پاس کچھ نہیں ہے۔ یہ بہت مفلس ہے، نادار ہے، غریب ہے، حالانکہ حقیقت میں وہ غریب نہیں ہے، اس کو بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی جھوٹ قرار دیا، لہٰذا عملی طور پر کوئی ایسا کام کرنا جس سے دوسرے شخص پر غلط تاثر قائم ہو، یہ بھی جھوٹ کے اندر داخل ہے۔

## غیر سید کا اپنے آپ کو سید کہلانا یا لکھنا جھوٹ ہے:

بہت سے لوگ اپنے ناموں کے ساتھ ایسے الفاظ اور القاب لکھتے ہیں، جو واقعہ کے مطابق نہیں ہوتے، چونکہ رواج چل پڑا ہے، اس لیے بلا تحقیق لکھنا شروع کر دیتے ہیں،

مثلاً کسی شخص نے اپنے نام کے ساتھ سید لکھنا شروع کر دیا، جبکہ حقیقت میں سید نہیں ہے، اس لیے کہ حقیقت میں سید وہ ہے، جو باپ کی طرف سے، نسب کے اعتبار سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں سے ہو وہ سید ہے، بعض لوگ ماں کی طرف سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد سے ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو سید لکھنا شروع کر دیتے ہیں، یہ بھی غلط ہے، لہذا جب تک سید کی تحقیق نہ ہو، اس وقت تک سید لکھنا جائز نہیں، البتہ تحقیق کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ اگر خاندان میں یہ بات مشہور چلی آتی ہے کہ یہ سادات کے خاندان میں سے ہیں، تو پھر لکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اگر سید ہونا معلوم نہیں ہے اور نہ اس کی دلیل موجود ہے، تو اس میں جھوٹ بولنے کا گناہ ہے۔

## غیر پروفیسر کا پروفیسر لکھنا بھی جھوٹ ہے:

بعض لوگ حقیقت میں پروفیسر نہیں ہیں، لیکن اپنے نام کے ساتھ پروفیسر لکھنا شروع کر دیتے ہیں، اس لیے کہ پروفیسر تو ایک خاص اصطلاح ہے، جو خاص لوگوں کے لیے بولی جاتی ہے، یا جیسے عالم یا مولانا کا لفظ اس شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے، جو درس نظامی کا فارغ التحصیل ہو اور باقاعدہ اس نے کسی سے علم حاصل کیا ہو، اس کے لیے مولانا کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، اب بہت سے لوگ جنہوں نے باقاعدہ علم حاصل نہیں کیا، لیکن اپنے نام کے ساتھ مولانا لکھنا شروع کر دیتے ہیں، یہ بھی خلاف واقعہ ہے اور جھوٹ ہے ان باتوں کو ہم لوگ جھوٹ نہیں سمجھتے کہ یہ بھی گناہ کے کام ہیں، اس لیے ان سے پرہیز کرنے کی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

(اصلاحی خطبات: جلد سوم)

روح کی بیماریاں اور ان کا علاج

# باب......(۱۰)



## حسد

ایک مہلک بیماری اور معاشرتی ناسور

# حسد

## ایک مہلک بیماری اور معاشرتی ناسور

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا. اَمَّا بَعْدُ. عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ اِیَّاکُمْ وَالْحَسَدَ فَاِنَّ الْحَسَدَ یَاْکُلُ الْحَسَنَاتِ کَمَا تَاْکُلُ النَّارُ الْحَطَبَ اَوْقَالَ الْعُشْبَ.

(ابو داؤد کتاب الادب باب فی الحسد)



### ''حسد'' نیکیوں کو بھسم کر دیتا ہے:

جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمارے ظاہری اعمال میں بعض چیزیں فرض و واجب قرار دی ہیں اور بعض چیزیں گناہ قرار دی ہیں، اسی طریقے سے ہمارے باطنی اعمال میں بہت سے اعمال فرض ہیں اور بہت سے اعمال گناہ اور حرام ہیں، ان سے بچنا اور اجتناب کرنا بھی اتنا ہی ضروری ہے، جتنا ظاہر کے کبیرہ گناہوں سے بچنا ضروری ہے، ان میں سے بعض کا بیان پچھلے جمعوں میں ہوگیا، آج اس سلسلے میں باطن کی ایک اور خطرناک بیماری ''حسد'' کا ذکر کرنا مقصود ہے۔

یہ حدیث جو ابھی میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہے، اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بیماری کا ذکر فرمایا ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حسد سے بچو، اس لیے کہ یہ حسد انسان کی نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے، جیسے آگ لکڑی کو یا سوکھی گھاس کو کھا جاتی ہے، راوی کو شک ہے کہ آپ نے لکڑی کا لفظ بیان فرمایا تھا، یا سوکھی گھاس کا لفظ بیان فرمایا

تھا، یعنی جس طرح آگ سوکھی گھاس کو لگ جائے، تو وہ اس کو بھسم کر ڈالتی ہے، ختم کر دیتی ہے، اس طرح اگر کسی شخص میں حسد کی بیماری ہو، تو وہ اس کی نیکیوں کو کھا جاتی ہے۔

## حسد کی آگ سلگتی رہتی ہے:

ایک آگ تو وہ ہوتی ہے جو بہت بڑی ہوتی ہے، جو منٹوں میں سب کچھ جلا کر ختم کر دیتی ہے اور ایک آگ وہ ہوتی ہے جو ہلکی ہلکی سلگتی رہتی ہے، اگر وہ آگ کسی کو لگائی جائے، تو وہ آگ ایک دم سے اس کو جلا کر ختم نہیں کرے گی، بلکہ وہ آہستہ آہستہ سلگتی رہے گی اور تھوڑا تھوڑا کر کے اس کو کھاتی رہے گی، حتی کہ وہ ساری لکڑی ختم ہو کر راکھ بن جائے گی، اسی طرح حسد ایک ایسی بیماری اور ایک ایسی آگ ہے، جو رفتہ رفتہ سلگتی چلی جاتی ہے اور انسان کی نیکیوں کو فنا کر ڈالتی ہے اور انسان کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ میری نیکیاں ختم ہو رہی ہیں، اس لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حسد سے بچنے کی تاکید فرمائی۔

## حسد سے بچنا فرض ہے:

لیکن اگر ہم اپنے معاشرے اور ماحول پر نظر دوڑا کر دیکھیں، تو ہمیں نظر آئے گا کہ یہ حسد کی بیماری معاشرے کے اندر چھائی ہوئی ہے اور بہت کم اللہ کے بندے ایسے ہیں، جو اس بیماری سے بچے ہوئے ہیں اور اس سے پاک ہیں، ورنہ کسی نہ کسی درجے میں حسد کا دل میں گزر ہو جاتا ہے اور اس سے بچنا فرض ہے، اس سے بچے بغیر گزارا نہیں، لیکن ہمارا اس طرف دھیان اور خیال بھی نہیں جاتا، کہ ہم اس بیماری کے اندر مبتلا ہیں، اس لیے اس سے بچنے کے لیے بہت اہتمام کی ضرورت ہے۔

پہلے یہ سمجھ لیں کہ حسد کی حقیقت کیا ہے؟ اور اس کی قسمیں کون کون سی ہیں؟ اور اس کے اسباب کیا ہیں؟ اور اس کا علاج کیا ہے؟ یہ چار باتیں آج کے بیان کا موضوع ہیں، اللہ تعالیٰ اس بیان کو ہمارے دلوں سے اس بیماری کو ختم کرنے کا ذریعہ بنا دیں۔ آمین

## حسد کی حقیقت:

حسد کی حقیقت یہ ہے کہ ایک شخص نے دوسرے کو دیکھا کہ اس کو کوئی نعمت ملی ہوئی ہے،

چاہے وہ نعمت دنیا کی ہو یا دین کی، اس نعمت کو دیکھ کر اس کے دل میں جلن اور کڑھن پیدا ہوئی کہ اس کو یہ نعمت کیوں مل گئی اور دل میں یہ خواہش ہوئی کہ یہ نعمت اس سے چھن جائے، تو اچھا ہے، یہ ہے حسد کی حقیقت۔

مثلاً اللہ تعالیٰ نے کسی بندے کو مال و دولت دیا، یا کسی کو صحت کی دولت دی، یا کسی کو شہرت دی، یا کسی کی عزت دی، یا کسی کو علم دیا، اب دوسرے شخص کے دل میں یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ یہ نعمت اس کو کیوں ملی؟ اس سے یہ نعمت چھن جائے، تو بہتر ہے اور اس کے خلاف کوئی بات آتی ہے، تو اس سے خوش ہوتا ہے اور اگر اس کی ترقی سامنے آتی ہے، تو اس سے دل میں رنج اور افسوس ہوتا ہے کہ یہ کیوں آگے بڑھ گیا؟ اس کا نام حسد ہے۔

اب اگر حسد کی اس حقیقت کو سامنے رکھ کر غور کرو گے، تو یہ نظر آئے گا کہ حسد کرنے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر اعتراض کر رہا ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت اس کو کیوں دی؟ مجھے کیوں نہیں دی؟ یہ تو اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر اعتراض کر رہا ہے، قادر مطلق پر اعتراض کر رہا ہے، اپنے محسن اور منعم پر اعتراض کر رہا ہے اور ساتھ ساتھ یہ خواہش کر رہا ہے کہ یہ نعمت کسی طرح اس سے چھن جائے، اسی وجہ سے اس کی سنگینی اور خطرناکی بہت زیادہ ہے۔

## حسد جائز نہیں مگر ''رشک'' کرنا جائز ہے:

یہاں یہ بات سمجھ لیں کہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دوسرے شخص کو ایک نعمت حاصل ہوئی، اب اسکے دل میں خواہش ہو رہی ہے کہ مجھے بھی یہ نعمت حاصل ہو جائے، تو اچھا ہے، یہ حسد نہیں ہے، بلکہ یہ رشک ہے، عربی میں اس کو غبطہ کہا جاتا ہے اور بعض عربی دفعہ زبان میں اس پر بھی حسد کا لفظ بولا جاتا ہے، لیکن حقیقت میں یہ حسد نہیں، مثلاً کسی شخص کا اچھا مکان دیکھ کر دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی، کہ جس طرح اس کا مکان آرام دہ اور اچھا بنا ہوا ہے، میرا بھی ایسا مکان ہو جائے یا مثلاً جیسی ملازمت اس کو ملی ہوئی ہے، مجھے بھی ایسی ملازمت مل جائے، یا جیسا علم اللہ تعالیٰ نے اس کو دیا ہے، ایسا علم اللہ تعالیٰ مجھے بھی عطا فرما دے، یہ حسد نہیں، بلکہ رشک ہے، اس پر کوئی گناہ نہیں، لیکن جب اس کی نعمت کے زائل ہونے کی خواہش دل میں پیدا ہو کہ اس کی یہ نعمت اس سے چھن جائے، تو اچھا ہے،

یہ حسد ہے۔

## حسد کے درجات:

پھر حسد کے تین درجات ہیں:

۱)...... پہلا درجہ یہ ہے کہ دل میں یہ خواہش ہو کہ مجھے بھی ایسی نعمت مل جائے، اب اگراس کے پاس رہتے ہوئے مل جائے، تو اچھا ہے، ورنہ اس سے چھن جائے اور مجھے مل جائے، یہ حسد کا پہلا درجہ ہے۔

۲)...... حسد کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ جو نعمت دوسرے کو ملی ہوئی ہے، وہ نعمت اس سے چھن جائے اور مجھے مل جائے، اس میں پہلے قدم پر یہ خواہش ہے کہ اس سے وہ چھن جائے اور دوسرے قدم پر یہ خواہش ہے کہ مجھے مل جائے، یہ حسد کا دوسرا درجہ ہے۔

۳)...... حسد کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ دل میں یہ خواہش ہو کہ یہ نعمت اس سے کسی طرح چھن جائے اور اس نعمت کی وجہ سے اس کو جو امتیاز اور مقام حاصل ہوا ہے، اس سے وہ محروم ہو جائے، پھر چاہے وہ نعمت مجھے ملے، یا نہ ملے، یہ حسد کا رزیل ترین، ذلیل ترین، خبیث ترین درجہ ہے۔ اللہ تعالی ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے۔ آمین

## سب سے پہلے حسد کرنے والا کون؟

سب سے پہلے حسد کرنے والا ابلیس ہے، جب اللہ تعالی نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرمایا کہ میں اس کو زمین میں خلافت عطا کروں گا، اپنا خلیفہ بناؤں گا اور پھر حضرت آدم علیہ السلام کو یہ مقام عطا فرمایا کہ فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو، پس یہ حکم سن کر یہ ابلیس جل گیا کہ ان کو یہ مقام مل گیا اور مجھے نہ ملا اور اس نتیجے میں سجدہ کرنے سے انکار کر دیا، لہذا سب سے پہلے حسد کرنے والا بھی شیطان ہے اور سب سے پہلے تکبر کرنے والا بھی شیطان ہے۔

## حسد ایذاء رسانی کو مستلزم ہے:

اور اس حسد کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس سے حسد کیا جا رہا ہے، اگر اس کو کوئی

تکلیف پہنچ جائے، یا اس کو کوئی رنج یا غم پہنچ جائے، تو یہ حسد کرنے والا اس کی تکلیف اور اس کے رنج و غم سے خوش ہوتا ہے اور اگر اس کی ترقی ہو جائے، یا اس کو کوئی نعمت مل جائے، تو اس سے اس کو رنج ہوتا ہے اور دوسروں کی تکلیف پر خوشی ہونے کو عربی میں شماتت کہتے ہیں، یہ بھی حسد کی ایک قسم ہے، قرآن و حدیث میں کئی مقامات پر اس کی مذمت آئی، قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿ اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ﴾ .(النساء ۵۴)

یعنی کیا لوگ دوسروں پر حسد کرتے ہیں کہ اللہ تعالی نے اپنی نعمت دوسروں کو عطا کر دی، اب یہ لوگ اس پر حسد کر رہے ہیں اور جل رہے ہیں۔

## حسد کے اسباب:

اس حسد کی بیماری کا سبب کیا ہوتا ہے؟ اور یہ بیماری کیوں دل میں پیدا ہوتی ہے؟ اس کے دو سبب ہوتے ہیں:

۱)...... اس کا ایک سبب دنیا کے مال و دولت کی محبت ہے اور منصب کی محبت ہے، اس لیے کہ انسان ہمیشہ یہ چاہتا ہے کہ میرا مرتبہ بلند رہے، میں اونچا رہوں، اب اگر دوسرا شخص آگے بڑھتا ہے، تو یہ اس کو گرانے کی فکر کرتا ہے۔

۲)......اور اس بیماری کا دوسرا سبب بغض اور کینہ ہے، مثلاً کسی کے دل میں بغض اور کینہ پیدا ہو گیا اور اس بغض کے نتیجے میں اس کی راحت سے تکلیف ہوتی ہے اور اس کی خوشی سے رنج ہوتا ہے، جب دل میں یہ دو باتیں ہوں گی، تو اس کے نتیجے میں لازماً حسد پیدا ہوگا۔

## حسد دنیا و آخرت میں ہلاک کرنے والی بیماری ہے:

یہ حسد ایسی بری بیماری ہے، جو کہ آخرت میں انسان کو ہلاک کرنے والی ہے، بلکہ دنیا کے اندر بھی انسان کے لیے مہلک ہے، لہذا اس کے ذریعے دنیا کا بھی نقصان اور آخرت کا بھی نقصان، اس لیے کہ جو شخص دوسرے سے حسد کرے گا، وہ ہمیشہ تکلیف اور گھٹن میں رہے گا، اس لیے کہ جب بھی دوسرے کو آگے بڑھتا ہوا دیکھے گا، تو اسکو دیکھ کر دل میں رنج

اور گھٹن پیدا ہوگی اور اس گھٹن کے نتیجے میں وہ رفتہ رفتہ صحت کو بھی خراب کر لے گا۔

## حاسد حسد کی آگ میں جلتا رہتا ہے:

عربی کا ایک شعر ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ حسد کی مثال آگ جیسی ہے اور آگ کی خاصیت یہ ہے کہ جب اس کو دوسری چیز کھانے کو ملے، تب تو یہ اس کو کھاتی رہے گی، مثلاً لکڑی کو آگ لگی ہوئی، تو وہ آگ لکڑی کو کھاتی رہے گی، لیکن جب لکڑی ختم ہو جائے گی، تو پھر آگ کا ایک حصہ خود اس کے دوسرے حصے کو کھانا شروع کر دے گا، یہاں تک کہ وہ آگ بھی ختم ہو جاتی ہے، اسی طرح حسد کی آگ بھی ایسی ہے کہ حسد کرنے والا پہلے تو دوسرے کو خراب کرنے اور دوسرے کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے، لیکن جب دوسرے کو نقصان نہیں پہنچا سکتا، تو پھر حسد کی آگ میں خود جل جل کر ختم ہو جاتا ہے۔

## حسد کا علاج:

اس حسد کی بیماری کا علاج یہ ہے کہ وہ شخص یہ تصور کرے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں اپنی خاص حکمتوں اور مصلحتوں سے انسانوں کے درمیان اپنی نعمتوں کی تقسیم فرمائی ہے، کسی کو کوئی نعمت دیدی اور کسی کو کوئی نعمت دے دی، کسی کو صحت کی نعمت دے دی، تو کسی کو مال و دولت کی نعمت دے دی، کسی کو عزت کی نعمت دے دی، تو کسی کو حسن و جمال کی نعمت دے دی، کسی کو چین و سکون کی نعمت دے دی اور اس دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں ہے، جس کو کوئی نہ کوئی نعمت میسر نہ ہو، کسی نہ کسی تکلیف میں مبتلا نہ ہو۔

## تین عالم:

اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں تین عالم پیدا فرمائے ہیں:

۱)......ایک عالم وہ ہے جس میں راحت ہی راحت ہے، تکلیف کا گزر نہیں، رنج و غم کا نام و نشان نہیں، وہ ہے جنت کا عالم، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے وہاں پہنچا دے (آمین) وہاں تو راحت ہی راحت اور آرام ہی آرام ہے۔

۲)......اور ایک عالم بالکل اس کے مقابل میں ہے، جس میں تکلیف ہی تکلیف ہے،

غم ہی غم ہے، صدمہ ہی صدمہ ہے، راحت اور خوشی کا وہاں گزر اور نام ونشان نہیں، وہ ہے جہنم کا عالم۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے۔ (آمین)

۳)...... تیسرا عالم وہ ہے جو دونوں سے مرکب ہے، جس میں خوشی بھی ہے، غم بھی، راحت بھی ہے، تکلیف بھی، وہ یہ عالم دنیا، جس میں ہم اور آپ جی رہے ہیں، اس عالم دنیا کے اندر کوئی انسان ایسا نہیں ملے گا، جو یہ کہے مجھے ساری زندگی کبھی کوئی تکلیف پیش نہیں آئی اور نہ کوئی انسان ایسا ملے گا، جس کو کبھی کوئی راحت اور خوشی حاصل نہ ہوئی ہو، یہاں ہر خوشی کے اندر رنج کا کانٹا بھی لگا ہوا ہے اور ہر تکلیف کے اندر راحت بھی پوشیدہ ہے، نہ یہاں کی راحت خالص ہے اور نہ یہاں کی تکلیف خالص ہے۔

## حقیقی راحت کس کو حاصل ہے؟

بہر حال اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت اور مصلحت سے سارا عالم پیدا فرمایا اور پھر اس میں کسی کو کوئی نعمت دیدی، کسی کو کوئی نعمت دیدی، کسی کو مال و دولت کی نعمت دیدی، تو دوسرے کو اس کے مقابلے میں صحت کی نعمت دیدی، اب مال و دولت والا صحت والے پر حسد کر رہا ہے کہ اس کو ایسی اچھی صحت کیوں مل گئی؟ اور جو صحت والا ہے وہ مال و دولت والے پر حسد کر رہا ہے کہ اس کو اتنا مال و دولت کیوں مل گیا؟

لیکن حقیقت میں یہ تقدیر کے فیصلے ہیں اور اسی کی حکمت اور مصلحت پر مبنی ہیں اور کوئی بھی انسان دوسرے کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کونسا انسان اس دنیا میں زیادہ راحت میں ہے؟ دیکھنے میں بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک آدمی کے بہت سارے کارخانے چل رہے ہیں، بنگلے کھڑے ہیں، کاریں ہیں، نوکر چاکر ہیں اور دنیا بھر کا عیش وعشرت کا سامان میسر ہے۔

اور دوسری طرف ایک مزدور ہے، جو صبح سے شام تک پتھر ڈھوتا ہے اور بمشکل اپنے پیٹ بھرنے کا سامان کرتا ہے، اب اگر مزدور اس مال و دولت والے انسان کو دیکھے گا، تو یہی سوچے گا کہ اس کو تو دنیا کی بہت بڑی بڑی نعمتیں میسر ہیں۔

لیکن اگر ساتھ ساتھ ان دونوں کی اندرونی زندگی میں جھانک کر دیکھیں گے، تو معلوم ہوگا کہ جس شخص کی ملیں کھڑی ہیں، جس کے پاس بنگلے اور کاریں ہیں اور جس کے پاس بے

شمار مال و دولت اور عیش و عشرت کا سامان ہے، ان کا یہ حال ہے کہ رات کو جب بستر پر سوتے ہیں، تو صاحب بہادر کو اس وقت تک نیند نہیں آتی، جب تک نیند کی گولی نہ کھائیں اور یہ حال ہے کہ ان کے دستر خوان پر انواع و اقسام کے ایک سے ایک کھانے چنے ہوئے ہیں، پھل موجود ہیں، لیکن ان کا معدہ اتنا خراب ہے کہ ایک دو لقمے بھی قبول کرنے کو تیار نہیں، اس لیے کہ معدہ میں السر ہے اور اس کی وجہ سے ڈاکٹر نے منع کر دیا ہے کہ فلاں چیز بھی مت کھاؤ اور فلاں چیز بھی مت کھاؤ۔ اب ساری نعمتیں، ساری غذائیں اس کے لیے بیکار ہیں، اب آپ بتائیں کہ وہ شخص زیادہ راحت میں ہے جس کے پاس دنیا کے سارے ساز و سامان تو میسر ہیں، لیکن نیند سے محروم ہے، کھانے سے محروم ہے؟

اور ایک مزدور ہے، جو آٹھ گھنٹے کی سخت ڈیوٹی دینے کے بعد ساگ روٹی اور چٹنی روٹی خوب بھوک لگنے کے بعد لذت و حلاوت کے ساتھ کھاتا ہے اور جب بستر پر سوتا ہے تو فوراً نیند کی آغوش میں چلا جاتا ہے اور آٹھ دس گھنٹے تک بھر پور نیند کر کے اٹھتا ہے۔

بتائیے کہ ان دونوں میں سے راحت کے اندر کون ہے؟

حقیقی راحت کس کو حاصل ہے؟

اگر غور سے دیکھو گے، تو یہ نظر آئے گا کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے شخص کو دنیا کے اسباب اور سامان بے شک عطا کیے ہیں، لیکن حقیقی راحت اس دوسرے شخص کو عطا فرمائی ہے، یہ سب اللہ تعالیٰ کی حکمت کے فیصلے ہیں۔

## ''رزق'' ایک نعمت ''کھلانا'' دوسری نعمت:

میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ (اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے آمین) ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ کھانا کھانے کے بعد یہ دعا پڑھی جاتی ہے کہ:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنِیْ هٰذَا وَرَزَقَنِیْهِ مِنْ غَیْرِ حَوْلٍ مِنِّیْ وَلَا قُوَّةٍ غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ.

(ترمذی شریف، ابواب الدعوات باب مایقول اذا فرغ من الطعام)

یعنی اللہ تعالیٰ کا شکر ہے، جس نے مجھے کھانا کھلایا اور مجھے یہ رزق بغیر میری کوشش اور طاقت سے عطا فرمایا، جو شخص کھانے کے بعد یہ دعا پڑھے، تو اللہ تعالیٰ اس کے تمام پچھلے

(صغیرہ) گناہ معاف فرمادیتے ہیں۔

پھر والد صاحب نے فرمایا کہ ایک روایت میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دو لفظ علیحدہ علیحدہ ذکر فرمائے ہیں ایک "رزقنیہ" اور دوسرے "اطعمنی" یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے رزق دیا اور یہ کھانا کھلایا، اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب دونوں لفظوں کا مطلب ایک یہ یعنی رزق دیا اور کھانا کھلایا، تو پھر دونوں کو علیحدہ علیحدہ کیوں ذکر فرمایا؟ ایک ہی لفظ کو بیان کردینا کافی تھا؟ پھر خود جواب دیا کہ دونوں باتیں علیحدہ علیحدہ ہیں، اس لیے رزق حاصل ہونا ایک مستقل نعمت ہے اور کھلانا مستقل دوسری نعمت ہے، اس لیے کہ بعض اوقات رزق حاصل ہونے کی نعمت تو حاصل ہوتی ہے کہ گھر میں اعلیٰ درجے کے کھانے پکے ہوئے تیار ہیں اور ہر طرح کے پھل فروٹ موجود ہیں، لیکن بھوک نہیں لگ رہی ہے، معدہ خراب ہے اور ڈاکٹر صاحب نے کھانے سے منع کیا ہوا ہے، اب اس صورت میں "رزقنیہ" حاصل ہے، لیکن "اطعمنی" حاصل نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے رزق دے رکھا ہے، لیکن کھانے کی صلاحیت اور ہضم کی قوت نہیں دی ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمتیں اور مصلحتیں ہیں کہ کسی کو کوئی نعمت عطا فرمادی اور کسی کو کوئی نعمت عطا فرمادی۔

## اللہ کی حکمت کے فیصلے:

لہٰذا حسد کا علاج یہ ہے کہ حسد کرنے والا یہ سوچے کہ اگر دوسرے شخص کو کوئی بڑی نعمت حاصل ہے اور اس کی وجہ سے تمہارے دل میں کڑھن پیدا ہورہی ہے، تو کتنی نعمتیں ایسی ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں دی رکھی ہیں اور اس شخص کو نہیں دیں، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس سے بہتر صحت عطا فرمائی ہو، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حسن و جمال اس سے زیادہ عطا فرمایا ہو، یا کوئی اور نعمت اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا فرمائی ہو اور اس کو وہ نعمت میسر نہ ہو، لہٰذا ان نعمتوں کی تقسیم میں اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت ہوتی ہے کہ انسان کو پتہ بھی نہیں چلتا، ان باتوں کو سوچنے سے حسد کی بیماری میں کمی آتی ہے۔

## اردو کی ایک مثل "اللہ گنجے کو ناخن نہ دے":

یہ جو اردو کے اندر مثل مشہور ہے کہ "اللہ تعالیٰ گنجے کو ناخن نہ دے" یہ بڑی حکیمانہ مثل

ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تمہیں مال و دولت کی نعمت حاصل نہیں ہے، اگر تم کو مل جاتی تو نہ جانے تم اس کی وجہ سے کیا کیا فساد برپا کرتے اور کس عذاب میں مبتلا ہو جاتے اور اس کی کیسی ناقدری کرتے اور تمہارا کیا حشر بنتا؟ اب اگر اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت تمہیں نہیں دی ہے، تو کسی مصلحت کی وجہ سے نہیں دی ہے، اسی وجہ سے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا

﴿ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ﴾ (النساء ۳۲)

یعنی اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر جن چیزوں میں فضیلت دے دی ہے، تم ان چیزوں کی تمنا مت کرو، کیوں؟ اس لیے کہ تمہیں کیا معلوم کہ اگر تم کو وہ نعمت حاصل ہو گئی، تو تم کیا فساد برپا کرو گے، واقعات آپ نے سنے ہوں گے کہ ایک آدمی تمنا کرتا رہا کہ فلاں نعمت مجھے مل جائے، مگر جب وہ نعمت مل گئی، تو وہ بجائے مفید ہونے کے اس کے لیے مضر ثابت ہوئی، اس لیے سب سے پہلے یہ سوچنا چاہیے کہ یہ جو دوسرے شخص کو نعمت مل جانے پر دل جل رہا ہے، یہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر اعتراض ہے، اس کی مصلحت سے بے خبری کا نتیجہ ہے اور ہو سکتا ہے کہ تمہیں اس سے بھی بڑی کوئی نعمت میسر ہو، جو اس کو حاصل نہیں۔



## اپنی نعمتوں کی طرف نظر کرو:

اور یہ ساری خرابی اس سے پیدا ہوتی ہے کہ انسان اپنی طرف دیکھنے کی بجائے دوسروں کی طرف دیکھتا ہے، خود اپنے کو جو نعمت حاصل ہیں، ان کا تو دھیان اور خیال ہی نہیں اور ان پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی توفیق نہیں، مگر دوسروں کی نعمتوں کی طرف دیکھ رہا ہے، اسی طرح اپنے عیوب کی طرف تو نظر نہیں، مگر دوسرے کے عیوب تلاش کر رہا ہے، اگر انسان اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی ہر وقت نازل ہونے والی نعمتوں کا استحضار کرے، تو پھر دوسرے پر کبھی حسد نہ کرے، تم کیسی بھی حالت میں ہو، پھر بھی اللہ تعالیٰ نے تمہیں نعمتوں کی ایسی بارش میں رکھا ہے اور صبح سے شام تک تمہارے اوپر نعمتوں کی بارش برسا رہا ہے کہ اگر تم اس کا تصور کرتے رہو، تو دوسروں کی نعمت پر کبھی جلن پیدا نہ ہو۔

## دنیاوی معاملات میں ہمیشہ اپنے سے کمتر کو دیکھو:

آج کل ہمارے معاشرے میں لوگوں کو دوسروں کے معاملات میں تحقیق اور تفتیش

کرنے کا بڑا ذوق ہے، مثلاً فلاں آدمی کے پاس پیسے کس طرح آرہے ہیں؟ کہاں سے پیسے آرہے ہیں؟ وہ کیسا مکان بنوارہا ہے؟ وہ کیسی کار خرید رہا ہے؟ اس کے حالات کیسے ہیں؟ ایک ایک کا جائزہ لینے کی فکر ہے اور پھر اس کی تفتیش اور تحقیق کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی ایسی چیز سامنے آتی ہے، جو خوشنما اور دلکش ہے، لیکن اپنے پاس موجود نہیں، تو پھر اس سے حسد پیدا نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا؟ اس لیے وہ مقولہ یادرکھنے کے قابل ہے، جو پہلے بھی عرض کرچکا ہوں کہ ''دنیا کے معاملے میں ہمیشہ اپنے سے نیچے والے کو اور اپنے سے کم تر کو دیکھو اور دین کے معاملے میں ہمیشہ اپنے سے اوپر والے کو دیکھو۔''

## عبداللہ بن مبارک کا سبق آموز واقعہ:

چنانچہ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ میں ایک عرصہ دراز تک مالداروں کے محلے میں رہا اور ان کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا رہا، تو اس زمانے میں مجھ سے زیادہ رنجیدہ اور غمزدہ کوئی نہیں تھا، اس لیے کہ جس کو بھی دیکھتا ہوں، تو یہ نظر آتا ہے کہ اس کا کپڑا میرے کپڑے سے عمدہ ہے، اس کی سواری میری سواری سے اعلیٰ ہے، اس کا مکان میرے مکان سے اعلیٰ ہے، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر وقت اس غم میں مبتلا رہتا تھا کہ اسے تو یہ نعمتیں حاصل ہیں، مجھے حاصل نہیں، اس لیے مجھ سے زیادہ غمزدہ انسان کوئی نہیں تھا، لیکن اس کے بعد میں نے اپنی رہائش ایسے لوگوں کے محلے میں اختیار کرلی، جو دنیاوی اعتبار سے فقراء اور کم حیثیت کے لوگ تھے اور ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا شروع کیا، تو اس کے نتیجے میں میں آرام میں آگیا، اس لیے کہ یہاں معاملہ بالکل برعکس تھا، اس لیے کہ جس کو میں دیکھتا ہوں، تو یہ نظر آتا ہے کہ میرا لباس اس کے لباس سے عمدہ ہے، میری سواری اس کی سواری سے اعلیٰ ہے، میرا مکان اس کے مکان سے اچھا ہے، چنانچہ اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے مجھے قلبی راحت عطا فرمادی۔

## خواہشات کا کوئی کنارہ نہیں:

یادرکھو کہ کوئی انسان اگر دنیا کے اسباب جمع کرنے میں آگے بڑھتا چلا جائے، تو اس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

کار دنیا کسے تمام نہ کرو

دنیا کا معاملہ کبھی پورا نہیں ہوتا۔ اس دنیا کے اندر جو سب سے زیادہ مالدار انسان ہو، اس سے جا کر پوچھ لو کہ کیا تمہیں سب چیزیں حاصل ہوگئیں ہیں؟ اب تو تمہیں کچھ نہیں چاہیے؟ وہ جواب میں یہی کہے گا کہ ابھی تو مجھے اور چاہیے، وہ بھی اس فکر میں نظر آئے گا، کمال میں اور اضافہ ہو جائے، متنبی عربی زبان کا بڑا شاعر ہے، اس نے دنیا کے بارے میں بڑی حکیمانہ بات کہی ہے، وہ یہ ہے کہ:

وَمَا قَضٰى اَحَدٌ مِنهَا لُبَانَتَهُ☆وَلاَ انْتَهٰى اَرَبٌ اِلَّا اِلٰى اَرَبِ

(دیوان متنبی ۔ قافیۃ الباء قال یرثی اخت سیف الدولۃ صفحہ ٤٨)

یعنی اس دنیا سے آج تک کسی کا پیٹ نہیں بھرا، جب کوئی خواہش تم پوری کرو گے، تو اس کے بعد فوراً دوسری خواہش پیدا ہو جائے گی، ہر خواہش ایک نئی خواہش کو جنم دیتی ہے، اور ہر حاجت ایک نئی حاجت کو جنم دیتی ہے۔



## کہاں تک حسد کرو گے؟

کہاں تک حسد کرو گے؟ کہاں تک دوسروں کی نعمتوں پر غم زدہ ہو گے؟ اس لیے کہ یہ بات تو پیش آئے گی کہ کوئی شخص کسی نعمت میں تم سے آگے بڑھا ہوا نظر آئے گا اور کوئی شخص کسی دوسری چیز میں تم سے آگے بڑھا ہوا نظر آئے گا، لہٰذا سب سے زیادہ اس بات کا تصور کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی تقسیم ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو اپنی حکمت اور مصلحت سے تقسیم فرمایا ہے اور اس مصلحت اور حکمت کو تم سمجھ بھی نہیں سکتے ہو، اس لیے کہ تم بہت محدود دائرے میں رہتے ہو، تمہاری عقل محدود، تمہارے سوچنے کا دائرہ محدود، اس محدود دائرے میں تم سوچتے ہو، اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ پوری کائنات کو محیط ہے، وہ یہ فیصلے فرماتے ہیں کہ کس کو کیا چیز دینی ہے؟ اور کس کو کیا چیز نہیں دینی ہے؟ بس اس پر غور کرو گے، تو اس کے ذریعہ حسد کا مادہ ختم ہوگا اور حسد کی بیماری میں کمی واقع ہوگی۔

## حسد کا دوسرا علاج:

اس حسد کی بیماری کا ایک دوسرا موثر علاج ہے، وہ یہ کہ حسد کرنے والا یہ سوچے کہ

میری خواہش تو یہ ہے کہ جس شخص سے حسد کر رہا ہوں، اس سے وہ نعمت چھن جائے، لیکن معاملہ ہمیشہ اس خواہش کے برعکس ہی ہوتا ہے، چنانچہ جس سے حسد کیا ہے، اس شخص کا تو فائدہ ہی فائدہ ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور حسد کرنے والے کا نقصان ہی نقصان ہے، دنیا میں اس کا فائدہ یہ ہے کہ جب تم نے دنیا میں اس کو اپنا دشمن بنالیا تو اصول یہ ہے کہ دشمن کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ میرا دشمن ہمیشہ رنج وغم میں مبتلا رہے، لہذا جب تک تم حسد کرو گے، رنج وغم میں مبتلا رہو گے اور وہ اس بات سے خوش ہوتا رہے گا کہ تم رنج وغم میں مبتلا ہو، یہ تو اس کا دنیاوی فائدہ ہے۔ اور آخرت کا فائدہ یہ ہے تم اس سے جتنا جتنا حسد کرو گے اتنا ہی اس کے نامہ اعمال کے اندر نیکیوں میں اضافہ ہوگا اور وہ چونکہ مظلوم ہے، اس لیے آخرت میں اس کے درجات بلند ہوں گے اور حسد کی لازمی خاصیت یہ ہے کہ یہ حسد انسان کو غیبت پر، عیب جوئی پر، چغل خوری اور بے شمار گناہوں پر آمادہ کرتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود حسد کرنے والے کی نیکیاں اس کے نامہ اعمال میں منتقل ہو جاتی ہیں، اس لیے کہ جب تم اس کی غیبت کرو گے اور اس کے لیے بددعا کرو گے، تو تمہاری نیکیاں اس کے نامہ اعمال میں چلی جائیں گی، جس کا مطلب یہ ہے کہ تم جتنا حسد کر رہے ہو، اپنی نیکیوں کے پیکٹ تیار کر کے اس کے پاس بھیج رہے ہو، تو اس کا تو فائدہ ہو رہا ہے، اب اگر ساری عمر حسد کرنے والا حسد کرے گا، تو وہ اپنی ساری نیکیاں گنوا دے گا اور اس کے نامہ اعمال میں ڈال دے گا۔



## ایک بزرگ کا واقعہ:

ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک صاحب نے آپ سے کہا کہ فلاں آدمی آپ کو برا بھلا کہہ رہا تھا، آپ سن کر خاموش ہو گئے، کچھ جواب نہیں دیا، جب مجلس ختم ہو گئی، تو گھر تشریف لے گئے اور جس نے آپ کی برائی بیان کی تھی، اس کے لیے ایک بہت بڑا تحفہ تیار کر کے اس کے گھر بھیج دیا، لوگوں نے کہا کہ حضرت وہ تو آپ کو برا بھلا کہہ رہا تھا اور آپ نے اس کو ہدیہ بھیج دیا؟ ان بزرگ نے فرمایا کہ وہ تو میرا محسن ہے، اس لیے کہ اس نے میری برائی بیان کر کے میری نیکیوں میں اضافہ کر دیا ہے، اس نے تو مجھ پر احسان کیا ہے، اب میں کچھ تو اس کے احسان کا بدلہ دے دوں، اس نے تو میری

آخرت کی نیکیوں میں اضافہ کر دیا ہے، کم از کم دنیا ہی میں اس کو ہدیہ تحفہ دے دوں۔

## امام ابو حنیفہ کا غیبت سے بچنے کا اہتمام:

اور یہ بات مشہور ہے کہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں کوئی شخص کسی کی غیبت نہیں کر سکتا تھا، اس لیے کہ وہ نہ غیبت کرتے تھے اور نہ غیبت سنتے تھے، ان کی مجلس ہمیشہ غیبت سے خالی ہوتی تھی، ایک دن امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے شاگردوں کے سامنے غیبت اور حسد کی برائی بیان کی اور ان کو یہ سمجھانے کے لیے کہ غیبت سے نیکیاں چلی جاتی ہیں، فرمانے لگے کہ یہ غیبت ایسی چیز ہے کہ جو غیبت کرنے والے کی نیکیوں کو اس شخص کی طرف منتقل کر دیتی ہے، جس کی غیبت کی گئی ہے، اس لیے میں کبھی غیبت نہیں کرتا، لیکن اگر کبھی میرے دل میں یہ خیال آئے کہ میں غیبت کروں، تو اس وقت میں اپنے ماں باپ کی غیبت کروں گا، اس لیے کہ اگر غیبت کے نتیجے میں میری نیکیاں جائیں گی، تو ماں باپ کے نامہ اعمال میں جائیں گی اور گھر کی چیز گھر میں رہے گی، کسی غیر کے پاس نہیں جائیں گی۔

اشارہ اس بات کی طرف کر دیا کہ یہ غیبت اور حسد کرنے والا اپنے دل میں تو دوسرے کی برائی چاہ رہا ہے، لیکن حقیقت میں وہ اس کو دنیا کا بھی فائدہ پہنچا رہا ہے اور آخرت کا فائدہ بھی پہنچا رہا ہے اور اپنا نقصان کر رہا ہے، اس لیے یہ غیبت کرنا اور حسد کرنا کتنی احمقانہ حرکت ہے۔

## امام ابو حنیفہ کا ایک اور واقعہ:

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہم عصر ہے، دونوں ایک ہی زمانے میں گزرے ہیں اور دونوں کے اپنے اپنے حلقہ درس ہوا کرتے تھے، ایک دن حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا کہ وہ بڑے بخیل آدمی ہیں، اس شخص نے کہا کہ ہم نے تو ان کے بارے میں سنا ہے کہ وہ بڑے سخی آدمی ہیں، حضرت سفیان ثوری نے فرمایا کہ وہ اتنے بخیل ہیں کہ اپنی

نیکی کسی کو دینے کے لیے تیار نہیں اور دوسروں کی نیکیاں بہت لیتے رہتے ہیں، وہ اس طرح کہ لوگ ان کی بہت غیبت کرتے رہتے ہیں اور ان کی برائیاں بیان کرتے رہتے ہیں، جس کے نتیجے میں لوگوں کی نیکیاں ان کے نامہ اعمال میں منتقل ہو جاتی ہیں اور وہ خود نہ غیبت کرتے ہیں اور نہ غیبت سنتے ہیں، اس لیے اپنی نیکیاں دینے کے لیے تیار نہیں، لہٰذا آخرت کے لحاظ سے ان سے زیادہ بخیل آدمی کوئی نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس سے حسد کیا جائے، یا جس سے بغض رکھا جائے، یا جس کی غیبت کی جائے حقیقت میں حسد کرنے والا اور غیبت کرنے والا اپنی نیکیوں کے پیکٹ بنا بنا کر اس کے پاس بھیج رہا ہے اور خود خالی ہوتا جا رہا ہے۔

## حقیقی مفلس کون؟

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے پوچھا کہ بتاؤ مفلس کون ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ مفلس وہ ہے جس کے پاس پیسے نہ ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں، یہ حقیقی مفلس نہیں، بلکہ حقیقی مفلس وہ ہے، جو اپنے نامہ اعمال میں بہت ساری نیکیاں، بہت ساری نمازیں، بہت سارے روزے، بہت ذکر و اذکار اور تسبیحات لے کر دنیا سے جائے گا، لیکن جب قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے پاس حساب و کتاب کے لیے حاضر ہوگا، تو وہاں پر لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی گی، ایک کہے گا کہ اس نے میرا فلاں حق پامال کیا تھا، دوسرا کہے گا کہ اس نے میرا فلاں حق ضائع کیا، تیسرا کہے گا اس نے میرا فلاں حق دبایا تھا، اب وہاں کی کرنسی یہ نوٹ تو ہوں نہیں، کہ ان کو دے کر حق پورا کر دیا جائے، وہاں کی کرنسی تو نیکیاں ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ حکم فرمائیں گے کہ ان لوگوں کو حقوق کے بدلے میں اس شخص کی نیکیاں دیدی جائیں، اب ایک شخص اس کی نمازیں لے کر چلا جائے گا، تو دوسرا شخص اس کے روزے لے کر چلا جائے گا، کوئی اس کا ذکر و اذکار لے کر چلے جائے گا، اس طرح اس کی تمام نیکیاں ختم ہو جائیں گی، لیکن لوگوں کے حقوق پورے نہیں ہوں گے، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے جب نیکیاں ختم ہو گئیں، تو صاحب حقوق کے گناہ اس کے اعمال نامہ میں ڈال کر ان کے حقوق ادا کر دو، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب آیا تھا، تو اس وقت اعمال نامہ نیکیوں سے بھرا

ہوا تھا اور جب واپس جا رہا ہے، تو نہ صرف یہ کہ خالی ہاتھ ہے، بلکہ گناہوں کا بوجھ اپنے ساتھ لے جا رہا ہے، حقیقت میں مفلس یہ ہے، بہرحال حسد کے ذریعہ اس طرح نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں۔ (ترمذی ابواب صفة القیامة باب ماجاء فی شان الحساب)

اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے کسی شخص کو آئینے کی طرح ایک دل عطا فرما دے، جس میں نہ حسد ہو، نہ بغض ہو، نہ غیبت ہو، نہ کینہ ہو، تو اس صورت میں اگرچہ اس کے نامہ اعمال میں بہت زیادہ نوافل اور بہت زیادہ ذکر و اذکار اور تلاوت نہ بھی ہو، لیکن اس کا دل آئینہ ہو، تو اللہ تعالیٰ اس شخص کا درجہ اتنا بلند فرماتے ہیں جس کی کوئی انتہا نہیں۔

## حسد کینہ نہ رکھنے پر جنت کی بشارت:

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک مرتبہ ہم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مسجد نبوی میں بیٹھے ہوئے تھے، آپ نے فرمایا کہ ابھی جو شخص مسجد میں اس طرف سے داخل ہوگا وہ جنتی ہے، ہم نے اس طرف کو نگاہ اٹھائی، تو تھوڑی دیر میں ایک صاحب مسجد نبوی میں اس طرح داخل ہوئے کہ ان کے چہرے سے وضو کا پانی ٹپک رہا تھا اور بائیں ہاتھ میں جوتے اٹھائے ہوئے تھے، ہمیں ان پر رشک آیا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جنتی ہونے بشارت دی ہے، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب مجلس ختم ہوگئی، تو میرے دل میں خیال آیا کہ میں ان کو قریب سے جا کر دیکھوں، کہ ان کا کون سا عمل ایسا ہے جس کی بنیاد پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنے اہتمام سے ان کے جنتی ہونے کی بشارت دی ہے؟ چنانچہ جب وہ اپنے گھر جانے لگے، تو میں بھی ان کے پیچھے پیچھے ساتھ چلا گیا اور راستے میں ان سے کہا کہ میں دو تین روز آپ کے گھر میں گزارنا چاہتا ہوں، انہوں نے اجازت دیدی اور میں ان کے گھر چلا گیا، جب رات ہوئی اور بستر پر لیٹا، تو ساری رات میں بستر پر لیٹ کر جاگتا رہا، سویا نہیں، تاکہ میں یہ دیکھوں کہ رات کے وقت وہ اٹھ کر کیا عمل کرتے ہیں، لیکن ساری رات گزر گئی، وہ اٹھے ہی نہیں، پڑے سوتے رہے، تہجد کی نماز بھی نہ پڑی اور فجر کے وقت اٹھے، اس کے بعد میں نے دن بھی ان کے پاس گزارا، تو دیکھا کہ پورے دن میں بھی انہوں نے کوئی خاص عمل نہیں کیا (نہ نوافل، نہ ذکر اذکار، نہ تسبیح، نہ تلاوت) بس جب

نماز کا وقت آتا، تو مسجد میں جا کر نماز پڑھ لیتے، جب دو تین روز میں نے وہاں رہ کر دیکھ لیا کہ یہ تو کوئی خاص عمل ہی نہیں کرتے تو میں نے ان سے عرض کیا کہ اصل میں بات یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے جنتی ہونے کی بشارت دی ہے، تو میں آپ کا وہ عمل دیکھنے کے لیے آیا تھا کہ آپ وہ کونسا عمل کرتے ہیں، جس کی وجہ سے اللہ تعالی نے آپ کو یہ مقام عطا فرمایا؟ لیکن میں نے دو تین دن آپ کے پاس رہ کر دیکھ لیا کہ آپ کوئی خاص عمل نہیں کرتے، صرف فرائض و واجبات ادا کرتے ہیں اور معمول کے مطابق زندگی گزارتے ہیں، انہوں نے جواب دیا کہ اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے لیے یہ بشارت دی ہے، تو یہ میرے لیے بڑی نعمت ہے اور مجھ سے کوئی عمل تو ہوتا نہیں اور نہ میں نوافل زیادہ پڑھتا ہوں، لیکن ایک بات ہے، وہ یہ کہ کسی شخص سے حسد اور بغض کا میل کبھی میرے دل میں نہیں آیا، شاید اس بناء پر اللہ تعالی نے مجھے اس بشارت کا مصداق بنا دیا، بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ صاحب حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ تعالی عنہ تھے، جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔

## حسد کا دوسرا علاج:

بہر حال آپ نے دیکھا کہ ان کے اعمال میں بہت زیادہ نوافل اور ذکر و اذکار تو نہیں، لیکن دل حسد اور بغض سے پاک ہے، دوسرے سے حسد اور بغض سے اپنے دل کو آئینے کی طرح پاک و صاف رکھا ہوا ہے، تو حسد کا دوسرا علاج یہ ہے کہ آدمی یہ سوچے میں جس شخص سے حسد کر رہا ہوں، اس حسد کے نتیجے میں اس کا تو فائدہ ہے اور میرا نقصان ہے، اس تصور سے اس حسد بیماری میں کمی آتی ہے۔

## حسد کا تیسرا علاج:

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ حسد کی بنیاد ہے حب دنیا اور حب جاہ، یعنی دنیا کی محبت اور جاہ کی محبت، اس لیے حسد کا تیسرا علاج یہ ہے کہ آدمی اپنے دل سے دنیا اور جاہ کی محبت نکالنے کی فکر کرے، اس لیے کہ تمام بیماریوں کی جڑ دنیا کی محبت ہے اور اس دنیا کی محبت کو دل سے نکالنے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی یہ سوچے کہ دنیا کتنے دن کی ہے؟ کسی بھی وقت آنکھ بند ہو جائے گی، انسان کے لیے نجات کا کوئی راستہ نہیں ہوگا، دنیا کی لذتیں،

دنیا کی نعمتیں، اس کی دولتیں، اس کی شہرت، اس کی عزت اور اس کی ناپائیداری پر انسان غور کرے اور یہ سوچے کہ کسی بھی وقت آنکھ بند ہو جائے گی، تو سارا قصہ ختم ہو جائے گا، اس کے بعد پھر انسان کے لیے نجات کا کوئی راستہ نہیں ہوگا، بہرحال یہ تین چیزیں ہیں، جن کو سوچنے سے اور استحضار کرنے سے اس بیماری میں کمی آتی ہے۔

## حسد کے درجات:

ایک بات اور سمجھ لیں اس کا سمجھنا بھی بہت ضروری ہے کہ وہ یہ کہ حسد کی برائیاں سننے کے بعد بعض اوقات دل میں یہ خیال آتا ہے کہ یہ بیماری تو ایسی ہے جو بعض اوقات غیر اختیاری طور پر پیدا ہو جاتی ہے، خاص طور پر اپنے ہم جولیوں اور اپنے ہم عمروں اور ہم مرتبہ اور ہم پیشہ لوگوں میں سے کسی کو آگے بڑھتا ہوا اور ترقی کرتا ہوا دیکھا، تو دل میں یہ خیال آیا کہ اچھا تو ہم سے آگے بڑھ گیا اور پھر دل میں اس کی طرف سے غیر اختیاری طور پر کدورت اور میل آ گیا، اب نہ تو اس کا قصد کیا اور نہ ارادہ کیا تھا اور نہ اپنے اختیار سے یہ خیال دل میں لائے تھے، لیکن دل میں غیر اختیاری طور پر خیال آ گیا، اس سے کیسے بچے؟ بچنے کا کیا طریقہ ہے؟

خوب سمجھ لیں کہ حسد کا ایک درجہ تو یہ ہے کہ آدمی کے دل میں یہ خیال آئے کہ فلاں شخص کو جو نعمت حاصل ہے، اس سے وہ نعمت چھن جائے، لیکن اس خیال کے ساتھ ساتھ حسد کرنے والا اپنے قول اور فعل سے اس کی بدخواہی بھی چاہتا ہے، مثلاً مجلس میں بیٹھ کر اس کی برائیاں بیان کر رہا ہے اور اس کی غیبت کر رہا ہے، تاکہ اس نعمت کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں جو وقعت پیدا ہو گئی ہے، وہ ختم ہو جائے، یا اس کی کوشش کر رہا ہے کہ اس سے وہ نعمت چھن جائے، یہ حسد تو بالکل حرام ہے، اس کے حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

لیکن بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ دوسرے کو نعمت حاصل ہونے کی وجہ سے اس کا دل دکھا اور یہ خیال آیا کہ اس کو یہ نعمت کیوں ملی؟ لیکن وہ شخص اپنے قول سے یا اپنے فعل سے اپنے انداز اور ادا سے اس حسد کو دوسرے پر ظاہر نہیں کرتا، نہ اسکی برائی کرتا ہے، نہ اس کی غیبت کرتا ہے، نہ اس کی بدخواہی کرتا ہے اور نہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ اس سے یہ نعمت چھن جائے، بس دل میں ایک دکھ اور کڑھن ہے کہ اس کو یہ نعمت کیوں ملی؟ حقیقت میں تو یہ بھی حسد ہے اور گناہ

ہے، لیکن اس کا علاج آسان ہے اور ذرا سی توجہ سے اس گناہ سے بچ سکتا ہے۔

## دل کی جلن اور کڑھن والے حسد کا علاج:

اس کا علاج یہ ہے کہ جب بھی دل میں کڑھن اور جلن پیدا ہو، تو ساتھ ہی دل میں اس بات کا تصور کرے کہ یہ حسد کتنی بری چیز ہے اور میرے دل میں جو کڑھن پیدا ہو رہی ہے، یہ بہت بری بات ہے اور جب اس قسم کا خیال دل میں پیدا ہو، فوراً استغفار کرے اور یہ سوچے کہ مجھے نفس اور شیطان بہکا رہے ہیں، یہ میرے لیے عیب کی بات ہے، لہذا جب حسد کے خیال کے ساتھ ساتھ اس حسد کی برائی بھی دل میں لے آیا، تو اس حسد کا گناہ ختم ہو جائے گا۔

## دل کی جلن اور کڑھن والا اس کے حق میں دعا کرے:

بزرگوں نے لکھا ہے کہ جب دل میں دوسرے کی نعمت دیکھ کر حسد اور جلن پیدا ہو، تو اس کا ایک علاج یہ بھی ہے کہ تنہائی میں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ سے اس کے حق میں دعا کرے کہ یا اللہ یہ نعمت جو آپ نے اس کو عطا فرمائی ہے اور زیادہ عطا فرما اور جس وقت وہ یہ دعا کرے گا، اس وقت دل پر آرے چلیں گے اور دعا کرنا دل پر بہت شاق اور گراں گزرے گا، لیکن زبردستی یہ دعا کرے کہ یا اللہ اس کو اور ترقی عطا فرما، اس نعمت میں اور برکت عطا فرما اور ساتھ ساتھ اپنے حق میں بھی دعا کرے کہ یا اللہ میرے دل میں اس کی نعمت کی وجہ سے جو کڑھن اور جلن پیدا ہو رہی ہے، اپنے فضل اور رحمت سے اس کو ختم فرما

خلاصہ یہ ہے کہ یہ تین کام کرے:

۱)...... ایک یہ کہ اپنے دل میں جو کڑھن پیدا ہو رہی ہے اور اس کی نعمت کے زوال کا جو خیال آ رہا ہے اس کو دل سے برا سمجھے۔

۲)...... دوسرا یہ کہ اس کے حق میں دعا خیر کرے۔

۳)...... تیسرے اپنے حق میں دعا کرے کہ یا اللہ میرے دل سے اس کو ختم فرما۔

ان تین کاموں کے کرنے کے بعد بھی اگر دل میں غیر اختیاری طور پر جو خیال آ رہا ہے، تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس سے مواخذہ نہیں ہوگا، (انشاء اللہ) لیکن اگر دل میں خیال تو آ رہا ہے، لیکن اس خیال کو برا نہیں سمجھتا ہے اور نہ اس کے تدارک کی فکر

کرتا ہے، نہ اس کی تلافی کرتا ہے، تو اس صورت میں وہ گناہ سے خالی نہیں۔

## حسد حقوق اللہ بھی ہے اور حقوق العباد بھی:

یہ مسئلہ میں بار بار بتا چکا ہوں کہ جن گناہوں کا تعلق حقوق اللہ سے ہے، ان گناہوں کا علاج تو آسان ہے کہ انسان توبہ استغفار کر لے، وہ گناہ معاف ہو جائے گا، لیکن جن کوتاہیوں اور گناہوں کا تعلق حقوق العباد سے ہے، وہ صرف توبہ کرنے سے معاف نہیں ہوتے، جب تک صاحب حق سے معاف نہ کرایا جائے اور وہ معاف نہ کرے یا جب تک اس کا حق ادا نہ کر دیا جائے، اس وقت تک معاف نہیں ہوگا۔

حسد کا معاملہ یہ ہے کہ اگر آپ اس کو اپنی زبان پر لے آئے ہیں اور اس حسد کے نتیجے میں آپ نے اس کی غیبت کر لی، یا اس کی بدخواہی کے لیے کوئی عملی کوشش کر لی، تو اس صورت میں اس حسد کا تعلق حقوق العباد سے ہو جائے گا، لہٰذا جب تک وہ شخص معاف نہیں کرے گا، یہ گناہ معاف نہیں ہوگا، لیکن اگر حسد دل ہی دل میں رہا، زبان سے کوئی لفظ اس کی برائی اور غیبت کا نہیں نکالا اور اس کی نعمت کے زائل کرنے کے لیے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا، تو اس صورت میں اس حسد کا تعلق حقوق اللہ سے ہے، لہٰذا یہ گناہ اس شخص سے معافی مانگے بغیر، صرف توبہ سے معاف ہو جائے گا، لہٰذا جب تک حسد دل ہی دل میں ہے ، تو آدمی سوچ لے کہ ابھی معاملہ قابو میں ہے، آسانی کے ساتھ اس کا تدارک بھی ہو سکتا ہے اور معافی بھی آسان ہے، ورنہ اگر یہ آگے بڑھ گیا، تو یہ حقوق العباد میں داخل ہو جائے گا، پھر اس کی معافی کا کوئی راستہ نہیں رہے گا۔

## رشک جائز تو ہے مگر ذریعہ حسد ہے:

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اگر دوسرے کی نعمت کے چھن جانے کی خواہش دل میں نہ ہو، بلکہ صرف یہ خیال ہو کہ یہ نعمت مجھے بھی مل جائے، اگرچہ یہ حسد تو نہیں ہے، بلکہ یہ رشک ہے، لیکن اس کا بہت زیادہ استحضار کرنا اور سوچنا، بالآخر حسد تک پہنچا دیتا ہے، لہٰذا اگر دنیا کے مال و دولت کی وجہ سے کسی پر رشک آ گیا، تو یہ بھی کوئی اچھی بات نہیں ہے، اس لیے کہ یہی رشک بعض اوقات دل میں مال و دولت کی حرص پیدا کر دیتا ہے اور بعض

اوقات یہ رشک آگے چل کر حسد بن جاتا ہے۔

## دینداری کی وجہ سے رشک پسندیدہ ہے:

لیکن اگر دینداری کی وجہ سے رشک پیدا ہو رہا ہے، تو یہ اچھی بات ہے اس لیے کہ حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

**لَا حَسَدَ اِلَّا فِیْ اثْنَتَیْنِ ، رَجُلٌ اٰتَاهُ اللّٰهُ مَالًا ، فَسَلَّطَ عَلٰی هَلَكَتِهٖ فِی الْحَقِّ ، وَرَجُلٌ اٰتَاهُ اللّٰهُ الْحِكْمَةَ ، فَهُوَ یَقْضِیْ بِهَا وَیُعَلِّمُهَا.**

(صحیح بخاری کتاب العلم ۔باب الا غتباط فی العلم والحکمۃ)

اس حدیث میں حسد سے مراد رشک ہے، یعنی حقیقت میں رشک کے قابل صرف دو انسان ہیں:

۱)...... ایک وہ انسان قابل رشک ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہے اور وہ اس مال کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کر رہا ہے اور اس کو اپنے لیے ذخیرہ آخرت بنا رہا ہے، یہ شخص قابل رشک ہے۔

۲)...... دوسرا وہ شخص ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا اور اس علم کے ذریعہ سے لوگوں کو نفع پہنچا رہا ہے، اپنی تقریر اور تحریر سے لوگوں کو دین کی بات پہنچا رہا ہے، یہ شخص بھی قابل رشک ہے کہ وہ خود بھی نیک عمل کر رہا ہے اور دوسروں کو نیکی کی ترغیب دے رہا ہے اور جو لوگ اس کی ترغیب اور تعلیم کے نتیجے میں دین پر عمل پیرا ہوں گے ان کا ثواب بھی اس کے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا۔

لہٰذا اگر دین کی وجہ سے کوئی شخص رشک کر رہا ہے کہ فلاں شخص دینداری میں مجھ سے آگے بڑھا ہوا ہے، یہ رشک پسندیدہ اور بڑی اچھی بات ہے۔

## دنیاداری کی وجہ سے رشک پسندیدہ نہیں:

لیکن دنیا کے مال و دولت کی وجہ سے دوسرے پر رشک کرنا، فلاں کے پاس مال زیادہ ہے، فلاں کے پاس دولت زیادہ ہے، فلاں کی شہرت زیادہ ہے، فلاں کی عزت زیادہ ہے، ان دنیاوی چیزوں پر بھی رشک کرنا اچھی بات نہیں ہے، اس لیے کہ ان چیزوں میں زیادہ رشک کرنے کے نتیجے میں بالآخر حرص پیدا ہوگی اور اس کے بعد حسد پیدا ہونے کا

اندیشہ ہے، اس لیے اس رشک کی بھی زیادہ ہمت افزائی نہیں کرنی چاہیے، بلکہ جب کبھی ایسا خیال آئے، تو اس وقت یہ آدمی یہ سوچے کہ اگر فلاں نعمت اس کو حاصل ہے، تو اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی بہت سی نعمتیں عطا فرمائی ہیں، جو اس کے پاس نہیں ہیں اور جو نعمتیں مجھے نہیں ملیں، تو میری بھلائی اور مصلحت بھی اس میں ہے کہ مجھے وہ نعمت نہ ملے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی مصلحت کی وجہ سے مجھے وہ نعمت نہیں عطا فرمائی، اگر وہ نعمت مجھے حاصل ہو جاتی، تو اللہ جانے کس مصیبت کے اندر مبتلا ہو جاتا؟ بہرحال ان باتوں کو سوچے اور اس رشک کے خیال کو بھی اپنے دل سے نکالنے کی کوشش کرے، یہ چند باتیں حسد کے بارے میں عرض کر دیں۔

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اس کی حقیقت سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

## شیخ اور مربی کی ضرورت:

لیکن جیسا کہ بار بار عرض کرتا رہتا ہوں کہ باطن کی جتنی بیماریاں ہیں، باطن کے جتنے برے اخلاق اور گناہ ہیں، ان سے بچنے کا اصل علاج یہ ہے کہ کسی معالج سے رجوع کیا جائے، اگر کوئی ڈاکٹر ایک مرتبہ مریض کو اپنے پاس بٹھا کر خوب اچھی طرح سے یہ بتا دے کہ بخار کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے اسباب کیا ہوتے ہیں؟ اس کا علاج اور دوائیں کیا کیا ہیں؟ لیکن جب اس کو بخار آئے گا، تو کیا وہ شخص ڈاکٹر کی بتائی ہوئی باتوں کو یاد کر کے اس کے مطابق اپنا علاج خود کرنا شروع کر دے گا؟ ظاہر ہے کہ وہ ایسا نہیں کرے گا، اس لیے کہ حالات مختلف ہوتے ہیں اور بعض اوقات دواؤں کو اپنے اوپر منطبق کرنے میں غلطی بھی ہو جاتی ہے، اس لیے کسی ڈاکٹر یا معالج کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

اسی طرح یہ باطن کی بیماریاں ہیں، مثلاً ریاکاری ہے، حسد ہے، بغض ہے، تکبر ہے، آپ نے اس کی حقیقت تو سن لی، لیکن جب کوئی شخص ان میں سے کسی بیماری میں مبتلا ہو، تو اس کو چاہیے کہ وہ ایسے معالج کی طرف رجوع کرے، جو اپنا علاج کرا چکا ہو اور دوسروں

کا علاج کرنے میں ماہر ہو اور اس کو بتائے کہ میرے دل میں یہ خیالات اور وساوس پیدا ہوتے ہیں، اس کا کیا حل ہے؟ اور کیا علاج ہے؟ پھر وہ صحیح علاج تجویز کرتا ہے، بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے آپ کو تندرست سمجھتا ہے، مگر حقیقت میں وہ بیمار ہوتا ہے اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اس کے لئے کوئی علاج مفید ہوتا ہے، مگر وہ دوسرے علاج میں لگا ہوا ہے، اس لیے بنیادی بات یہ ہے کہ کسی شیخ سے رجوع کر کے اس کو اپنے حالات بتائے جائیں اور پھر اس کے بتائے ہوئے علاج کے مطابق عمل کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

(اصلاحی خطبات: جلد پنجم)

روح کی بیماریاں اور ان کا علاج

# باب ...... (۱۱)

## سستی کا علاج

# سستی کا علاج

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿ وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴾

آمَنْتُ بِاللّٰہِ صَدَقَ اللّٰہُ مَوْلَانَا الْعَظِیْمُ.

## سستی کا مقابلہ ’’ہمت‘‘ سے کریں:

میں پچھلے دنوں رنگون اور برما کے بعض دوسرے شہروں کے سفر پر تھا، مسلسل دس بارہ روز سفر میں گزرے، متواتر بیانات کا سلسلہ رہا، ایک دن میں بعض اوقات چار چار، پانچ پانچ بیانات ہوئے، اس لیے آواز بیٹھی ہوئی ہے اور طبیعت میں تکان بھی ہے اور اتفاق سے کل دوبارہ حرمین شریفین کا سفر درپیش ہے، اس لیے آج طبیعت سستی کر رہی تھی اور یہ خیال ہو رہا تھا کہ جب پچھلے جمعہ ناغہ ہو گیا تھا، تو ایک جمعہ اور سہی، لیکن اپنے حضرت ڈاکٹر صاحب قدس اللہ سرہ کی ایک بات یاد آ گئی، وہ یہ ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ

’’جب کسی معمول کے پورا کرنے میں سستی ہو رہی ہو، تو وہی موقع انسان کے امتحان کا ہے، اب ایک صورت تو یہ ہے کہ اس سستی کے آگے ہتھیار ڈال دے اور نفس کی بات مان لے، کل کو نفس دوسرے معمول میں ہتھیار ڈلوائے گا اور پھر آہستہ آہستہ طبیعت اس سستی کے تابع اور اس کی عادی ہو جائے گی اور دوسری صورت یہ ہے کہ انسان اس سستی کا ہمت سے مقابلہ کر کے اس معمول کو کر گزرے، محنت اور مشقت اور مقابلہ کرنے کی برکت سے اللہ تعالیٰ آئندہ بھی معمولات کے پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائیں گے۔‘‘

## سستی دور کرنے سے متعلق حضرت تھانوی کا سنہری ملفوظ:

اور ایسے موقع ہمارے حضرت والا، حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ سنایا کرتے تھے، حقیقت میں یہ ملفوظ یاد رکھنے، بلکہ دل پر نقش کرنے کے قابل ہے، حضرت تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ

"وہ ذرا سی بات جو حاصل ہے تصوف کا، یہ ہے کہ جس وقت کسی طاعت کی ادائیگی میں سستی ہو، تو اس سستی کا مقابلہ کرکے اس اطاعت کو کرے اور جس وقت کسی گناہ کا داعیہ (تقاضا) پیدا ہو، تو اس داعیے (تقاضے) کا مقابلہ کرکے اس گناہ سے بچے، جب یہ بات حاصل ہو جائے، تو پھر کسی اور چیز کی ضرورت نہیں، اسی سے تعلق مع اللہ پیدا ہوتا ہے، اسی سے مضبوط ہوتا ہے اور اسی سے ترقی کرتا ہے۔"

بہر حال سستی دور کرنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے، یعنی اس سستی کا ہمت سے مقابلہ کرنا، لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شیخ کوئی نسخہ گھول کر پلا دے گا، تو ساری سستی دور ہو جائے گی اور سب کام ہوتے چلے جائیں گے، یاد رکھو کہ سستی کا مقابلہ ہمت سے ہی ہوگا، اس کا اور کوئی علاج نہیں۔

## نفس کو بہلا پھسلا کر اس سے کام لو:

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ نفس کو ذرا بہلا پھسلا کر اس سے کام لیا کرو، پھر اپنا ایک واقعہ سنایا کرتے تھے کہ ایک دن جب تہجد کے وقت آنکھ کھلی، تو طبیعت میں بڑی سستی اور کسل تھا، دل میں خیال آیا کہ آج تو طبیعت بھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہے، کسل بھی ہے اور عمر بھی تمہاری زیادہ ہے اور تہجد کی نماز کوئی فرض و واجب بھی نہیں ہے، پڑے سوتے رہو، اگر آج تہجد کی نماز نہ پڑھی، تو کیا ہو جائے گا؟

حضرت والا فرماتے ہیں کہ میں نے کہا کہ بات تو ٹھیک ہے، کہ تہجد کی نماز فرض یا واجب بھی نہیں ہے اور دوسری طرف طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے، لیکن یہ وقت تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبولیت کا وقت ہے، حدیث شریف میں ہے کہ جب رات کا ایک تہائی حصہ گزر جاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمتیں اہل زمین پر متوجہ ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف

سے منادی پکارتا رہتا ہے کہ ہے کوئی مغفرت مانگنے والا کہ اس کی مغفرت کی جائے؟ لہٰذا ایسے مبارک وقت کو بے کار گزارنا بھی ٹھیک نہیں، پھر اپنے نفس سے مخاطب ہو کر کہا کہ اچھا ایسا کرو کہ نماز مت پڑھو، لیکن اٹھ کر بستر پر ہی بیٹھ جاؤ اور تھوڑی سی دعا کرو، دعا کر کے پھر دوبارہ سو جانا۔

چنانچہ میں فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا اور دعا کرنی شروع کر دی، دعا کرتے کرتے پھر نفس سے کہا کہ میاں جب تم اٹھ کر بیٹھ گئے، تو تمہاری نیند تو چلی گئی، اب ایسا کرو کہ غسل خانے تک چلے جاؤ اور استنجاء وغیرہ سے فارغ ہو جاؤ، پھر آرام سے آ کر لیٹ جانا، چنانچہ میں غسل خانے میں پہنچ گیا اور استنجاء وغیرہ سے فارغ ہو گیا، تو سوچا کہ چلو وضو بھی کر لو، اس لیے وضو کر کے دعا کرنے میں قبولیت کی توقع زیادہ ہے، چنانچہ وضو کر لیا اور واپس آ کر بستر پر بیٹھ گیا اور دعا شروع کر دی۔ پھر نفس سے کہا کہ بستر پر بیٹھ گیا، دعا ہو رہی ہے، دعا کرنے کی جو تمہاری جگہ ہے جائے نماز، وہاں جا کر دعا کر لو، یہ کہہ کر نفس کو جائے نماز تک کھینچ کر لے گیا اور جب جائے نماز پر پہنچا، تو جلدی سے دو رکعت تہجد کی نیت باندھ لی۔

پھر فرمایا کہ اس طرح نفس کو تھوڑا سا بہلاوا دے کر بھی لانا پڑتا ہے اور جس طرح یہ نفس تمہارے ساتھ نیک کام کرنے کو ٹالنے کا معاملہ کرتا ہے، اسی طرح تم بھی اس کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کیا کرو اور اس کو کھینچ کھینچ کر لے جایا کرو، انشاء اللہ اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ پھر اس عمل کی توفیق عطا فرما دیں گے۔

## دنیا کا صدر کیا؟ احکم الحاکمین کے بلاوے کا تصور کرو:

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر تم نے اپنا یہ معمول بنا رکھا ہے کہ فلاں وقت میں تلاوت کروں گا، یا فلاں وقت میں نفل نماز پڑھوں گا، لیکن جب وہ وقت آیا، تو طبیعت میں سستی ہو رہی ہے اور اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا ہے، تو ایسے وقت میں اپنے نفس کی ذرا تربیت کیا کرو اور اس نفس سے کہو کہ اچھا اس وقت تو تمہیں سستی ہو رہی ہے اور بستر سے اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا ہے، لیکن یہ بتاؤ کہ اگر اس وقت صدر مملکت کی طرف سے یہ پیغام آ جائے کہ ہم تمہیں بہت بڑا انعام یا بہت بڑا منصب یا عہدہ دینا چاہتے ہیں، اس لیے تم اس وقت فوراً ہمارے پاس آ جاؤ، بتاؤ کیا اس وقت بھی

سستی رہے گی؟ اور کیا تم پیغام لانے والے کو یہ جواب دو گے کہ میں اس وقت نہیں آ سکتا، کیونکہ اس وقت تو مجھے نیند آ رہی ہے، کوئی بھی انسان جس میں ذرا بھی عقل و ہوش ہے، صدر مملکت کا یہ پیغام سن کر اس کی ساری سستی، کاہلی اور نیند دور ہو جائے گی اور خوشی کے مارے فوراً انعام حاصل کرنے کے لیے بھاگ کھڑا ہو گا۔

لہٰذا اگر اس وقت یہ نفس اس انعام کے حصول کے لیے بھاگ پڑے گا، تو اس سے معلوم ہوا کہ حقیقت میں اٹھنے سے کوئی عذر نہیں تھا، اگر حقیقت میں اٹھنے سے کوئی عذر ہوتا تو صدر مملکت کا پیغام سنکر نہ اٹھتے، بلکہ بستر پر پڑے رہتے، اس کے بعد یہ سوچو کہ دنیا کا ایک سربراہ مملکت جو بالکل عاجز، انتہائی عاجز اور انتہائی عاجز ہے، وہ اگر تمہیں ایک انعام یا منصب دینے کے لیے بلا رہا ہے، تو تم اس کے لیے اتنا بھاگ سکتے ہو، لیکن وہ احکم الحاکمین جس کے قبضۂ قدرت میں پوری کائنات ہے، دینے والا وہی ہے، چھیننے والا وہی ہے، اس کی طرف سے بلاوا آ رہا ہے، تو اس کے دربار میں حاضر ہونے میں سستی کر رہے ہو؟ ان باتوں کا تصور کرنے سے انشاء اللہ اس کام کی ہمت ہو جائے گی اور سستی دور ہو جائے گی۔



## کوئی کام بھی کل پر مت ٹالو:

بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ ایک عمل کا دل میں خیال پیدا ہوا کہ یہ نیک کام کرنا چاہیے، لیکن پھر نفس اس کو یہ بہکاتا ہے کہ یہ کام تو اچھا ہے، البتہ کل سے یہ کام شروع کریں گے، یاد رکھو یہ نفس کا کید ہے، اس لیے کہ وہ کل پھر نہیں آتی، جو کام کرنا ہے، وہ آج بلکہ ابھی شروع کر دو، کیا پتہ کہ کل آئے یا نہ آئے؟ کیا معلوم کہ کل کو موقع ملے یا نہ ملے؟

کیا پتہ کل کو یہ داعیہ موجود رہے یا نہ رہے؟ کیا پتہ کل کو حالات سازگار رہیں یا نہ رہیں؟ اور کیا پتہ کل کو زندگی رہے یا نہ رہے؟

اس لیے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَسَارِعُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ﴾

(سورۃ آل عمران۔۱۳۳)

یعنی اپنے پروردگار کی مغفرت کی طرف جلدی دوڑو، دیر نہ کرو اور اس جنت کی طرف

دوڑو، جس کی چوڑائی سارے آسمان اور زمین کے برابر ہے۔

بہر حال یہ عرض کر رہا تھا کہ آج مجھے سستی ہو رہی تھی، مگر اپنے حضرت والا کی یہ باتیں یاد آ گئیں، جس کی وجہ سے آنے کی ہمت ہو گئی اور چلا آیا۔

## اپنے فائدے کے لیے حاضر ہوتا ہوں

دوسرے یہ کہ یہاں درحقیقت میں اپنے فائدے کے لیے حاضر ہوتا ہوں اور میں تو یہ سوچتا ہوں کہ اللہ کے نیک بندے، نیک طلب لے کر دین کی باتیں سننے کے لیے یہاں جمع ہوتے ہیں، مجھے بھی ان کی برکتیں حاصل ہو جاتی ہیں، بات یہ ہے کہ جب اللہ کے بندے دین کی خاطر کسی جگہ ہوتے ہیں تو آپس میں ایک دوسرے کی برکتوں کا انعکاس ہوتا ہے، اس لیے میں تو ہمیشہ اس نیت سے آتا ہوں کہ نیک لوگوں کی برکتیں حاصل کروں۔



## وہ لمحات زندگی کس کام کے؟

تیسرے یہ کہ حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ کی ایک بات اور یاد آ گئی، یہ بات بھی میں نے حضرت والا ہی سے سنی، فرمایا کہ جب حضرت والا مرض الوفات میں بیمار اور صاحب فراش تھے اور ڈاکٹروں نے آپ کو ملاقات اور بات چیت سے منع کر رکھا تھا، ایک دن آپ بستر پر آنکھیں بند کیے لیٹے تھے، لیٹے لیٹے اچانک آنکھ کھولی اور فرمایا کہ مولوی محمد شفیع صاحب کہاں ہیں؟ ان کو بلاؤ۔ مولوی محمد شفیع صاحب سے مراد میرے والد ماجد ہیں، حضرت والا نے میرے والد صاحب کو احکام القرآن عربی زبان میں تالیف کرنے پر لگا رکھا تھا، چنانچہ جب والد صاحب تشریف لائے، تو ان سے فرمایا کہ آپ احکام القرآن لکھ رہے ہیں، مجھے ابھی خیال آیا کہ قرآن کریم کی فلاں آیت سے فلاں مسئلہ نکلتا ہے، یہ مسئلہ میں نے اس سے پہلے کہیں نہیں دیکھا، جب آپ اس آیت پر پہنچیں، تو اس مسئلہ کو بھی لکھ لیجئے گا، یہ کہہ کر پھر آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے، اب دیکھئے کہ مرض الوفات میں لیٹے ہیں، مگر دل و دماغ میں قرآن کریم کی آیات اور ان کی تفسیر گھوم رہی ہے، تھوڑی دیر کے بعد پھر آنکھ کھولی اور فرمایا کہ فلاں صاحب کو بلاؤ، جب وہ صاحب آ گئے، تو ان سے متعلق کچھ کام بتا دیا، جب بار بار آپ نے ایسا کیا، تو مولانا شبیر علی صاحب جو حضرت کی

خانقاہ کے ناظم تھے اور حضرت والا سے بے تکلف بھی تھے، فرمایا کہ حضرت ڈاکٹروں اور حکیموں نے بات چیت سے منع کر رکھا ہے، مگر آپ بار بار لوگوں کو بلا کر ان سے بات کرتے ہیں، اللہ کے لیے آپ ہماری جان پر تو رحم کریں، ان کے جواب میں حضرت والا نے فرمایا کہ:

''بات تو تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن میں یہ سوچتا ہوں کہ وہ لمحات زندگی کس کام کے جو کسی کی خدمت میں صرف نہ ہوں؟ اگر کسی خدمت کے اندر یہ عمر گزر جائے، تو اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔''

## دنیا کے مناصب اور عہدے اختیاری نہیں:

یہ ''خادمیت'' یہ بڑی عجیب ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہمارے دلوں میں پیدا فرما دے، ہر ایک کے خادم بنو، اپنے اندر خدمت کا جذبہ پیدا کرو، حضرت ڈاکٹر صاحب قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ دنیا کے تمام عہدوں کا حال یہ ہے کہ اگر انسان ان کو حاصل کرنا چاہے، تو اس کو حاصل کرنا اختیار میں نہیں ہوتا، مثلاً دل چاہ رہا ہے کہ میں صدر مملکت بن جاؤں، لیکن صدر مملکت بننا اپنے اختیار میں نہیں، یا دل چاہ رہا ہے کہ وزیر اعظم بن جاؤں، لیکن وزیر اعظم بننا اختیار میں نہیں، یا دل چاہ رہا ہے کہ اسمبلی کا ممبر بن جاؤں، وہ بھی اختیار میں نہیں، یا کہیں افسر بننا چاہتا ہے، ملازمت حاصل کرنا چاہتا ہے، تو اب اس کے لیے درخواست دو، انٹرویو دو، کتنے پاپڑ بیلو اور تمام کوششیں کرنے کے بعد جب وہ منصب حاصل ہوگیا، تو اب لوگ حسد کرنے لگے کہ یہ ہم سے آگے بڑھ گیا اور ہم پیچھے رہ گئے، اب اس کے خلاف سازشیں ہونے لگیں کہ کسی طرح یہ منصب اور یہ عہدہ اس سے چھین لیا جائے۔ چنانچہ اچھا خاصا وزیر اعظم بنا ہوا تھا، اب ختم ہوگیا، عہدہ چھن گیا، صدر بنا ہوا تھا، ختم ہوگیا، تو دنیا کے سارے عہدوں اور منصبوں کا یہی حال ہے کہ نہ تو ان کے حصول اپنے اختیار میں ہے اور اگر حاصل ہو جائے، تو اس پر برقرار رہنا اپنے اختیار میں نہیں، پھر لوگ اس پر حسد بھی کرتے ہیں۔

فرمایا کرتے تھے کہ میں تمہیں ایک ایسا منفرد منصب بتاتا ہوں، جس کا حاصل کرنا بھی اپنے اختیار میں ہے اور اگر تم وہ منصب حاصل کرلو، تو کوئی شخص تمہارے اوپر حسد بھی نہیں

کرے گا اور نہ کوئی تم سے لڑے گا اور نہ کوئی تمہیں اس سے معزول کر سکتا ہے، وہ ہے خادم کا منصب، تم خادم بن جاؤ، یہ منصب اپنے اختیار میں ہے، اس کے لیے درخواست دینے کی بھی ضرورت نہیں، نہ ووٹ ڈالنے کی ضرورت ہے، نہ الیکشن کی ضرورت ہے، اگر یہ منصب حاصل ہو جائے، تو اس پر دوسروں کو حسد بھی نہیں ہوتا، اس لیے یہ کام ہی خدمت کا کر رہا ہے، تو اب دوسرا شخص اس پر کیا حسد کرے گا؟ اور نہ کوئی شخص تمہیں اس منصب سے معزول کر سکتا ہے، اس لیے فرمایا کہ خام بن جاؤ، کس کے خادم بن جاؤ؟ اپنے گھر والوں کے خادم بن جاؤ، گھر کا جو کام کرو خدمت کی نیت سے کرو، اپنی بیوی کا خادم، اپنے بچوں کا خادم، اپنے دوستوں کا خادم اور جو کوئی ملنے والے آئیں، ان کی بھی خدمت کرو اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی اللہ کے نیک بندوں کی خدمت کرو، جو کام بھی کرو، خدمت کی نیت سے کرو، اگر وعظ کہہ رہے ہو، تو وہ بھی خدمت کے لیے، تصنیف کر رہے ہو وہ بھی خدمت کے لیے، اس خادمیت کے منصب کو حاصل کرو، اس لیے کہ سارے جھگڑے مخدوم بننے میں ہیں، اس لیے حضرت والا خود اپنے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ میں تو اپنے آپ کو خادم سمجھتا ہوں، اپنی بیوی کا بھی خادم، اپنے بچوں کا بھی خادم، اپنے مریدوں کا بھی خادم، اپنے اہل تعلقات کا خادم اور یہ وہ منصب ہے جس میں شیطانی وساوس بھی کم ہوتے ہیں، اس لیے کہ عجب، تکبر، بڑائی وغیرہ ان عہدوں میں پیدا ہوتی ہے، جو دنیاوی اعتبار سے بڑے سمجھے جاتے ہیں، اب خادم کے عہدے میں کیا بڑائی ہے؟ اس لیے شیطانی وساوس بھی نہیں آتے، اس واسطے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

## بزرگوں کی خدمت میں حاضری کا فائدہ:

بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ آج طبیعت میں سستی ہو رہی تھی، لیکن ہمارے حضرت والا کی یہ باتیں یاد آ گئیں اور ہمت ہو گئی اور اللہ والوں سے تعلق قائم کرنے کا یہی فائدہ ہوتا ہے، اب معلوم نہیں کہ یہ باتیں حضرت والا نے کب کہی ہوں گی؟ ہماری طرف سے نہ تو طلب تھی، نہ خواہش تھی، نہ کوئی کوشش تھی، مگر حضرت والا نے زبردستی کچھ باتیں کان میں ڈال دیں اور اب وہ باتیں الحمد للہ وقت پر یاد آ جاتی ہیں اور کام بنا دیتی ہیں۔

## وہ بات تمہاری ہوگئی وقت پر یاد آجائے گی:

حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ مجلس میں جو باتیں ہوتی ہیں، بعض لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ان باتوں کو یاد کرلیں، مگر یہ باتیں یاد نہیں ہوتیں، اس پر اپنا واقعہ سنایا کہ کہ میں بھی حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں جب حاضر ہوتا، تو یہ دل چاہتا ہے کہ حضرت والا کی باتیں لکھ لیا کروں، بعض لوگ لکھ لیا کرتے تھے، مجھ سے تیز لکھا نہیں جاتا تھا، اس لیے میں لکھنے سے رہ جاتا تھا، میں نے ایک دن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ سے عرض کیا کہ حضرت میرا دل چاہتا ہے کہ ملفوظات لکھ لیا کروں، مگر لکھا جاتا نہیں اور یاد رہتے نہیں ہیں، بھول جاتا ہوں، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا کہ لکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ خود صاحب ملفوظ کیوں نہیں بن جاتے؟ حضرت فرماتے ہیں کہ میں تو تھرا گیا کہ میں کہاں صاحب ملفوظ بن سکتا ہوں؟ پھر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بات دراصل یہ ہے کہ جو بات حق ہو اور فہم سلیم پر مبنی ہو، صحیح فکر پر مبنی ہو، جب ایسی بات تمہارے کان میں پڑ گئی اور تمہارے دل نے اس کو قبول کرلیا، وہ بات تمہاری ہو گئی، اب چاہے وہ بات بعینہ انہی لفظوں میں یاد رہے، یا نہ رہے، جب وقت آئے گا، انشاء اللہ اس وقت یاد آجائے گی اور اس پر عمل کی توفیق ہو جائے گی۔

بزرگوں کی خدمت میں جانے اور ان کی باتیں سننے کا یہی فائدہ ہوتا ہے کہ وہ کان میں باتیں ڈالتے رہتے ہیں، ڈالتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ وہ باتیں انسان کی طبیعت میں داخل ہو جاتی ہیں اور پھر وقت پر یاد آجاتی ہیں۔

## بزرگوں سے تعلق کا فائدہ:

میں آج سوچتا ہوں کہ حضرت والد ماجد قدس اللہ سرہ، حضرت ڈاکٹر صاحب اقدس اللہ سرہ اور حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب قدس سرہ ان تینوں بزرگوں سے میرا تعلق رہا ہے، اپنا حال تو تباہ ہی تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے ان بزرگوں کی خدمت میں حاضری کی توفیق عطا فرمادی، یہ ان کا فضل و کرم تھا، اب ساری عمر بھی اس پر شکر ادا کروں، تب بھی ادا نہیں ہوسکتا، یہ بزرگ کچھ باتیں زبردستی کانوں میں ڈال گئے اپنی طرف سے، جن کی

نہ تو طلب تھی اور نہ خواہش، اور اگر میں ان باتوں کو اب نمبر وار لکھنا چاہوں جو ان بزرگوں کی مجلسوں میں سنی تھی، تو فوری طور پر سب کا یاد آنا مشکل ہے، لیکن کسی نہ کسی موقع پر وہ باتیں یاد آ جاتیں ہیں اور بزرگوں سے تعلق کا یہ ہی فائدہ ہوتا ہے اور جس طرح بزرگوں کی خدمت میں حاضری نعمت ہے اور ان کی بات سننا نعمت ہے، اسی طرح ان بزرگوں کے ملفوظات، حالات، سوانح پڑھنا بھی اس کے قائم مقام ہو جاتا ہے، آج یہ حضرات موجود نہیں ہیں، مگر الحمد للہ سب باتیں لکھی ہوئی چھوڑ گئے ہیں، ان کو مطالعہ میں رکھنا چاہیے، یہ باتیں کام آ جاتی ہیں، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمیں ان بزرگوں کا دامن تھامے رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

## عذر اور سستی میں فرق:

بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جب بھی سستی ہو تو اس سستی کا مقابلہ کرنا چاہیے اور معمول کو پورا کرنا چاہیے، دیکھئے عذر اور چیز ہے اور سستی اور چیز ہے، اگر عذر کی وجہ سے معمول چھوٹ جائے، تو پھر کوئی غم نہیں، مثلاً بیماری کی وجہ سے معمول چھوٹ گیا، یا سفر کی وجہ سے معمول چھوٹ گیا، اس میں کوئی حرج نہیں، اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس پر مواخذہ نہیں کیا، بلکہ عذر کی وجہ سے رعایت دی ہے، تو پھر ہم خود کون ہوتے ہیں پابندی کرانے والے؟ اس لیے کسی عذر کی وجہ سے اس کے چھوٹنے پر رنج نہیں کرنا چاہیے۔



## عذر کی وجہ سے معمول چھوٹ جائے تو کوئی حرج نہیں؟

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب قدس اللہ سرہ حضرت تھانوی کی یہ بات نقل فرماتے تھے کہ ایک شخص رمضان میں بیمار ہو گیا اور بیماری کی وجہ سے روزہ چھوٹ گیا، اب اس کو اس بات کا غم ہو رہا ہے کہ رمضان کا روزہ چھوٹ گیا، حضرت فراتے ہیں کہ غم کرنے کی کوئی بات نہیں، اس لیے کہ یہ دیکھو کہ تم روزہ کس کے لیے رکھ رہے ہو؟ اگر تم اپنی ذات کے لیے، اپنا جی خوش کرنے کے لیے اور اپنا شوق پورا کرنے کے لیے روزہ رکھ رہے ہو، پھر تو بے شک اس پر غم اور صدمہ کرو، کہ بیماری آ گئی اور روزہ چھوٹ گیا، لیکن اگر اللہ تعالیٰ کے لیے روزہ رکھ رہے ہو، تو پھر غم کرنے کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ

اللہ تعالیٰ نے خود فرمادیا ہے کہ بیماری میں روزہ چھوڑ دو۔

لہٰذا اگر شرعی عذر کی وجہ سے روزے قضا ہو رہے ہیں یا معمولات چھوٹ رہے ہیں، مثلاً بیماری ہے، سفر ہے، یا خواتین کی طبعی مجبوری ہے، یا کسی زیادہ اہم مصروفیات کی وجہ سے جو دین ہی کا تقاضہ تھی، معمول چھوٹ گیا، مثلاً ماں باپ بیمار ہیں، ان کی خدمت میں لگا ہوا ہے اور اس خدمت کی وجہ سے معمول چھوٹ گیا، تو اس سے بالکل رنجیدہ اور غمگین نہ ہونا چاہیے، لیکن سستی کی وجہ سے معمول کو چھوڑنا نہیں چاہیے، عذر کی وجہ سے چھوٹ جائے، تو اس پر رنجیدہ نہ ہونا چاہیے۔

## سستی کا علاج:

اور سستی کا واحد علاج یہ ہے کہ اس کا مقابلہ کرو اور اسکے آگے ڈٹ جاؤ اور ہمت سے مقابلہ کرو، اس کا علاج سوائے استعمالِ ہمت کے اور کچھ نہیں ہے، اگر ہماری زندگیوں میں صرف یہ بات بھی آجائے، یعنی سستی کا مقابلہ کرنا تو سمجھ لو، کہ آدھا کام ہو گیا اور اس کے بعد بقیہ آدھے کام کے حصول کی کوشش کرے، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے سستی کا مقابلہ کرنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین.

(اصلاحی خطبات: جلد پنجم)

الله أكبر

روح کی بیماریاں اوران کا علاج

# باب...... (۱۲)



## گناہ گار کی تحقیر نہ کریں

# گناہ گار کی ہرگز تحقیر نہ کیجئے

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ . وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ. اَمَّا بَعْدُ

## برا کام کرنے والے کو درجہ میں کم مت سمجھو:

(حضرت تھانویؒ نے) فرمایا کہ

> یہ جائز ہے کہ برا کام کرنے والے پر غصہ کرو، اس سے بغض کرو، مگر اپنے سے کم نہ سمجھو اور کبھی تم کو کسی کی سزا و تادیب کے واسطے مقرر کیا جائے، تو خبردار اس سے اچھا ہرگز نہ سمجھنا کہ وہ خطاوار شہزادے کے مثل ہو اور تم نوکر جلاد کے درجہ میں ہو، ظاہر ہے کہ خطاوار شہزادے کو بادشاہ جلاد کے ہاتھوں سزا دلوائے، تو جلاد اس سے افضل نہیں ہوسکتا۔ (نفاس عیسیٰ ص ۱۵۵)

یعنی ایک آدمی برا کام کر رہا ہے اور وہ کسی ناجائز گناہ کے کام میں مبتلا ہے، تو اس پر غصہ کرسکتے ہو اور اس سے بغض رکھ سکتے ہو، یعنی اس کے اس عمل سے نفرت کرسکتے ہو، کیونکہ اس کا یہ عمل قابل نفرت ہے، لیکن اس کو اپنے سے کم نہ سمجھو، یعنی ایک طرف اس کی برائی کو برائی سمجھو اور دوسری طرف اس کو اپنے سے کمتر بھی نہ سمجھو، یہ دونوں باتیں کیسے جمع ہوں؟

## نفرت گناہ سے، نہ کہ گناہ گار سے:

اس بات کو دو لفظوں میں یوں سمجھو کہ "فسق" سے نفرت کرو، فاسق سے نفرت نہ کرو یعنی فاسق کی ذات سے نفرت نہ کرو، بلکہ اس کے فعل سے نفرت کرو، کفر سے نفرت کرو، کافر کی ذات سے نفرت نہ کرو اور فاسق اور فاجر کو یہ سمجھو کہ یہ بیمار ہے، جب کوئی بیمار ہوتا ہے، تو کیا اس بیمار سے نفرت کی جاتی ہے؟ نہیں، بلکہ بیماری سے نفرت کی جاتی ہے، کہ اس کو بڑی خراب بیماری لگ گئی ہے، لیکن بیمار پر انسان ترس کھاتا ہے کہ یہ بے چارہ اس بیماری کے

اندر مبتلا ہو گیا، اسی طرح اگر کوئی شخص کسی گناہ کے اندر مبتلا ہے، یا کسی برے کام کے اندر مبتلا ہو گیا ہے، تو اس کے برے کام سے نفرت کرو، لیکن اس کی ذات پر ترس کھاؤ۔

## گناہ گار ترس کھانے کے لائق ہے:

میرے خسر صاحب (جناب بھائی شرافت صاحب) اللہ تعالیٰ ان کو عافیت اور سلامی کے ساتھ رکھے۔ (آمین) جب وہ کسی ایسے آدمی کا ذکر کرتے ہیں، جو کسی گناہ یا برے کام میں مبتلا ہوتا ہے، تو یوں کہتے ہیں فلاں بیچارے بدعات میں مبتلا ہو گئے ہیں، اس کے لیے ''بیچارے'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں، مطلب یہ ہے وہ شخص ترس کھانے کے لائق ہے، کیونکہ وہ بیماری کے اندر مبتلا ہے، لہٰذا اس کا عمل قابل نفرت ہے، لیکن اس کی ذات ترس کھانے کے لائق ہے اور جب اس کی ذات ترس کھانے کے لائق ہے، تو پھر اس کو اپنے سے کم تر سمجھنے کا کوئی جواز نہیں اور بالخصوص اس نقطہ نظر سے کہ شاید اللہ تعالیٰ اس کو اس گناہ سے بچنے کی توفیق عطا فرما دے اور توبہ کی توفیق عطا فرما دے اور اس کے نتیجے میں یہ کہیں سے کہیں پہنچ جائے گا اور میں یہی پڑا رہ جاؤں، اس لیے کسی کو اپنے سے کم تر نہ سمجھو۔

## شیطان کس طرح راہ مارتا ہے؟

جن کو اللہ تعالیٰ دین سے وابستگی عطا فرما دیتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ ہمیں ہماری طلب اور استحقاق کے بغیر الحمد للہ ایسے حلقے سے وابستہ کر دیا، جو دین سے تعلق رکھتا ہے، لیکن دین سے وابستگی رکھنے والے حضرات جب ان لوگوں کو دیکھتے ہیں، جو دین سے وابستہ نہیں، بلکہ گناہوں کے اندر مبتلا ہیں، تو بسا اوقات ان کو دیکھ کر ان کی ذات سے نفرت پیدا ہونے لگتی ہے اور اپنی برتری کا احساس پیدا ہونے لگتا ہے کہ ہم ان سے برتر ہیں، بس یہیں سے شیطان راہ مارتا ہے، اس لیے اس بات کو یاد رکھیں کہ کسی کی ذات سے نفرت نہ ہو، اگر نفرت ہو، تو اس کے عمل سے ہو اور اس عمل کی وجہ سے اس پر ترس کھاؤ اور ترس کھانے کے باوجود یہ سوچو، کہ پتہ نہیں کب اللہ تعالیٰ اس کو توبہ کی توفیق دے دیں اور یہ ہم سے آگے نکل جائے؟

## حضرت تھانوی کا انداز تربیت:

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ایسی پیری نہیں تھی کہ اصلاح کے لیے آنے

والوں کو بس وظیفے بتا دیئے اور اب وہ خانقاہ میں بیٹھے ہوئے وظیفے گھونٹ رہے ہیں اور وظیفے پڑھنے کے نتیجے میں نفس اندر سے پھول رہا ہے، بلکہ جب کوئی شخص ان کے یہاں تربیت کرانے کے لیے آتا، تو اس کی واقعی تربیت کی جاتی تھی اور تربیت ہی کے لیے کبھی ڈانٹنے کی اور کبھی غصہ کرنے کی اور کبھی سزا دینے کی ضرورت بھی پیش آتی تھی، اسی وجہ سے حضرت والا سخت مشہور تھے اور حضرت والا کے پاس جہاں اہل علم وفہم اپنی اصلاح کے لیے آتے تھے، وہیں ایک سے ایک اکھڑ اور غیر تہذیب یافتہ آدمی بھی آتا تھا اور حضرت ہر ایک کی اخلاقی تربیت کرتے تھے اور معاشرت و معاملات میں کسی قاعدے یا اصول کی خلاف ورزی پر روک ٹوک بھی فرماتے تھے، اس میں بھی ہر ایک کے ساتھ اسی کے انداز سے پیش آتے تھے۔

## تم بیل ہو تو میں قصائی ہوں:

چنانچہ ایک مرتبہ ایک دیہاتی آیا، اس نے کوئی خلاف اصول بات کی، تو اس کو سمجھایا اور ڈانٹا، تو وہ دیہاتی کہنے لگا اجی حضرت ہم تو بیل ہیں، جواب میں حضرت نے فرمایا کہ میں بھی تو قصائی ہوں، اس طرح ہر ایک کے ساتھ علیحدہ معاملہ ہوتا تھا۔

## ایک دیہاتی کے تربوزے والا لطیفہ:

ایک مرتبہ آپ حوض پر وضو فرما رہے تھے، اتنے میں ایک دیہاتی ایک بڑا سا تربوز لے کر آ گیا اور کہا لے مولوی تیرے واسطے لایا ہوں، اس کو کہاں دھروں؟ حضرت والا نے وضو کرتے ہوئے فرمایا کہ میرے سر پر دھر دے، اس دیہاتی نے وہ تربوز اٹھا کر آپ کے سر پر رکھ دیا، لوگ جلدی سے دوڑے کہ یہ کیا حرکت کر رہا ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ غلطی میری ہے، میں نے ہی اس سے کہا تھا کہ سر پر دھر دے، ایسے ایسے لوگ آیا کرتے تھے، اس لیے ان کی تربیت کے لیے کبھی آپ غصہ بھی فرمایا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ میرا فرض ہے کہ میں غصہ کروں، اس لیے کہ دیانت کا تقاضہ یہی ہے، اگر یہ نہ کروں، تو بد دیانتی ہوگی اور امانت میں خیانت ہوگی۔

## یہ شہزادہ اور میں جلاد ہوں:

لیکن فرمایا کہ جب بھی کسی پر غصہ کررہا ہوتا ہوں، تو الحمدللہ ذہن سے کبھی یہ بات غائب نہیں ہوتی، کہ میری مثال ایسی ہے جیسے کوئی بادشاہ جلاد کو حکم دے کہ شہزادے کو کوڑے مارو، اب وہ جلاد اس حکم پر شہزادے کو کوڑے لگائے گا، لیکن عین اس وقت بھی جس وقت وہ جلاد کوڑے لگا رہا ہوگا، اپنے آپ کو شہزادے سے افضل نہیں سمجھ سکتا، وہ جانتا ہے کہ یہ شہزادہ ہے اور میں جلاد ہوں، لیکن مارے گا، اس لیے کہ بادشاہ کے حکم کی تعمیل کرنی ہے، الحمدللہ میں جس وقت کسی کو ڈانٹ رہا ہوں اور کسی کام پر کسی کا مواخذہ کررہا ہوتا ہوں، تو الحمدللہ اس بات کا استحضار رہتا ہے کہ یہ شہزادہ ہے اور میں جلاد ہوں، میں اس سے افضل نہیں ہوں۔



## عین ڈانٹ ڈپٹ کے وقت دعا کرنا:

دوسرے یہ کہ جس وقت ڈانٹ رہا ہوں، یا مواخذہ کررہا ہوتا ہوں، اسی وقت دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کررہا ہوتا ہوں کہ یا اللہ مجھ سے ایسا مواخذہ نہ فرمایئے گا، آخرت میں میری اسی طرح پکڑ نہ فرمایئے گا۔

اب دیکھئے! جو آدمی اس نیت سے ڈانٹ رہا ہو کہ منکر سے روکنا اور اس کی اصلاح کرنا ضروری ہے، اس کا ہمیں حکم ہے اور ہر ڈانٹ پر اور ہر غصے پر ان دو باتوں کا استحضار رکھتا ہو، اس کا غصہ بھی عبادت نہیں تو اور کیا ہے؟ بہرحال اس طرح یہ دونوں چیزیں جمع ہوجاتی ہیں کہ غصہ بھی ہورہا ہے، برے عمل سے نفرت اور بغض بھی ہے، لیکن اپنے سے اس کو کمتر بھی نہیں سمجھ رہا ہے، اپنے کو اس سے افضل بھی نہیں سمجھ رہا ہے، لیکن یہ چیز مشق سے اور کسی کے آگے پامال ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل سے حاصل ہوتی ہے۔

## سالکین کے کبر اور تواضع مفرط کا علاج:

فرمایا کہ کام کرنے والوں کو دین کا کام کرنے سے دو مرض پیدا ہوتے ہیں: (۱) ایک کبر (۲) اور دوسرا تواضع مفرط۔ کبر تو یہ ہے کہ وظیفہ پڑھ کر اپنے اوپر نگاہ کرنے

لگے، نماز پڑھ کر بے نمازیوں کو حقیر سمجھنے لگے، اس کا علاج یہ سمجھنا ہے کہ تکبر کی وجہ سے بڑے بڑے عابدوں کے قدم توڑ دیئے گئے ہیں، کہ منزل مقصود تک نہ پہنچ سکے، شیطان اور بلعم باعور کی حکایت اس کی نظیر ہے۔ ''تواضع مفرط'' یہ ہے کہ اس حد تک تواضع کرے کہ اپنے اعمال صالحہ کی بے قدری کرنے لگے مثلاً اس طرح کہ اگرچہ ہم نماز پڑھتے ہیں، مگر اس میں خشوع تو ہے نہیں، ذکر کرتے ہیں مگر انوار بالکل نہیں، گویا کہ در پردہ اللہ کی شکایت کر رہے ہیں، اس کا علاج یہ کہنا ہے کہ اے اللہ آپ کا شکر ہے کہ آپ نے ہم کو ذکر و نماز کی توفیق دی، ورنہ ہماری کیا مجال تھی جو آپ کی بندگی کر لیتے؟

## شیطان دین کے راستے سے کیسے بہکاتا ہے؟

اس ملفوظ میں حضرت والا نے دو متضاد قسم کی بیماریوں کا ذکر فرمایا ہے، جو لوگ دین کے کام میں لگتے ہیں، شیطان ان کو دین کے ذریعہ بہکاتا ہے، شیطان کی اول کوشش تو یہ ہوتی ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ دین کے کام میں لگے ہی نہیں، بلکہ اس بندے کو نفسانی لذتوں اور معصیتوں میں اس طرح پھنسایا جائے کہ دین کے کسی کام کی طرف اس کی توجہ ہی نہ ہو، نہ نماز کی طرف اس کی توجہ ہو، نہ روزے کی طرف، نہ زکوۃ اور حج کی طرف اس کی توجہ ہو، بلکہ نفسانیت کے اندر پھنسا رہے اور اگر کوئی شخص دین کے کام میں لگ ہی گیا ہے، تو اب اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ وہ دین کا کام کر رہا ہے، اس کو برباد کر دوں، چنانچہ شیطان اس کو برباد کرنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کرتا ہے، ان طریقوں میں سے دو طریقوں کا حضرت والا نے اس ملفوظ میں ذکر فرما دیا ہے۔

## شیطان کبھی تو کبر کے ذریعہ بہکاتا ہے:

پہلا طریقہ یہ ہے کہ شیطان دین کا کام کرنے والے کے دل میں کبر، عجب اور خود پسندی کے خیالات ڈالتا ہے، مثلاً اس سے کہتا ہے کہ دیکھ تو بہت پہنچا ہوا آدمی بن گیا ہے، تو بڑے خشوع و خضوع والی نماز پڑھنے لگا ہے، تو نماز اور جماعت کا پابند ہو گیا ہے، بہت سے لوگ نماز نہیں پڑھتے اور فسق و فجور میں مبتلا ہیں، اس کے نتیجے میں اپنی بڑائی اور بے نمازیوں کی حقارت دل میں آ جاتی ہے، جو انسان بے ظرف ہوتا ہے، جب وہ ذرا نماز کی

پابندی کرنے لگتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف ذرا رجوع کرتا ہے، تو پھر اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھنے لگتا ہے۔

## جولاہے کی مثال اور تکبر کا علاج:

عربی کی ایک مثل ہے :"صَلّٰی الْحَائِکُ رَکْعَتَیْنِ وَانْتَظَرَ الْوَحْیُ"

ایک مرتبہ ایک جولاہے نے دو رکعت نماز پڑھیں اور نماز کے بعد وحی کا انتظار شروع کر دیا کہ اب میرے اوپر وحی آئے گی، یہ ہم لوگوں کا حال ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ذرا سی عبادت کی توفیق ہو گئی، تو بس دماغ عرش معلیٰ پر پہنچ گیا، کہ ہم بڑے عابد، زاہد و متقی اور پارسا ہو گئے ہیں، یہ کبر ہے، اس کے علاج کے لیے حضرت والا فرماتے ہیں کہ:

"اس کا علاج یہ سوچنا ہے کہ "تکبر" کی وجہ سے بڑے بڑے عابدوں کے قدم توڑ دیئے گئے ہیں کہ منزل مقصود تک نہ پہنچ سکے، شیطان اور "بلعم باعور" کی حکایت اس کی نظیر ہے۔ یعنی آدمی یہ سوچے کہ اگر میں نے تکبر کیا، تو اس کے نتیجے میں یہ سب عمل جو میں کر رہا ہوں، یہ سب اکارت ہو جائے گا، اس کی نظیر شیطان ہے، اس لیے کہ شیطان پہلے بڑی عبادت کرتا تھا، یہاں تک کہ اس کا لقب طاؤس الملائکہ (فرشتوں کا مور) پڑ گیا تھا، لیکن اس عبادت کے نتیجے میں دماغ میں خلل اور تکبر آ گیا، چنانچہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا، تو اس نے انکار کر دیا اور یہ عقلی دلیل پیش کی کہ اس کو آپ نے مٹی سے پیدا کیا اور مجھے آگ سے پیدا کیا، لہٰذا میں اس سے افضل ہوں، تو میں اس کو سجدہ کیوں کروں؟ بہر حال اس تکبر کے نتیجے میں وہ راندۂ درگاہ ہو گیا۔ العیاذ باللہ



## بلعم باعور کا قصہ:

دوسری نظیر "بلعم باعور" کی بیان فرمائی، "بلعم باعور" حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ایک شخص گزرا ہے، یہ بڑا عابد و زاہد شخص تھا، بلکہ مستجاب الدعوۃ تھا، یعنی جو دعا کرتا وہ فوراً قبول ہو جاتی تھی، چنانچہ لوگ اس کے پاس آ کر اس سے دعائیں کرایا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ مقام عطا فرمایا تھا، یہ عمالقہ کے علاقے میں رہتا تھا، چونکہ اس علاقے کے لوگ کافر تھے، اسلئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان پر حملہ کرنے کا

ارادہ کیا، جب علاقے کے کافروں کو پتہ چلا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حملہ کرنے والے ہیں، تو وہ لوگ بلعم باعور کے پاس گئے اور جا کر اس سے کہا کہ تم بڑے عابد و زاہد ہو، اللہ تعالیٰ تمہاری دعائیں قبول فرماتے ہیں، آپ یہ دعا کریں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لشکر کو شکست ہو جائے اور ہم پر فتح نہ پا سکے۔

بلعم باعور نے کہا کہ میں یہ دعا تو نہیں کر سکتا، اس لیے یہ تو اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبر ہیں اور جو لوگ لشکر میں ان کے ساتھ ہیں، وہ سب صاحب ایمان ہیں، میں ان کے حق میں شکست کی دعا نہیں کر سکتا، انہوں نے اصرار کیا کہ آپ ضرور دعا کریں، تو اس نے کہا کہ اچھا میں اللہ تعالیٰ سے استخارہ کرتا ہوں چنانچہ استخارہ کیا اور استخارہ میں یہی جواب آیا کہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں تم ان کے حق میں کیسے بددعا کرو گے؟ چنانچہ اس نے لوگوں کو جواب دے دیا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے استخارہ کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے بددعا کرنے سے منع فرما دیا۔

وہ لوگ دوسرے دن پھر اس کے پاس پہنچے اور اس کے لیے رشوت کے طور پر کچھ ہدیے تحفے بھی لے گئے اور اس سے کہا کہ یہ ہدیہ تحفہ لے لو اور دعا کر دو، اب اس عابد کو چاہیے تو یہ تھا کہ جب استخارہ کے ذریعہ یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہیں ہے، تو بس ان سے انکار کر دیتا اور قصہ ختم ہو جاتا، لیکن جب ہدیہ تحفہ پہنچا، تو ایک مرتبہ پھر استخارہ کرنے کی بات دماغ میں آ گئی، چنانچہ ان سے کہا کہ اچھا میں ایک مرتبہ اور استخارہ کر لوں، جب دوبارہ استخارہ کیا، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا، تو اس نے لوگوں کو منع کر دیا کہ میں دعا نہیں کرتا، ان لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے جو استخارہ کیا تھا، اس کا کیا جواب آیا؟ اس نے کہا کہ جواب میں کچھ نہیں آیا، ان لوگوں نے کہا کہ بس پھر تو کام ہو گیا، اگر اللہ تعالیٰ کی آپ کو روکنے کی مرضی ہوتی، تو اللہ تعالیٰ آپ کو منع کر دیتے، جب منع نہیں کیا اور جواب نہیں آیا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو اجازت مل گئی، یہ تاویل قوم نے بھی کر لی اور اس کے ساتھ اس عابد نے بھی کر لی اور بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کی ہلاکت کی بددعا کر دی۔ العیاذ باللہ

چونکہ یہ بددعا ایک نبی کے بارے میں تھی، اس لیے قبول نہیں ہوئی، البتہ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بعد میں کئی سال تک میدان تیہ میں پھرتے

رہے، یہ بلعم باعور کی دعا کا نتیجہ تھا، پھر اس عابد نے قوم سے کہا کہ میں نے تمہارے کہنے سے دعا تو کردی تھی، مگر اللہ تعالی قبول نہیں کریں گے، کیونکہ میں نے پہلے ہی استخارہ کرلیا تھا، لوگوں نے اس سے کہا کہ آپ نے جو گناہ کرنا تھا، وہ تو کرلیا اور اب دعا بھی قبول نہیں ہورہی ہے، اب کوئی ایسی تدبیر بتاؤ کہ موسی علیہ السلام اور ان کے لشکر کو بربادی کا سامنا کرنا پڑے۔

اب اس عابد نے غور کرنے کے بعد کہا، اب تو ایسی تدبیر بتاتا ہوں، جس کے نتیجے میں یہ لوگ خود ہی اپنے آپ ہلاک ہوجائیں گے، وہ یہ کہ تم اپنی قوم کی نوجوان لڑکیوں کو تیار کرواوران کو بناسنوار کران کے لشکر کے اندر داخل کردو، اس لیے کہ یہ لوگ کافی عرصے سے اپنے گھروں سے نکلے ہوئے ہیں، جب لڑکیاں ان کے پاس پہنچیں گی، تو ان میں سے کوئی نہ کوئی گناہ میں مبتلا ہوجائے گا، جب یہ گناہ میں مبتلا ہوں گے، تو اللہ تعالی کی طرف سے ان پر عذاب آجائے گا، اس طرح تم ان کو ہلاک کرسکتے ہو، چنانچہ ان لوگوں نے ایسا ہی کیا اور نوجوان لڑکیاں حضرت موسی علیہ السلام کے لشکر میں داخل کردیں، جس کے نتیجے میں بعض لوگ گناہ میں مبتلا ہوگئے، بلکہ واقعات میں لکھا ہے کہ عمالقہ کی شہزادی بنی اسرائیل کے ایک بڑے سردار کے پاس پہنچ گئی، وہ سردار اس شہزادی کو لے کر حضرت موسی علیہ السلام کے پاس آیا اور ان سے پوچھا کہ کیا یہ شہزادی میرے اوپر حرام ہے؟ حضرت موسی علیہ السلام نے فرمایا ہاں، یہ تم پر حرام ہے، اس نے کہا کہ حرام ہونے کے باوجود میں اس کو آج اپنے ساتھ لے جاؤں گا، چنانچہ وہ اس کو لے گیا اور پھر اس کے ساتھ بدعملی میں مبتلا ہوا، اس کے بعد حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد میں سے کسی نے جاکران دونوں کو نیزے سے قتل کردیا، اس واقعے کے بعد اس بدعملی کے عذاب کے طور پر بنی اسرائیل کے اندر طاعون کی بیماری پھوٹی، چنانچہ حدیث شریف میں بھی آیا ہے کہ

اِنَّهٗ بَقِيَّةُ رِجْزٍ اُرْسِلَ اِلٰى بَنِىْٓ اِسْرَائِيْلَ

یعنی یہ طاعون اس عذاب کا بقیہ حصہ ہے جو بنی اسرائیل کی طرف بھیجا گیا تھا۔

یہ سب کچھ بلعم باعور کی تجویز کی بناء پر ہوا، اس نے عمالقہ کو یہ حیلہ سکھایا تھا، اب دیکھئے کہ وہ بلعم باعور جو اتنا بڑا عابد عالم اور مستجاب الدعوۃ تھا، لیکن جب اس کا دل پھرا، تو اس انجام کو پہنچا، جس کا ذکر ان آیات قرآنی میں ہے:

﴿ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنٰهُ آيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰهُ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ﴾ (الاعراف ۱۷۵)

ترجمہ: ان لوگوں کو اس شخص کا حال پڑھ کر سنایئے جس کو ہم نے اپنی آیتیں دیں پھر وہ ان سے بالکل نکل گیا پھر شیطان اس کے پیچھے لگ گیا سو وہ گمراہ لوگوں میں داخل ہوگیا اور اگر تم یہ چاہتے تو اس کو ان آیتوں کی بدولت بلند مرتبہ کر دیتے لیکن وہ تو دنیا کی طرف مائل ہوگیا اور اپنی نفسانی خواہش کی پیروی کرنے لگا سو اس کی حالت کتے جیسی ہوگئی کہ اگر تو اس پر حملہ کرے تب بھی ہانپے یا اس کو چھوڑے تب بھی ہانپے۔

## تکبر کے نتیجے میں بڑوں بڑوں کے قدم توڑ دیئے گئے:

حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمارہے ہیں کہ بلعم باعور کی حکایت اس کی نظیر ہے، حالانکہ وہ اتنا بڑا عالم اور عابد اور مستجاب الدعوۃ تھا اور لوگ اس کے پاس جا کر اپنے لیے دعائیں کراتے تھے، لیکن اس کا یہ انجام ہوا، دل پلٹتے دیر نہیں لگتی، لیکن اللہ تعالیٰ ظلمت کی طرف کسی کا دل ویسے ہی نہیں پلٹ دیتے کہ اچانک بیٹھے بیٹھے ایک مسلمان کافر بن جائے، بلکہ اس شخص کی حرکتیں ایسی ہوتی ہیں، جس کی بنیاد پر دل پلٹے جاتے ہیں، وہ حرکت یہ ہوتی ہے کہ اپنی عبادت پر گھمنڈ ہوگیا، اور تکبر ہوگیا اور تکبر کے نتیجے میں بڑوں بڑوں کے قدم توڑ دیئے گئے۔

## شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی ایک حکایت:

حضرت شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں ایک حکایت لکھی ہے، یہ بڑے درجہ کے اولیاء اللہ میں سے ہیں، ایک مرتبہ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ تہجد پڑھ رہے تھے، اس دوران انہوں نے دیکھا کہ ایک نور چمکا اور پوری فضا منور ہوگئی اور اس نور میں سے آواز آئی:

''اے عبدالقادر! تو نے ہماری عبادت کا حق ادا کر دیا، جو عبادت اب تک تم نے ادا کرلی، وہ کافی ہے، آج کے بعد تم پر نماز فرض نہیں، روزہ فرض نہیں، تمام

عبادات کی تکلیف تم سے اٹھالی گئی۔''

یہ آواز نور میں سے آئی گویا کہ اللہ تعالیٰ فرمار ہے ہیں کہ تیری عبادتیں اس درجہ میں قبول ہوگئیں کہ آئندہ کے لیے تجھے عبادتوں سے فارغ کردیا گیا، حضرت عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ نے جب یہ نور دیکھا اور یہ آواز سنی، تو فوراً جواب میں فرمایا:

کمبخت دور ہو، مجھے دھوکہ دیتا ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تو عبادتیں معاف نہیں ہوئیں اور ان پر سے عبادتوں کی تکلیف ختم نہیں ہوئی، مجھ سے ختم ہوجائے گی، تو مجھے دھوکہ دینا چاہتا ہے؟

دیکھئے! شیطان نے کتنا بڑا وار کیا، اگران کے دل میں عبادت کا ناز آجاتا، تو وہیں پھسل جاتے، جولوگ کشف وکرامات کے پیچھے بہت پڑے رہتے ہیں، ان کو ختم کرنے کے لیے تو شیطان کا یہ بہترین وار تھا، لیکن شیخ تو شیخ تھے، فوراً سمجھ گئے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوسکتی، اس لیے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سے عبادت کی تکلیف ختم نہیں ہوئی، میرے اوپر سے کیسے ختم ہوجائے گی؟

## شیطان کا دوسرا حملہ:

تھوڑی دیر کے بعد پھر ایک اور نور چمکا اور فضا منور ہوئی اور اس نور میں سے آواز آئی۔''اے عبدالقادر آج تیرے علم نے تجھے بچالیا، ورنہ میں نے نہ جانے کتنے عابدوں کو اس وار کے ذریعہ تباہ کردیا۔'' حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ نے دوبار فرمایا: کم بخت دوبارہ مجھے دھوکہ دیتا ہے، میرے علم نے مجھے نہیں بچایا، مجھے اللہ کے فضل نے بچایا ہے۔ یہ دوسرا حملہ پہلے حملے سے زیادہ خطرناک اور اس سے زیادہ سنگین تھا، کیونکہ اس کے ذریعہ ان کے اندر علم کی بڑائی اور اس کا ناز پیدا کرنا چاہتا تھا۔

## دوسرے حملے کی سنگینی:

حضرت شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمتہ اللہ علیہ اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ پہلا حملہ اتنا سنگین نہیں تھا، کیونکہ جس شخص کے پاس ذرا سا بھی شریعت کا علم ہو، وہ اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ زندگی میں ہوش وحواس کی حالت میں کسی انسان سے عبادات معاف

نہیں ہو سکتیں، لیکن یہ دوسرا حملہ بڑا سنگین تھا، نہ جانے کتنے لوگ اس حملے میں بہک گئے، اس لیے کہ اس میں اپنے علم پر ناز پیدا کرنا مقصود تھا اور یہ باریک بات ہے۔

## دل سے گھمنڈ نکال دو:

اس لیے حضرت تھانوی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس تکبر کا علاج یہ ہے کہ آدمی یہ سوچتا رہے کہ کیسے کیسے بڑے صاحبان علم، صاحبان معرفت، عبادت گزار، متقی اور پارسا بھی جب گھمنڈ میں مبتلا ہوئے، تو ان کا انجام کیا ہوا؟ العیاذ باللہ، لہذا دل سے گھمنڈ کو نکالو، اگر تم دین کے راستے میں لگے ہوئے ہو، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ خلق خدا کی تحقیر میں لگ جاؤ اور ساری دنیا کی مخلوق کو جہنمی سمجھنے لگو، ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مَنْ قَالَ هَلَكَ النَّاسُ فَهُوَ اَهْلَكُهُمْ جو شخص یہ کہے کہ ساری دنیا تباہ ہوگئی، تو سب سے زیادہ تباہ وہ کہنے والا شخص ہے، جس شخص کو اپنے عیوب نہیں نظر آ رہے ہیں اور ساری دنیا کے عیوب تلاش کرتا پھر رہا ہے، ان کی تحقیر کر رہا ہے، تو وہ شخص سب سے زیادہ تباہ اور سب سے زیادہ برباد ہے۔

## تکبر کا علاج:

لہذا جب کبھی دل میں اپنی عبادت کا، اپنے علم کا، اپنے زہد کا، اپنے صدقہ خیرات کا خیال آنے لگے، تو فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو اور کہو کہ یا اللہ آپ کی دی ہوئی توفیق کے نتیجے میں میں نے یہ کام انجام دیا، میں اس پر آپ کا شکر ادا کرتا ہوں، یہ کام کرنا میرے بس میں نہیں تھا اور شیطان کے شر سے پناہ صرف رجوع الی اللہ میں ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے عیوب کا استحضار کرو، جب دونوں چیزیں یعنی رجوع الی اللہ اور اپنے عیوب کا استحضار جمع ہو جائیں گی، تو پھر تکبر پیدا نہیں ہونے دیں گی۔

## ''تواضع مفرط'' مضر چیز ہے:

بہر حال اس ملفوظ میں حضرت والا نے فرمایا کہ دین کا کام کرنے والوں میں ایک تکبر پیدا ہو جاتا ہے اور بعض اوقات اس کے بالکل الٹ چیز یعنی ''تواضع مفرط'' (حد سے

بڑھی ہوئی تواضع) پیدا ہو جاتی ہے، تواضع اچھی چیز ہے، لیکن یہ بھی اپنی حد کے اندر ہونی چاہیے، اگر حد سے آگے بڑھ جائے، تو یہ مضر ہے۔

## ''تواضع مفرط'' کا ایک قصہ:

اس بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے وعظ میں اپنے سامنے کا ایک قصہ بیان فرمایا ہے کہ ایک مرتبہ میں ریل میں سفر کر رہا تھا، کچھ اور لوگ بھی میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے، جب کھانے کا وقت آیا تو انہوں نے اپنا کھانا نکالا اور دستر خوان بچھایا اور ساتھیوں کو جمع کر کے کھانا شروع کیا، تو جس طرح تواضعاً ہم کہتے ہیں کہ آیئے دال روٹی آپ بھی کھا لیجئے، اسی طرح انہوں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے شخص سے تواضعاً کہا کہ کچھ گوہ موت آپ بھی کھا لیجئے، انہوں نے تواضعاً اپنے کھانے کو گوہ موت کہہ دیا، العیاذ باللہ۔ تو اللہ تعالیٰ کے رزق کو گوہ موت کہنا یہ تواضع مفرط ہے، اس لیے کہ تواضع کے نتیجے میں ایسا عمل کرنا، جس سے اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری ہے، کیونکہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر اعتراض ہے، اس لیے یہ بڑی خطرناک بات ہے۔

## اپنی نماز کو ''ٹکریں مارنا'' مت کہو:

یہی تواضع مفرط انسان کو یاس (ناامیدی) تک پہنچا دیتی ہے اور انسان کے اندر مایوسی پیدا کر دیتی ہے، جیسے آپ نے لوگوں سے یہ جملہ سنا ہوگا کہ ارے ہماری نماز کیا ہے؟ ہم تو ٹکریں مارتے ہیں، اب نماز کو ٹکریں مارنے سے تعبیر کرنا تواضع مفرط ہے، ایسا نہیں کرنا چاہیے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی توفیق پر شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے بارگاہ میں حاضری کی توفیق دی، نہ جانے کتنے لوگ ایسے ہیں، جن کو بارگاہ میں حاضری کی بھی توفیق نہیں ملی، اس لیے کیوں اس نماز کی ناقدری کرتے ہو؟ یہ ٹھیک ہے کہ تمہاری نماز میں بہت ساری کوتاہیاں بھی ہیں، لیکن وہ کوتاہیاں تمہاری ہیں اور توفیق ان کی ہے، لہٰذا پہلے توفیق پر شکر ادا کرو اور پھر کوتاہیوں پر استغفار کر لو، اللہ تعالیٰ سے کہو کہ یا اللہ آپ نے مجھے نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمائی تھی، لیکن میں نے اس نماز کا حق ادا نہیں کیا۔ استغفر اللہ۔ پہلے اس عبادت کی توفیق پر شکر ادا کرو اور پھر اپنی کوتاہی پر استغفار کرو، یہ نہ کہو کہ ہماری نماز تو

ٹکریں مارنا ہے، یہ بات کہنا کسی طرح بھی درست نہیں۔

## کوتاہیوں پر استغفار کرو:

اور جب تم اپنی کوتاہی پر استغفار کرو گے، تو جس نے اس عبادت کے کرنے کی توفیق دی ہے، وہ تمہارے استغفار کو قبول کر کے اس عبادت میں کمال بھی عطا فرمادے گا انشاء اللہ۔ ارے کوئی آدمی بھی ایسا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حق ادا کر سکے؟ ہم اور تم تو کس شمار میں ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن کے پاؤں رات کو تہجد کی نماز میں کھڑے کھڑے سوج رہے ہیں، وہ یہ فرمار ہے ہیں:

مَا عَبَدْنَاکَ حَقَّ عِبَادَتِکَ. مَا عَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ

ہم آپ کی عبادت کا حق ادا نہیں کر سکے، جب وہ یہ فرمار ہے ہیں، تو ہم کیسے اس کی عبادت کا حق ادا کر سکتے ہیں؟ ارے ہماری تو ہر عبادت ان کی نسبت بہت ہی ناقص رہے گی، لیکن جب انہوں نے اپنے در پر آنے کی توفیق دی، اپنے آستانے پر سجدہ کرنے کی توفیق دی، تو پھر اس سے یہ کیسی بدگمانی کرتے ہو کہ وہ یہ سجدہ قبول نہیں فرمائیں گے اور کیسے تم اس سجدہ کی ناقدری کرتے ہوئے کہتے ہو کہ یہ گندہ سجدہ ہے، جب تم اس کی دی ہوئی توفیق پر شکرادا کرنے کے بعد استغفار کرو گے اور یہ کہو گے کہ یا اللہ اس عبادت میں جو کوتاہی ہوئی، اپنی رحمت سے اس کو معاف فرمادیجئے، تو یقیناً اللہ تعالیٰ ان کوتاہیوں کو ضرور معاف فرمائیں گے۔

## حضرت ڈاکٹر صاحب کا واقعہ:

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے جب کوئی آکر یہ کہتا کہ میں کیا نماز پڑھتا ہوں؟ بس ٹکریں مارتا ہوں، تو آپ کو ان کی باتوں سے بہت توحش ہوتا تھا، چنانچہ ایک صاحب نے آکر حضرت والا سے عرض کیا کہ حضرت میری نماز کیا؟ میرا سجدہ کیا؟ جب میں سجدہ کرتا ہوں، تو اس میں گندے گندے شہوانی اور نفسانی خیالات آتے ہیں، میری یہ نماز تو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرنے کے لائق بھی نہیں ہے، حضرت والا نے جواب میں فرمایا کہ اچھا یہ تمہارا سجدہ جو نفسانی اور شہوانی خیالات والا ہے، یہ تو

بڑا گندہ سجدہ ہے، انہوں نے عرض کیا جی ہاں، بالکل گندہ سجدہ ہے، حضرت نے فرمایا کہ اچھا یہ گندہ سجدہ تم مجھے کرو، کیونکہ یہ شہوانی اور نفسانی خیالات والا سجدہ اللہ تعالی کے سامنے کرنے کے لائق تو نہیں ہے، لہذا یہ سجدہ اللہ میاں کے بجائے، تم مجھے کرو، انہوں نے کہا حضرت یہ آپ کیسی بات کررہے ہیں؟ میں آپ کو سجدہ کروں؟ حضرت نے فرمایا کہ جب یہ گندہ سجدہ ہے اور اللہ تعالی کو کرنے کے لائق نہیں، تو مجھے کرکے دیکھ لو، انہوں نے کہا کہ حضرت یہ نہیں ہوسکتا، میں یہ سجدہ کسی اور کو نہیں کرسکتا، حضرت نے فرمایا کہ جب یہ سجدہ کہیں اور ادا نہیں ہوسکتا، تو اس سے معلوم ہوا کہ یہ سجدہ انہی کے لیے ہے، یہ پیشانی کہیں اور ٹک نہیں سکتی، یہ سجدہ کہیں اور نہیں ہوسکتا، یہ سر کسی اور آستانے پر جھک نہیں سکتا، یہ سجدہ تو انہی کے لیے ہے اور ان کی توفیق سے ہے، البتہ ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے اس سجدہ میں خرابیاں داخل ہوگئی ہیں، اس کی طرف سے استغفار کرلو، لیکن یہ پیشانی وہیں لگے گی، کسی نے خوب کہا ہے کہ

قبول ہو کہ نہ ہو، پھر بھی ایک نعمت ہے ☆ وہ سجدہ جس کو تیرے آستاں سے نسبت ہے

یہ سجدہ معمولی چیز نہیں، لہذا اس سجدے کے بارے میں جو الٹی سیدھی باتیں کرتے ہو، ان کو چھوڑ دو اور اللہ جل شانہ کی توفیق پر شکرادا کرو۔

## عبادات چھڑانے کا طریقہ:

ہوتا یہ ہے کہ شیطان تواضع مفرط پیدا کرکے اس کی راہ مارتا ہے اور اس کے دل میں یہ خیال ڈالتا ہے کہ تکبر کی بیماری میں تو مبتلا نہیں ہوں، اس لئے کہ میں تو اپنی نماز کو کچھ سمجھتا ہی نہیں ہوں اور ساتھ میں تواضع بھی اختیار کررہا ہوں، لیکن یہ خیالات جب زیادہ ہوجاتے ہیں، تو رفتہ رفتہ اس کے دل میں مایوسی پیدا کرتا دیتا ہے کہ یہ عبادت کرنا تیرے بس کی بات نہیں، تیری نماز کبھی قبول نہیں ہوسکتی، جب قبول ہی نہیں ہوگی، تو پڑھنے سے کیا فائدہ؟ لہذا چلو، چھوڑ دو اور گھر بیٹھو، اس طرح یہ شیطان نماز چھڑا دیتا ہے۔

## عبادات پر شکرادا کرو:

خوب یاد رکھو کہ جب بھی اللہ تعالیٰ کسی عمل کو کرنے کی توفیق دیدے، اس پر شکرادا

کرواور شکرادا کرنے کے ساتھ ساتھ یہ کہو کہ یااللہ آپ کی توفیق سے میں نے یہ عبادت انجام دی، البتہ اس میں میری طرف سے جو کوتاہیاں شامل ہوگئی ہیں، اپنی رحمت سے ان کو معاف فرما دیجئے۔ صحابہ کرامؓ فرمایا کرتے تھے:

لَوْلَا اللّٰهُ مَا اهْتَدَيْنَا ☆ وَلَا تَصَدَّقْنَا وَلَا صَلَّيْنَا

اے اللہ اگر آپ کی توفیق نہ ہوتی، تو ہمیں ہدایت نہ ملتی اور اگر آپ کی توفیق نہ ہوتی تو ہم نہ صدقہ دے سکتے تھے اور نہ نماز پڑھ سکتے تھے اور جو کچھ ہے وہ آپ کی توفیق سے ہے، اس لیے ہم اس توفیق پر شکرادا کرتے ہیں اور اپنی کوتاہیوں سے استغفار کرتے ہیں، بس اگر یہ دو باتیں پلے باندھ لو گے، تو نہ کبر پیدا ہوگا اور نہ تواضع مفرط پیدا ہوگی جو شیطان کے دو ہتھیار ہیں۔

## شیطان کی کمر توڑنے والے الفاظ:

میں نے اپنے شیخ سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ مقولہ سنا کہ جو شخص کوئی بھی نیک عمل کرنے کے بعد یہ الفاظ کہہ دے: الحمدللہ استغفراللہ۔ تو شیطان یہ الفاظ سن کر کہتا ہے کہ اس نے تو میری کمر توڑ دی، کیونکہ الحمدللہ کہنے سے توفیق پر شکرادا ہوگیا، تو اس سے کبر کی جڑ کٹ گئی اور استغفراللہ کہنے سے یہ ہوا کہ تواضع مفرط کے نتیجے میں جن کوتاہیوں پر نظر ہو رہی تھی، ان کی جڑ کٹ گئی، دونوں کا علاج ہوگیا، اس لیے ہر نماز کے بعد اور ہر نیک عمل کے بعد الحمدللہ۔ استغفراللہ۔ اور یہ الفاظ کہتے وقت یہ کہو کہ یااللہ آپ نے مجھے نیک عمل کرنے کی توفیق دی، اس پر میں الحمدللہ کہہ رہا ہوں اور اس عمل میں میری طرف سے جو کوتاہیاں ہوئیں، اس پر میں استغفراللہ کہہ رہا ہوں کہ اے اللہ مجھے معاف فرما دیجئے، ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ ہائے ہائے کرنے کی ضرورت نہیں، بس جو بھی عبادت کرو، اس کے بعد یہ پڑھ لو انشاءاللہ شیطان کے عمل سے محفوظ رہو گے۔

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.